میں اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں ہو سکتا۔ بے شک اُنکا ایسا سمجھنا یوروپ کی شاعری کے لحاظ سے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ یوروپ کی شاعری درحقیقت نیچر کی ترجمانی ہے۔ اُسکا میدان اُسی قدر وسیع ہے جس قدر نیچر کی فضا۔ اُسکے فرائض مادری زبان کے سوا دوسری زبان میں جیسے کہ چاہئیں۔ ادا نہیں ہو سکتے؛ بلکہ ایشیائی شاعر جو اِس طریقہ شاعری سے نابلد ہیں وہ اپنی مادری زبان میں بھی اُسکی مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ بخلاف ایشیائی شاعری اور خاصکر متاخرین کی فارسی شاعری کے کہ یہاں اُنھیں معمولی خیالات کو جو قدما سیدھے سادے طور پر بیان کر گئے ہیں نئے نئے اسلوبوں اور نئی نئی نزاکتوں کے ساتھ باندھنا یہی کمالِ شاعری سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی فی نفسہ ایک بہت بڑا کمال ہے لیکن ایسی شاعری میں زبان کا صرف ایک محدود حصّہ مستعمل ہوتا ہے جسکو غیر زبان والا آسانی سے سیکھ سکتا ہے اور بشرطیکہ اُسمیں شاعری کی اعلیٰ قابلیت ہو اُسکو شعرائے اہلِ زبان کی طرح بلکہ بعض صورتوں میں اُن سے بہتر استعمال کر سکتا ہے۔

مرزا کا موازنہ نظیری و عرفی کے ساتھ صرف قصیدے اور غزل میں ہو سکتا ہے؛ کیونکہ مثنوی میں نظیری محض صفر ہے؛ اُسنے اِس صنعت کو چھوا تک نہیں۔ عرفی نے بیشک چند مثنویاں لکھی ہیں؛ مگر صاحبِ آتشکدہ نے اُن میں سے صرف ایک کی نسبت لکھا ہے کہ "بد نگفتہ است" اور باقی کی نسبت اُسکا یہ قول ہے کہ "بسیار بد گفتہ" حکیم حاذق عرفی کی مثنوی کی نسبت کہتا ہے۔ حکیم ہمام کا بیٹا

بہ نسبت اہلِ زبان کے، ایک کم علم بہ نسبت فاضل متبحر کے، اور ایک دیہا
بہ نسبت خواص اہلِ شہر کے بمراتب افضل اور اعلیٰ درجے کی رکھتا ہو۔ دوسر
اگرچہ بظاہر اہلِ زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے۔لیکن اسمیں بھی مثلاً
ہندی نژاد اکتساب کے ذریعے سے خاصکر اُس حصۂ زبان میں جو فارسی کی محا
شاعری میں مستعمل ہے اہلِ ایران کی برابری کرسکتا ہے۔ علامہ ابن خلدون عر
کی نسبت۔ جو بمقابلہ فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے۔ لکھتے ہیں کہ وہ ایک عجمی (
غیر عربی) فصحاے عرب کے کلام کی ممارست سے اہلِ زبان میں شمار ہو سکتا ہے
پس فارسی زباں جو بہ نسبت عربی کے نہایت تنگ اور مختصر زبان ہے اس بات
زیادہ قابل ہے کہ ایک ہندی نژاد فصحاے ایران کے کلام کی مزاولت سے اہلِ زبا
میں شمار کیا جائے۔

مذکورہ بالا اصول کے موافق کچھ شک نہیں کہ ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ
کو ملکہ شاعری کے لحاظ سے اکبری دورے کے تمام شاعروں پر ترجیح دیں یا اُن
کم سمجھیں یا اُنکے برابر قرار دیں۔ رہی دوسری لیاقت سو اُسکی نسبت پہلے حصے میں جا بجا
کیا گیا ہے کہ مرزا نے ایک نہایت مستند صاحب زبان کی تعلیم و تلقین اور اپنے ذاتی تفحص
اور کثرتِ مطالعہ اور غواصیِ فکر اور مشقِ سخن اور خاصکر اپنی خداداد لٹریری قابلیت سے
یقیناً وہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا جس سے ایک زباندان مثل اہلِ زبان کے مستند سمجھا جا سکتا
لارڈ مکالے نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ کوئی شخص غیر مادری زبا

ذوق و وجدان کے سوا کوئی چیز اِسکا فیصلہ نہیں کرسکتی - یہاں دو اور سوال پیدا
ہوتے ہیں ؛ اول یہ کہ ایک زباندان آدمی شاعری میں اہلِ زبان کے برابر ہو بھی سکتا
ہے یا نہیں ؟ دوسرے یہ کہ ایک پَیرو اپنے پیشرووں کے ساتھ مساوات کا درجہ
حاصل کرسکتا ہے یا نہیں ؟ سو دوسرے سوال کا جواب تو بالکل صاف ہے - دنیا
میں ابتدا سے آج تک نہ صرف شعر و شاعری میں بلکہ ہر علم اور ہر فن اور ہر پیشہ میں
اکثر پیرو اپنے پیش روؤں کے صرف برابر ہی نہیں بلکہ اُن سے فائق اور افضل
ہوتے رہے ہیں ۔ فردوسی رزمیہ مثنوی میں اسدی اور دقیقی کا پیرو ہے ؛
مگر دونوں سے گوے سبقت لے گیا ہے ۔ خواجہ حافظ غزل میں سعدی کے قدم بقدم
چلے ہیں مگر سعدی سے بہت آگے نکل گئے ہیں ۔ قاآنی قصیدے میں تمام قدما سے
بڑھگیا ہے ۔ میر تقی نے تمام اگلے ریختہ گویوں کو - جو یقیناً اُسکے پیش رو تھے -
غزل میں اپنے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے ۔ میر انیس تمام مرثیہ گویوں سے - جو
اُن سے پہلے ہوئے - بازی لے گئے ہیں ۔ پس اگر مرزا غالب کو فارسی شاعری
میں نظیری و عرفی سے افضل نہیں بلکہ صرف اُن کا ہم پلہ قرار دیا جائے تو اس میں
کون سی تعجب کی بات ہے ۔

رہا پہلا سوال سو ظاہر ہے کہ شاعری کا ہنر دو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے ؛
ایک امیجینیشن یعنی قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی ، دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال
پر قدرت ۔ انمیں سے پہلی لیاقت - جیسا کہ ظاہر ہے - ممکن ہے کہ ایک زباندان

طرز اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہندی نژاد شاعر۔ جو ایسے ناپرساں زمانے میں پیدا ہو
اور جس نے فارسی شاعری میں نظیری و عرفی وغیرہ کے کلام سے بہتر کوئی ممکن التقلید
نمونہ نہ دیکھا ہو۔ وہ سوا اسکے کہ اُن کا اتباع اختیار کرے اور کیا کر سکتا تھا۔ رہی یہ بات کہ
اُسنے اس طرز شاعری میں کس قدر کامیابی حاصل کی ہے اور اُن لوگوں کی پیروی
کا کہاں تک حق ادا کیا ہے۔ سو اُسکو اس طرح ثابت کرنا تو ناممکن ہے جیسے دو اور دو
چار۔ البتہ جو لوگ شعر فارسی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں وہ اکبری دورہ کے شعرا اور مرزا
کے کلام کا مقابلہ کرنے کے بعد امید ہے کہ مرزا کی اعلیٰ درجے کی قابلیت و استعداد
کا اعتراف کرینگے اور اس بات کو تسلیم کرینگے کہ زمانے کا اقتضا اور سوسائٹی کا دباؤ اس
شخص کو جس روش پر ڈال دیتا وہ ضرور اُسمیں کامیاب ہوتا۔ چنانچہ اخیر عمر میں جب
حبیب قاآنی کے قصائد مرزا کی نظر سے گذرے تو اُسکے کلام کی روانی اور بیساختہ پن
دیکھکر اُنکو قاآنی کی روش پر چلنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اور اسی لئے اُنکے سب سے
پچھلے قصیدوں اور قطعوں میں بہ نسبت پہلے قصائد اور قطعات کے زیادہ روانی
اور بیساختگی پائی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ اب دوسری چال چلنے کا وقت نہیں رہا تھا
اس لئے اس روش کی تکمیل ہونی ناممکن تھی۔

اس کتاب میں۔ جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے۔ مرزا کو شاعری کے لحاظ سے جا بجا
نظیری و عرفی وغیرہم کا۔ جنکو خود مرزا اپنا پیشرو تسلیم کرتے ہیں۔ ہم پلہ قرار دیا گیا ہے
سو قطع نظر اسکے کہ کوئی قطعی دلیل اس دعوے پر قائم نہیں ہو سکتی۔ اور ناظرین کے

طبیعت کے اقتضا سے نہ کہ عقل کی صوابدید سے سرانجام کیا جائے اُس سے لوگون کو بواسطہ یا بلا واسطہ کسی طرح کچھ فائدہ نہ پہونچے ؛ ہوا جو اپنی موج مین چلتی ہے، اور دریا جو اپنے جوش میں بہتا ہے۔ گو اُنکو خود خبر نہین کہ ہم کہاں جارہے ہیں اور کیوں جارہے ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اُنکی سعی محض بے حاصل اور اُنکی کوشش سراسر بیسود ہے۔ اسی طرح کوئی ذرہ ذرات عالم میں ایسا نہیں جو اپنی اضطراری حرکت سے نظام کلی میں کچھ نہ کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔

"اے توکہ ہیچ ذرہ را جز براہ تو روی نیست در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری"

یادگار غالب کو ہمنے دو حصوں پر منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں مرزا کی لائف یعنی اُنکی زندگی کے حالات اور اُنکے اخلاق و عادات کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں اُنکے کلام کا انتخاب ہے۔ اگرچہ مرزا کی لائف میں۔ جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں۔ کوئی مہتم بالشان واقعہ اُنکی شاعری و انشا پردازی کے سوا نہیں پایا جاتا، با اینہمہ اسمیں بہت سی مفید نصیحتیں بھی اہل وطن کے لئے موجود ہیں۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ مرزا پانچ برس کے تھے جب باپ کا، اور نو برس کے تھے جب چچا کا انتقال ہوا۔ اُنکی ننھیال۔ جہاں اُنھوں نے پرورش اور نشو و نما پائی۔ آسودہ حال تھی۔ باپ اور چچا کے صغیر سن چھوڑ جانے سے نانا اور نانی کی الفت اور بھی زیادہ بڑھگئی ہوگی۔ خود مرزا کی طبیعت میں گرمی اور جودت کی ایک آگ بھری ہوئی تھی جسکے بھڑکانے کے لئے تھوڑی سی اشتعالک کافی تھی۔ باپ اور چچا کا

خاتمہ

مرزا غالب مرحوم کی لائف اور اُنکے کلام کا انتخاب جس قدر کہ یہاں اُسکا دکھانا مقصود تھا ختم ہوگیا، مگر ابھی چند ضروری باتیں لکھنی باقی ہیں۔

ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کتاب اُن تصنیفات میں شمار نہیں ہو سکتی جنکی آجکل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے، اور جو اہلِ وطن کی موسمی بیماریوں کے لئے براہِ راست دوا اور علاج کا کام دے سکتی ہیں۔ کیونکہ اس مضمون کے لکھنے پر ہمکو اُس اندھی اور بہری دیوی نے مجبور کیا ہے جسکی زبردستی اور حکومت کے آگے مصلحت اندیشی کے پر جلتے ہیں۔

مستانہ سخن میرسد از دل بہ لبِ ما   عشق ست کہ بربستہ زبانِ ادبِ ما

راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدوِ شعور سے آج تک برابر چلا جاتا ہے اُسکو چاہو اُس معتقدانہ جوشِ عصبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے، اور چاہو اُس یقین کا ثمرہ خیال کرو جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بہرتقدیر یہی وہ چیز تھی جسنے ہمکو اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ پس نہ ہمکو یہ دعویٰ ہے کہ ہمنے اس تالیف سے پبلک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے، اور نہ یہ خیال ہے کہ محض ملک کی خیرخواہی اُسکے لکھنے کا باعث ہوئی ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو کام محض

مہر نیمروز	اکبر نامہ
ہر دو را نیاز پرورد۔ چوں بہ برنائی رسید قلمروِ خویش را دو نیم کردہ نیمہ بہ مغل و نیمہ بہ تاتار نامزد کرد و خود بکصد و بست و ہفت سال در گیتی درنگ ورزیدہ سپنجے رفتگاں برداشت اللہ اللہ ایں را نیز چوں روزنہ فرو رفتگانِ دگر روز فرو رفت ؎ ریزد آں برگ و ایں گل افشاند ہم خزاں ہم بہار در گذرست	بحدِ کاردانی رسیدند ملک خود را بہ دو حصہ بخش کرد یک نصف را بہ مغل داد و نصفِ دیگر را بتاتار و چوں پدر بزرگوارِ ایشاں ودیعتِ حیات سپرد۔ فرزنداں بایکدگر موافقت نمودہ ہر کدام در ولایتِ خویش خود آرائی می کردند۔

اکبرنامه

دیب یاقوی بعد از عزلت پدر به
واشارت عالیش فرمان روا
شد. کیوک خان فرزند رشید
اوست. پدرش در هنگام بدرود
کردن جهان سریر خانی باو عنایت
فرمود. او قدر سلطنت را دانسته
در لوازم آن اهتمام بجای آورد
النجه خان پسر اوست در
آخر عمر پدر ولیعهد شده داد
داد و دهش را از اندازه بیرون
برد. و ترکان در زمان دولت او
مست دولت شده از راه خردمندی
عدول نمودند. و چون مدتے
بران بگذشت او را دو پسر
بیک شکم آمد. یکے را مغل
نام کرد و دیگری را تاتار. و چون

مهر نیمروز

را به نمطے تازه آراست. اما بدان دانشوری و دادگری
که جز دانش نه جست و جز داد نه کرد. روزنامهٔ عمرش چون
رقم یکصد و هشتاد و شش سالگی پذیرفت در نوشتند،
و بار نامهٔ یگانگی و گروگشتی بنام پسر فرخ اخترش کیوک خان
نوشتند. ستوده ستایش در خور بکار آگاهی آبروی پادشاهی
افزود. و یکصد و چهل سال از مرگ امان یافت. فرزانه
تا از شاهی نشان یافت جهان را بخوشی و خشنودی جهانیان را
بمهر و آزرم نگاهداشت. سرانجام کار جهان و جهانیان را
بفرزند خویش النجه خان گذاشت. به تردستی دریاکف، و
به بیدریغ بخشی ابر کردار بود. و دهش را برادشتی داد. و فرودستان
(زیردستان) را به دهش از خواهش بے نیاز ساخت. سبکسران باده
بروت (یعنی به کبر و غرور) از جا رفتند. و از دائرهٔ کیش و
آئین بدر زدند. آرامش داد (یعنی انتظام) کنار گرفت،
و بت پرستی صورت پذیرفت. باتوی این فرمانروائے
بابرگ و نوا دو پسر توام زاد. اورنگ نشین (یعنی النجه خان)
یکے را مغل خان و دیگرے را تاتار خان نام نهاد.

اکبرنامہ

یاده خانہا اختراع کرد، وخرگاه
پدید آورد. واز پوستِ بہائم وسباع
لباسِ پوشیدنی دوخت. ونمک در
زمانِ او ظاہر شد. ودر آئینِ او آں
بود کہ پسر را جز شمشیرے میراث نہ دہند
وتمام خواستہ دختر را باشد. وگویند کہ
او معاصرِ کیومرث اولِ ملوکِ عجم ست
واو اولِ سلاطینِ ترکستان ست.
وعمرِ او دو صد وچہل سال بود.
النجہ خاں بہترینِ فرزندانِ ترکی
بود. چوں پیمانۂ زندگی ترکی پرشدن
گرفت او را بمشورتِ بزرگاں بہ
تختِ سلطنت نشاندہ. او خرد
ودوربیں را پیشوائے خود ساخت
ودر عدالت گستری روزگار گذرانده
چوں پیر شد عزلت اختیار فرمود.

مہرِ نیمروز

پدر نہاد (دستور) وقرارداد آں بود کہ از آں ہمہ برگ وساز کہ از پدر ماند
فرزندی (میراث) بازماند جز شمشیر بہ پسر نہ دہند وہمہ بدختر باز گذارند
کہ ہر آئینہ تیغِ جوہردار فردِ فہرستِ گنجینۂ سیم وزر بلکہ کلیدِ فتحِ
ہفت کشور ست۔ اگر بریں پلارکِ الماس گوں دسترس
ست گو زر را دست مایۂ نازیس ست. بالجملہ ایں ہمہ رسم و
آئیں نہاد. وپایانِ کارش پس از دو صد و چہل سالہ بیداری
بخوابِ عدم سر بر زمیں نہاد. بزرگانِ دودہ پس از وفاتِ
او غلاں را بہ فرزندِ بخت بلندش النجہ خاں چشم روشنی
گفتند. کلاہ کج نہاد وراستی پیشہ گزید. بدی پیرامونِ دلش
نگذشتے، وبابداں ہمزباں نگشتے. آزادہ رو بود ودل بیادِ یزداں
درگرو داشت. تاج وتیغ ونگیں در زندگانیِ خویش، بہ نوبادۂ
باغِ کامرانیِ خویش دیباقوی خاں جواں بخت نوجواں سپرد، و
خود ازیں خارزار دامن برچیدہ وبآفریں خانہ کہ تواں آں را صومعہ
گوئی آرمید. دو صد و پنج سال پارۂ بمو داریِ اقبال و پارہ بپرستاریِ
ذو الجلال در جہانِ گذراں ماند، وہنگامِ ناگزیر درگذشت.
دیباقوی خاں کہ ہم در نظرگاہِ پدر اورنگ آرا می بود۔ اورنگِ خسروی

مرزا اور ابو الفضل کی طرز بیان کا مقابلہ

مرزا نے مہر نیم روز میں اکثر تاریخی واقعات وہی لکھے ہیں جو شیخ کے اکبر نامہ میں مذکور ہیں، مگر چونکہ مرزا نے اُن واقعات کو کسی قدر کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ اپنی خاص طرز میں لکھا ہے اس لئے دونو کتابوں کی طرز بیان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ ہم یہاں ایک سیدھا سادہ واقعہ دونو کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔

اکبر نامہ

ترک بزرگترین فرزندان یافث بود ترکان اورا یافث اوغلان گویند و بہوشیار دلی و کارگزاری و رعیت پروری از ہمہ برادران امتیاز داشت۔ بعد از رحلت پدر بر تخت فرمانروائی نشست، و داد مردمی و مردانگی و مظلوم پرستی داد۔ و در جائے کہ ترکان اورا سیلوق باسیلکائی میگفتند، و چشمہ ہائے آب سرد خوشگوار و گرم عافیت بخش و مرغزار ہائے دلکش داشت۔ اقامت فرمودہ۔ از چوب

مہر نیم روز

ترک ابن یافث نشان جہانداری یافت و ترکان این والا شکوہ را۔ ازاں روکہ بہ ترکی شہریار جواں را اوغلان گویند۔ یافث اوغلان گفتند۔ داد و دانش آئین فرمانرواست، و درین ہر دو شیوہ روشنہائے گزیں داشت۔ خانی و فرمانی را فرہنگ ہا پدید آورد، و فرماندہی و فرمانبری را اندازہ برنہاد۔ نزہتگاہ سیلوق باسیلقا را۔ کہ چشمہ ہائے رواں و گل و میوہ فرواں داشت۔ از بہر آرامش گزیدہ از نئے و علف و چوب و گیاہ نشیمن ہا افراختے، و پوست دام و دد را پوشش تن ساختے۔ گویند نمک بروزگار وے پدید آمد۔ ورنہ ازاں پیش ترہ و گوشت ہمچناں بے نمک ہمی خوردند۔ ترکان شمشیرزن را بفرمان فرزانہ شیر افگن (یعنی یافث اوغلان)

حزیں

یوسفستانے ست از گل پیرہناں در موج، نگارستانے ست سیمیں بدنانش فوج در فوج۔ سہی پیکرانند در خیابانِ سطور دوشادوش، مغاں شیوہ دلبرانند از بادۂ ناز گرم نوشانوش۔ نازک بدنانند حجاب پرورد، گل پیرہنانند تہا گرد۔ بجستہ مغز انند برشتہ پوست، بیگانہ نغزانند آشنا دوست۔ صوفیانند در وحدت خانۂ عشق مستِ سماع، سوختگانند سپند آسا مستِ وداع۔ درویشانند تجرد کیش، فرو کیشانند از ہمہ در پیش۔ شیر صولتانند از جوشنِ خط پلنگینہ پوش، دریا دلانند از شورشِ عشق در جوش و خروش۔ آئینہ پیکرانند آئینہ تاب، پاکیزہ گوہرانند یکسر خوشاب۔ گلبر گہاے شبنم زدۂ بہاری ست، خراشیدہ نالہاے بلبلِ شاخساریست۔

غالب

چوں پیکرِ تصویر از حیرتِ واقعہ خاموش (یعنی اپنی بے قدری سے حیران ہیں) مشعل بکف گرنگانند (یعنی فریاد یانند) چوں آذر از دودِ دل سیہ پوش۔۔۔ نگویم دود و چراغست یا لالہ و داغ؛ اما سوختگی را سرگذشت است و خستگی را رویداد۔ نگویم تجلی و طور ست یا جنت و حور؛ اما نازش را قلمرو ست و آرامش را سواد (نواح) طلسمِ شعلہ و دود ست یا ز بستہ زرد شت خیال؛ شعلہ پنہاں، و دود پیدا، دل لوحِ طلسم، و زباں طلسم کشا۔ ہنگامۂ ابرو باد ست برانگیختۂ جادوی فکر؛ ابر گہر پاش، و باد الماس فشاں، اندیشہ طومار نیرنگ، و لب افسوں خواں۔ دودِ کبابیست بانداز پیچ و تابے کہ از شعلہ در دل افتادہ است۔ براہوا تتق بستہ خیلِ غزالے ست بساماں خیشبے کہ در کمیں نگاہ رو داوہ است از سراپردہ دام بدر جستہ۔ جمالیست در پردۂ نمایشِ خویش مشاطۂ حقیقی را ستایش نگار، نہالے ست در سایۂ پرورندگی خویش نخلبند ازل را سپاس گزار۔

شیخ علی حزیں اور مرزا کے طرزِ بیان کا مقابلہ

شیخ نے جو اپنے دیوان کا دیباچہ لکھا ہے اسمیں وہ فخریہ فقرے جو اُسنے اپنے دیوان اور اپنے کلام کی شان میں لکھے ہیں اُسی قسم کے فقرے مرزا نے بھی دیوانِ فارسی کے دیباچے میں انشا کئے ہیں۔ سو دو نو دیباچوں میں سے ہم ملتے جُلتے فقرے انتخاب کر کے اِس مقام پہ مقابل یکدگر لکھتے ہیں۔

حزیں

ہمایوں خطبہ ایست لبالب از جواہرِ کلم، وجواہرِ حِکَم۔ روح پرور ہوایش ربیعی اعتدال، وجداولِ سطورش از ماءِ معیں مالامال۔ خاکش مشکیں نفس، وشمیمش عنبرآگیں، آبش خمار شکن ونسیمش مسیح آئیں۔ از صبوحیِ فیضے کہ ساقیِ کلکش بپیمودہ۔ سیاہ مستانِ حروف سر در کنارِ ہم غنودہ اند، واز نشۂ ہوش پردازے کہ دستِ فکرت در جام وسبوے الفاظش ریختہ۔ خردمستانِ معنی نشیدِ شوق سرودہ۔

بنامِ ایزد حُسنِ لیلی ست کہ از طرفِ خیامِ الفاظ سر بر زدہ در جلوہ گری ست، یا شورِ مجنونے ست کہ از وادیِ تفسیدہ دل بر خاستہ در پردہ دری ست۔

غالب

بنامِ ایزد نخستیں نقابیست از روی شاہدہا ہر ہفت کردہ معنی بجنبشِ نسیم بر اُفتادہ؛ یعنی کشاکشِ دست ناکشیدہ۔ باز بیں چراغیست از گرمیِ چراغانِ نیم سوختہ پہلو برخ بہ افروختن دادہ؛ یعنی داغِ منتِ حس نادیدہ۔ کہن داغہاے جنون ست سراسر بناخنِ شوخیِ نفس خراشیدہ۔ گرما گرم خونابۂ در و فست بہ تفِ پنہانیِ دل ناگاہ از تراویدہ۔ کاغذی[*] پیرہنانند (یعنی دادخواہانند)

[*] الفاظ کو اِس لئے کہ وہ کاغذ پر مرقوم ہیں کاغذی پیرہن کہا ہے اور کاغذی پیرہن دادخواہ کو کہتے ہیں دوسرے فقرے میں معانی کو اسلئے کہ انکی روشنی حروف کی سیاہی میں پوشیدہ ہے مشعل بکف اور سیہ پوش کہا ہے ۱۲

ظہوری

در دلش این و آں نمی گنجد
ہیچ جز حق دراں نمی گنجد
بت شکن گشت چوں خلیل نخست
بادش از ارزانی اعتقادِ درست
کفر در فکرِ نکتۂ عرفاں
شرک در شکرِ نعمتِ ایماں
طینتش باج خواہِ طینت ہا
نیتش پادشاہِ نیت ہا
در عبادت زہے تنومندی
بندگی در خورِ خداوندی
سرِ وحدت بمغز برد از پوست
ہمہ او کرد خویش را ہمہ اوست

غالب

در طریقت رہنمائے رہرواں
در خلافت پیشوائے خسرواں
آنکہ چوں از رازِ وحدت دم زند
دفترِ کون و مکاں برہم زند
آنکہ چوں در نے نوا را سر دہد
نے شود نخلے کہ شبلی بر دہد
شبلی از منبر دہد آوازِ عشق
شاہِ ما بر تخت گوید رازِ عشق
عشق دارد پایۂ ہر کس نگاہ
منبر از شبلی و تخت از پادشاہ
آنچہ ابراہیم ادہم یافتست
بعدِ ترکِ مسندِ جم یافتست
شاہِ ما دارد بہم در رہروی
خرقۂ پیری و تاجِ خسروی
شاہی و درویشی اینجا باہم ست
پادشاہِ عہد قطبِ عالم ست

ظہوری

با شیخ نہ پیوند یست کہ گسیختنش بر کشاکش کشیشاں (یعنی قسیساں) نہ خندد، و کفر را با ایماں نہ سر یست کہ صد اعش صندل چارہ از پیشانی برہمناں نبرد۔ از صدمۂ توحیدش دوئی در یکی گریختہ، و بہ علاقۂ تجریدش خودی در توئی آویختہ۔ گوشے حق شنو، چشمے حق بیں، دلے حق جو، خاطرے عرفاں زا، سینۂ معرفت خیز، تارکے آسماں سا، جبہۂ سجدہ ریز۔

مثنوی

پاسے رفعت بر آسماں دارد
سرِ خدمت بر آستاں دارد
در عبادت بہ گفتن و دیدن
طرز او طرزِ حق پرستیدن
خلوتِ دیگران و صحبتِ او
وحدتِ این و آں و کثرتِ او

غالب

رسا نشستہ است۔ بیکدگر خوردن ایں دو قدح (یعنی فقر و سلطنت) مجمع البحرینے پدید آورد، و سر بہم آوردن ایں دو قوس نقشِ دائرۂ پدیدار کرد۔ از سر جوشِ فروغ مہر و ماہ با فشردن و پالودن و سرشتن پیکرے ساختند، و بہر فروغ گزند چشم بد از پرویں پرن براں پیکر سپند سوختند۔ سرش را تاجِ شاہی افراختند، و دلش را بنورِ الٰہی فروختند۔ ++++ زہے در انجمن خلوت نشیں، و پادشاہی کا زآگہی گزیں۔ پادشاہاں در انجمن ازاں کارآگاہ آدب آموختہ، و کارآگاہاں در خلوت ازاں پادشاہ فیض اندوختہ۔ ++++

مثنوی

اے کہ از رازِ نہاں آگہ نہ
دم مزن از رہ کہ مرد رہ نہ
در ہزاراں مرد مرد رہ یکیست
آدمی بسیار آتا شہ یکے ست
در تو مے پرسی کہ مرد راہ کیست
جز سراج الدیں بہادر شاہ کیست

جامع قرار دیا ہے۔ اور مثل ظہوری کے نظم و نثر دونوں میں یہ مضمون ادا کیا ہے۔ چنانچہ ہم دونو کتابوں سے وہ مقامات مقابل یکدگر نقل کرتے ہیں۔

ظہوری

تا جیداریِ لفظ و معنی بہ حشمتِ ثنای تارک آرایست
کہ سمیِ خلیلِ خود یعنی ابراہیم عادل شاہ را مراد در اقلیم
بہ نُہ نعمت یگانہ و ممتاز گردانیدہ اول معرفت
کہ با وجود حجبِ کثرت در مشاہدۂ شاہدِ وحدت
معنی کما ہو متحیز نظام "لو کُشِفَ الغِطاءُ ما ازددتُ
یقیناً"، وصفِ حالِ او ساختہ، گلستانِ نیت
و بوستانِ عقیدتش از خس و خاشاکِ شک و شبہہ
پرداختہ مجموعۂ عرفانِ موحداں فردے از
دفترِ شناسائیش، عُنف و تشتّت ماسوے
پسندیدۂ طبعِ موانسائیش۔ بہ توضیحِ بیانش
نشانہاے بے نشاں (یعنی ذاتِ بی‌نشاں)
ہمہ دلنشیں و خاطر نشاں۔ بہ آفاقِ جہاں گرد
تاکیدِ نظر بر دو بیناں نینداختن، و بہ مقصورِ قضا
تہدید بہ احوالِ احولاں نپرداختن۔ زنار را

غالب

ازانجا کہ بعد بہر دور ظہورے دیگرست، و پس از ہر انجام
سرانجامے جداگانہ؛ در ہر عہد عہد اسمے دیگرست
(یعنی اسمے دیگر از اسماے الٰہی) و در ہر وقت وقت
کشایشِ طلسمے دیگر۔ قرۂ ایزدی (شانِ الٰہی) کہ جمشیدے
را بنام آوریِ شکوہِ عز و غنا از سیما درخشیدے، و ابدالے
را بہ نشانمندیِ فقر و فنا فروغ بخشیدے۔ مظہرے
کامل و مرآتے روشن خواست تا دراں مظہر ظہورِ
ہر دو رنگ، و دراں مرآت رؤیتِ ہر دو صورت یکبارہ
رو دہد۔ اورنگ و منبر یکے شد، و وسادہ (مسند) و سجادہ را
دوئی از میاں رفت۔ درفشِ کاویانی (کہ نشانِ تاجِ شاہی
ست) از عصا و ردا (کہ ہر دو شعارِ درویشانِ ہر دو
درفش جمع آمدہ) منت پذیرفت کہ پیمانِ یمن بہ پیوندِ
این دو جزو باز بستہ است، و عصا و ردا درفش را سپاس
گفت کہ دریں صفحہ (یعنی در درفش) نقشِ جمعیتِ ما

عرضه میدارم که چون من صد و چون عرفی صد هزار را یه سخن پرورش تواند کرد، و پایه هر یک بهر یک تواند نمود. والسّلام

یہاں تک ہم نے مرزا کے مکاتبات میں سے جو بجائے خود ایک دفتر طویل الذیل ہے کسی قدر صاف اور سلیس عبارتیں انتخاب کر کے لکھی ہیں اگرچہ اس قسم کی اور بہت سی عبارتیں اور خطوط مرزا کے مکاتبات میں سے انتخاب ہو سکتے ہیں مگر کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا ہے اس لئے ہم اسی قدر قلیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس انتخاب کے بعد ہمکو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے اُن مشہور اُستادوں اور نثاروں میں سے جن سے ہندوستان کے لوگ بخوبی واقف ہیں چند شخصوں کی نثر کا مقابلہ مرزا کی نثر سے اس طرح کیا جائے کہ جو عبارتیں مرزا اور دیگر اشخاص کی نثروں میں متحد المضمون پائی جائیں اُنکو ایک دوسرے کے محاذی لکھدیا جائے اور اس بات کا اندازہ کرنا۔ کہ کون سا بیان کس پایہ کا ہے اور کون سا کس درجے کا۔ ناظرین کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا جائے۔

سب سے پہلے ہم دو متحد المضمون مقام سہ نثر اور نیمروز سے نقل کرتے ہیں۔ ظہوری نے دوسری نثر میں ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کی توصیفیں الگ الگ بیان کی ہیں جن میں سب سے اوّل معرفتِ الٰہی کا ذکر کیا ہے اور شاعرانہ مبالغے کے ساتھ اپنے ممدوح کو اس صفت سے موصوف کیا ہے۔ مرزا نے نیمروز کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد بہادر شاہ مرحوم کی مدح کے موقع پر اپنے شاعرانہ انداز میں اُنکو پادشاہی اور درویشی کا

سبب آں تا ہمہ در بنان ہر کس تراسدم و یکدارد۔ آموزش را دریں پردہ راہ نیست۔ و اگر گویند
ہست، ہر آئینہ سخن تو انم گفت کہ نیست۔ اگرچہ تشبیہ و ہمزبانی آموزگار، و بسر بردن روزگار
در سرہ کردن گفتار چوں نسبت صورت ندارد۔ و گفتہ آید کہ ہر چہ بہر لفظ گفتہ اند نہ غلط گفتہ اند
در پایہ شناسی در دل زند۔ و ہمت از مبدأ فیاض دریوزہ کرد، بکثرت مشق، و فراوانی ورزش
نہ پیچیدہ تنہا راہ ہمواری را نداں، گشایش ہا روئے خواہد نمود، و اندیشہ را دستگاہ و گفتار
را سرمایہ خواہد افزود۔

میرزا تفضل حسین مرحوم کو ایک خط میں خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ
جو جس میں عرفی کے سب سے پہلے قصیدے پر لکھا ہے خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اسکی
داد بھی چاہی ہے۔ وہ خط بجنسہ لکھا جاتا ہے۔ "سبحان اللہ! با آنکہ از فرامش گشتگانم، و دامن
کہ دوست مرا بہ دو پیچ لیکہ نیم خشک برنگیرد۔ ہرگاہ بساز دادن آہنگ گلہ روے آرم، و سخن
کہ ایں پردہ (یعنی نغمہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) می توانم سرود، و از قہرمان اندیشہ
دور باشے (یعنی امتناعے) درمیاں نیست۔ ہر آئینہ بدیں شادمانی کہ ہنوزم با دوست
روے سخنے ہست۔ آنچناں بر خویشتن سے بالم کہ غم جاں گداز فراموشی فراموش، ولب از
زمزمہ کہ دل در بند سرودن آنست (یعنی شکایت) خاموش می گردد۔

از خویشتن بذوق جفا با تو ساختیم ۔ با ما دگر مساز کہ ما با تو ساختیم

دریں روزہا ہواے آں در سر افتاد کہ بیتے چند در توحید مجیباً لعرفی گفتہ آید۔ چوں
کوشش اندیشہ بجاے رسید کہ نہ عرفی را مجال ماند، و نہ مرا جاے سخن، ناگزیر آں ابیات را بر کسے

و چشم براہ داشت کہ کے نویسند، و دریغ کہ ہیچ گاہ ننوشتند کہ رخش سنگین (یعنی اسپ سنگیں کہ در اکبرآباد معروف است) و عاے مرا کدام اوا پذیرفت؟ و در پاسخِ سلامِ من بزبانِ ممدوح چہ گفت؟

نواب عبد اللہ خاں صدر الصدر میرٹھ برادر نواب محمد سعید خاں مرحوم رئیس رام پور نے مرزا کو لکھا ہے کہ رئیس ممدوح کی شان میں قصیدہ لکھو مگر اُس زمانے میں مرزا پریشاں بہت ہیں اسلیے اُنکے جواب میں لکھتے ہیں "خدامِ بلند مقام کہ سرانجام قصیدہ از غالبِ بے نوا چشم داشتہ اند مگر آں فرسودہ روانِ افسردہ دل را۔ کہ ہنوز نمردہ است۔ زندہ پنداشتہ اند۔

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی　　　　بدست مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

کاش گشایشِ ایں کار چوں صنعتِ نقاشی وگلدستہ بندی تنہا بکوششِ دست و بازو صورت بستے، تا چشم از خستگی دل پوشیدمے، و فرماں پذیرانہ در پردازشِ کار کوشیدمے، چہ کنم چوں سرِ ایں رشتہ در دستِ دل ست۔ تا دل بر جاے نباشد زباں سخن سراے نباشد۔ دیدہ ورانِ صاحبدل دانند کہ چہ قدر دیدہ و دل بہم آمیختہ شود، تا نقشے۔ بداں شگرفی کہ بالغ نظراں پسندند۔ انگیختہ شود۔ ایں دلِ شکستہ بہم نہ پیوستہ۔ کہ در سینۂ من، وہمانا دشمنِ دیرینۂ من ست۔ زنہار بکارِ سخن گستری نیاید، و معنی آفرینی را نشاید+ + +

قاضی عبد الجمیل بریلوی نے کچھ غزلیں اوّل ہی مرتبہ اصلاح کے لئے بھیجی ہیں اُسکے جواب میں اصلاح کے متعلق لکھتے ہیں "خواہشِ حک و اصلاح مہر افزود۔ چندانکہ دیدہ بداں سواد دوختم تا زیبا صورتے بنظر در نیامد، ہنجار و روشِ خود از نیروہاے درونی ست۔ آرے

نداشت، و هر چه کرد از بیخودی و ابلهی کرده - اگر دانا بودے، از خرد داشتے - آنان را که
راه زده است نه راه زده، و کار ها از آنان گذشته - و اینان را که باشد در یک پیرهن جا داده
است - چون غبار از دامن افشاندے، و هرگز بدامے اینان نرفتے - کودکی و بیجا صلی
ورزید، اگر در ایام خانه جنگی و ولیعهدی از آنان دلے بر داشت، و با اینان لختے رام بود،
از آنان دل بدین خیرگی خالی کردن، و در دام اینان بدین کوری در آمدن - نه بفرمان دانش ما
ست نه بفرمان بینش، حکیم را میگوئی؟ و کرم پیشه کرا میخوانی - - - چون سخن درین
باب بسیار است نامه بدعا ختم می کنم - دیده بینشے درست و دل را دانشے سودمند روزی باد۔

مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ جن سے مرزا باندے میں ملکر کلکتے روانہ ہوئے
ہیں - کلکتے میں پہنچکر انکو سفر کی تمام روئداد لکھی ہے اسکے آخر میں لکھتے ہیں ۔ دو روز شنبہ
چہارم شعبان پارۂ از روز بر آمدہ در کلکتہ رسید - غریب نواز بیاسے و باب بے منت را نازم
کہ در چنیں دیار خانۂ چنانکہ باید، و ہرگونہ آسایش را بکار آید؛ ہم او را باندازۂ فراغ خاطر آزادگاں
نشناسئے، و ہم اندر و ماندہ و ہاں آز دنیا طلبان بیت الخلاسئے؛ در گوشۂ صحن پر از آب شیریں
چاہے، و بر طرف بام در خور اہل تنعم آرامگاہے - بے آنکہ جستجوئے رود، یا گفتگوئے شود، بمیانجی
وسیلۂ زحمت بکرائیہ دہ روپیہ ماہانہ بہم رسید؛ و آدم و چہار پا را آرامگاہ آرامش گردید - دو روز
از رنج راہ آسودہ منشور لامع النور (یعنی سفارش نامۂ مولوی محمد علیخاں) را مشعل راہ مدعا
ساختم، و در کشتی نشستہ آہنگ ہگلی بندر کردم - لطف ملاقات نواب علی اکبر خاں طباطبائی
اگر گویم کہ مرا از بخت عجب آمد روا است، و اگر گویم کہ مرا بر من رشک آورد نیز جا دارد، بخدا کہ

نامہ بپایاں رسید، و شرمم پراگندہ گوئی و درازنفسی بر من استیلا کرد۔ دیدہ وراں دانند که گفتنی فراواں بود، و افسانہ پریشاں، تا کجا اندک گفتمے، و گفتار را از درازی نگاہ داشتمے، مرا در آنچہ رفت گناہے نیست۔ و اگر خود گناہ است، دوست کریم ست و کرم عذر خواہ۔ والسلام

منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص کے باپ رائے چھجمل دہلوی نے مرزا کو جبکہ وہ کلکتے میں ہیں ایک رئیس کی نسبت جو اپنے باپ کی جگہ مسند نشین ہوا ہے۔ لکھا ہے کہ وہ حکیمانہ طریقہ رکھتا ہے اور سخاوت اسکی جبلت میں ہے۔ اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں "ایکہ گفتی فلانی روش حکیمانہ دارد، و دنیا را کار آگاہانہ می گذارد۔ با ایں ہمہ اندوہ ہناکی خندہ ام در گرفت، و عنان ضبط خویش از کفم بدر رفت۔ ندانی کہ براسیان باد رفتار برنشستن، و گروہا گروہ مردم را پیشاپیش دوانیدن، تن را بلباس رنگا رنگ برآراستن، و معدہ را بہ الوان خوردنیہا ممتلی گردانیدن، شہوہ از اندازہ بیروں راندن، و غبارہ معصیت بر فرق افشاندن، از حکما نیاید؛ و بزرگاں را نشاید۔ کار دانشوراں چیست؟ دور از آبادی درین کوہے نشستن، و از شش جہت در بروے خلایق بستن، تن را بریاضت فرسودن، و جہاں را بہ تجردی پالودن۔ ہر کہ حکیم خرد گزین ست کار و بارش این ست۔ بے برگ و نوائے از شکنجہ گوناگوں حسرت بدر جستہ بہ فراخ نائے سرخوشی دستی) رسیدہ است، از کجا کہ آزادہ رو و بالطبع کریم بود۔ ہنوز آدعیہ منی از رباح غلیظہ صالحہ کبد یہ ممتلی دارد؛ ہر آئینہ بفرمان باد ست۔ روزے چند باش تا بنگری گرہ بر کیسہ زر زناں، و در حسرت زر تلف کردہ زاری کناں۔ ایں کہ فلاں و بہماں را از نزد خویشتن راندہ است۔ حقا کہ روئے در مصلحتے

کرد، و بلاهور همراهی معین الملک گزید چون بساطِ دولتِ معین الملک درنوشتند۔
بدهلی آمد، و باذوالفقار الدوله میرزا نجف خان بهادر پیوست۔ زان پس پدرم عبدالله بیگ
خان بشاهجهان آباد بوجود آمد، و من به اکبرآباد۔ چون پنج سال از عمرِ من گذشت۔ پدر از
سرم سایه برگرفت۔ عمِ من نصرالله بیگ خان چون خواست که مرا بناز پرورد ناگاه مرگش
فراز آمد۔ کما بیش پنج سال پس از گذشتنِ برادر پے همیں برادر برداشت، و مرا درین
خرابه جا تنها گذاشت۔ و این حادثه که مرا نشانهٔ جان گدازی و گردون را کمینه بازی بود
در سال، هزار و هشت صد و شش عیسوی هنگامِ هنگامه لشکرآرائی و کشورکشائیِ صمصام الدوله
جرنیل لارڈ لیک بهادر بروے کار آمد۔ چون عمِ مرحوم از دولتیانِ دولتِ اهلِ فرنگ، و با
انبوهیِ چهار صد سوار برکاب صمصام الدوله، با سرکشان سرگرمِ جنگ بود، و هم از بخشش هاے
سرکار انگریزی دو پرگنه سیر حاصل از مضافاتِ اکبرآباد به جاگیر داشت۔ سپه سالارِ سرکار
انگلستیه بخوشنودی بهاے آفتاب (یعنی نصرالله بیگ خان) کلبهٔ تارِ گدایان را چراغ، و ما
بینوایان را بعوضِ جاگیر بشاهره از خزانه جستجوے وجه معاش فراغ بخشید تا امروزه
که شمارهٔ نفس شماریِ زندگانی به چهل و چهار میرسد، بدان راتبه خرسندم، و بدان مایه قانع۔
در سخن از پرورش یافتگانِ مبدأ فیاضم، و سوادِ معنی را بفروغِ گوهرِ خویش روشن کرده ام
از هیچ آفریده حقِ آموزگاریم بگردن، و بارِ منتِ هیچ تلمیذم بر دوش نیست۔

غالب بگهر ز دودهٔ زادشمم
زان روی بصفای دمِ تیغست دمم
چون رفت سپهبدی زدم چنگ بشعر
شد تیرِ شکستهٔ نیاگان قلمم

و بیہودہ خامہ را (یعنی کلامِ خود را) پارہ پارہ بہم بستہ و ریزہ ریزہ یکجا کردہ، بگمانِ نام آوری
کہ دل از تابِ اندوہِ نارَوائی آں خوں ست۔ دیوانے ترتیب دادہ جابجا بنظرگاہِ التفاتِ
یاراں فرستادہ ام۔ بزرگانے کہ بہ پرستشِ غالبِ مستمند روے آرند۔ سوادِ ہر غزلے کہ
خواہند ازاں اوراق بردارند، کہ انتخاب و التقاطِ اشعار حوالہ بہ راے نامہ گرد آور (یعنی
مؤلفِ تذکرہ) است نہ باشارہ و ایماے سخنور + + + + آنا اگر گزارشِ حالِ سخنور
ہوس ست، خود ایں مایہ بس ست کہ چوں در جریدۂ آں فن از من سخن رانند۔ سخن را
در ستایشِ من بدیں گونہ بہ گرمی نشانند کہ از ناکسانِ روزگار و بیکسانِ دہلی و یار مسلمان نژاد
الیست کافر ماجرا، و گبریست مسلمان نما، کہ از غلط نمائی غالب تخلص میکند و بدیں نام
ترانش ہمی نماید۔

خرسندی غالب نبود ز ہیمہ گفتن — یک بار بفرماے کہ اے ہیچکس ما

پنہاں نماناد کہ در اصلِ آفرینش از دودۂ روز فرو رفتگاں، و حلقہ بخت برگشتگاں ستم رسیدۂ
و بروے ہیچ نادیدہ کسم، آرایشِ سخن پیشکش۔ (یعنی برطرف) ترک نژادم، و نسبِ من
با فراسیاب و پشنگ مے پیوندد۔ بزرگانِ من ازانجاکہ با سلجوقیاں پیوندِ ہم گوہری داشتند،
و بعہدِ دولتِ ایشاں رایتِ سروری و سپہبدی افراشتند۔ بعد سپری شدنِ روزگارِ جاہمندی
آں گروہ (یعنی سلجوقیاں) چوں نارَوائی (کساد بازاری) و بینوائی روے آورد۔ جمعے را
ذوقِ رہزنی و غارتگری از جاے بُرد، و طائفہ را کشاورزی پیشہ گشت۔ نیاگانِ مرا بہ
توراں زمیں۔ شہرِ سمرقند آرامگاہ شد۔ ازاں میانہ نیاے من از پدرِ خود رنجیدہ آہنگِ ہند

گنجینهٔ خسروانِ پارس را از هر علم دفترے بود، و هر دفتر از گرانمایگی گنجِ گوهرے۔ چون
دولت از آن طائفه روے بر تافت، و سکندر ابن فیلقوس بر ایران دست یافت، کتب خانهٔ
خسروی بتاراج رفت۔ اما آنچه پراگنده بوده، گمنامان بهر گوشه و کنار داشتند۔ بر جا ماند، تا بروزگار
پیروزیِ تازیان دران کشش و کوشش از هر جا گرد آمد (فراهم آمد) و بفرمانِ خلیفه- افروزینهٔ گلخن
گرمابهاے (حمامهاے) بغداد شد۔ همانا احکامِ آذر پرستی هم با آذر بازگشت۔ زبان آورانِ
عرب پارسی را به تازی آمیختند، و زبانے تازه بر انگیختند۔ اکنون کیست تا بدان زبانِ کهن
سخن درست تواند گفت، و از ان دیرین آئین براستی خبر تواند داد۔ پژوهندهٔ این راز را
کامِ دل بر نیاید؛ و من ضامن که هر چه پس از فراوان جستجو فراهم آرد- نه آنچنان باشد که
دل بدان توان نهاد۔

دیگر آنچه کلکِ خشکبار بدان رفته که نتیجهٔ از گفتارِ ناروا ے خود بنگارم، و لختے از ماجراے
خود برگزارم- اندیشه را به لب گزیدن و خرد را به انگشت زدن (در محلِ تعجب) افگند۔

چه گویم از دل و جانے که در سپاسِ من ست — ستم رسیده یکے نا امیدوار یکے

از چه بدان آزرم و مرا این پایه از کجا باشد که ستودگان مرا ستایند، و گفتارِ مرا در تذکرهٔ
شعرا جا دهند۔ از فرجامِ فرهمندیِ هستی (یعنی از شان و شکوهِ هستی) و سر و برگِ پیدائی-
که نزدِ آشکارا بینان زود زوال، و به والا دیدِ یکتا گزینان (یعنی قائلانِ وحدتِ وجود) نمودِ
بے بود ست- آنچه بمن داده اند زبانے ست یاوه سراے و خامه ایست بیهوده پوے۔
من هم از بے مایگی چون کودکان که درم از سفال سازند و به گنجینه داری نازند- سرودهٔ زبان

نوالی یافت، لاجرم دانش من (علم من) اندازهٔ سرانجامِ پاسخ آں برنتافت (تحمل نکرد) چوں بی دوباره
گفتند کہ خواہشِ ما چنیں است۔ ناچار اہرِ خموشی از دہاں در پردهٔ شرم نادانی از میاں برداشته میگویم کہ
روائی ایں خواہش از ہیچکس چشم نتواں داشت، و خود را بہ سزائیں پژوہش و تلاش خستہ نتواں کرد
نگارندهٔ دبستانِ مذاہب با ایں ہمہ لاف آشنا روئی (واقفیت) آنچہ میگوید نہ ہمہ است و نہ ہمہ بر جای خود است
(یعنی نہ مکمل است و نہ سراپا صحیح است) پارسیانیکہ در صورت و معنی آشیاں وارند۔ زینہار گماں نبری
کہ از آں گروه (یعنی از ستمگانِ پارس) جز نام نشاں دارند۔ آں پوید و آں ہنجار (یعنی آں روش
و آں طریق) و آں نگارش و آں گفتار ندانند، و جز تخمہ و نژاد از روئے شیوه پارسیاں
نمانند۔ پارسیاں از گرانمایگانِ روزگار، و برگزیدگانِ دادار بوده اند، و بہ روزگارِ فرمانروائی
خویش دانشہائے سودمند (علوم مفیده) و کنشہائے خرد پسند (اخلاقِ پسندیده) داشتند۔
کشایشِ رازِ خرامشِ ہفت سپہر، و نمایشِ اندازهٔ گردشِ ماه و مہر، پدید آوردنِ رخشنده گہرہا
از تہِ خاک، و برکشیدنِ بادهٔ ناب از رگِ تاک، پژوہشِ اسبابِ خستگی و رنجوری، و گزارشِ
احکامِ پزشکی (طبابت) و چاره گری، پرده کشائی فہرستِ اسرارِ کیائی (سلطنت) و فرماندہی،
و رصد بندی تقویمِ آثارِ بندگی و فرمانبری، عنوانِ یک دگر بستنِ رنگ رنگ گہرہا، ہنجارِ
سره کردنِ گونہ گوں ہنرہا، و ارو گیاہا فراخورِ ہر درد بکار اندر آوردن، و پرندگانِ ہوا
و درندگانِ دشت را نشکار اندر آوردن، کوتاہی سخن۔ والائی اندازِ ہر گونہ بینش، و پیدائی
اندازهٔ کمالِ آفرینش، ہمہ در آئینهٔ اندیشهٔ ایں فرزانگاں روئے نموده۔ و انگیزشِ
بایستگی گفتار و کردار۔ کہ اکنوں بہ اندکے ازاں بسیار نازند۔ از مغزِ دانشِ ایں فرہنگیان نو بدست۔

رخصت می شوم - مرا - جز آنکه بپذیرم - گزیر نیست . امّا ایزد دانا داند که لفظ وداع از دل بزبان نمی رسد الّا بصد جرِ ثقیل "، تا اینجا سخن ولیعہد بہادر ست . غالب مستہام از شما می خواہد که واقعۂ تودیع مولوی فضلِ حق، و اندوہ ناکیِ ولیعہد بہادر، و پدرود آمدن دلہاے اہلِ شہر، بعبارتے روشن و بیانے دلاویز در آئینۂ سکندر بقالب طبع درآرید؛ و مرا درین تفقد منت پذیر انگارید . والسّلام

مولوی سراج الدین احمد نے خط اس مضمون کا بھیجا ہے کہ مرزا صاحب کچھ حالات پارسیوں کے اسلاف کے لکھیں اور کوئی ایسی کتاب نشاں دیں جس سے انکے مفصّل حالات معلوم ہوں - نیز کسی تذکرے میں درج کرنے کے لئے مرزا کے اشعار کا انتخاب اور خود مرزا کا ترجمہ طلب کیا ہے اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں -

"ہر نسیمے کہ ز کوے تو بخا لم گذرد یادم از و لولۂ عشرِ سکیباز دہد

رسیدنِ مہر افزا نامہ دل برد، و جاں بخشید . اگرچہ آں جاں با من نماند، و ہم بر سرِ آں نامہ نبشاندن رفت ؛ لیکن سپاسِ دلربائی و جاں بخشی باقی ست . امید کہ تا جانِ بخشیدۂ یزداں در تن ست گزاردہ آید .

مخدومِ من در رسیدنِ نامۂ پیشیں دو دل (متردد) چراست ؟ ہنوزم نشاطِ ورود آں نمیقہ در دل، و سوادِ سطورِ آں صحیفہ در نظر جا دارد . چوں فرماں چناں بود (یعنی در نامۂ پیشیں) کہ غالبِ خویشتن نشناس لختے از رسم وراہِ سترگانِ پارس برگوید، و کتابے ازاں گروہ نشاں دہد کہ رازِ آں دیریں کیش، و سازِ ایں باستانی زباں - ازاں اوراق

ایک اور خبر کے درج کرنے کی درخواست اِس طرح کی ہے دو گمنامے را نامور ساختن، و ہیچے را ہمہ پندا شتن، عنایتے ست سترگ و مرحمتے ست بزرگ؛ خاصہ کہ آں سترگ عنایت بے ابرام داعی روے نماید، و آں بزرگ مرحمت بے استدعاے سائل بظہور آید۔ نگرندہ اگر دیدۂ حق بیں دارد۔ بنگرد کہ واجب تعالےٰ شانہٗ اجزاے ممکنہ را۔ کہ در کتم عدم متواری بودہ اند بمحض عنایت پیرایۂ وجود بخشیدہ، و براں معدومات منت نہادہ۔ حقا کہ اگر تا تے ٔ ہلے بسزا کردہ شود و رقم گشتن قطعۂ تاریخ در آئینۂ سکندر ازیں عالم خبر می دہد۔ وچوں نا خواستہ انچنیں نوازش بمیاں آمد۔ ہر آئینہ روائی خواہش را چگونہ چشم تواں داشت۔ لاجرم در گزارشِ مدعا فصلے بمیاں نہادہ آرزو را سرانجام گفتگو دادہ می شود۔

نہفتہ مباد کہ قدر شناسیِ حکّام رنگِ آں ریخت کہ فاضلِ بے نظیر و المعیِ یگانہ مولوی فضل حق از سر رشتہ داری عدالتِ دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار رہا نید۔ حقا کہ اگر از پایۂ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک واماند، و باز آں پایہ را بسر رشتہ داریِ عدالتِ دیوانی سنجند، ہنوز ایں عہدہ دونِ مرتبۂ وی خواہد بود۔ بالجملہ بعد ازیں استعفا نواب فیض محمد خاں (رئیسِ جھجھر) پانصد روپیہ ماہانہ براے مصارف خدامِ مخدومی معیّن کرد و نزدِ خود خواند۔ روزیکہ مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت ولیعہد خسرو دہلی صاحب عالم مرزا ابو ظفر بہادر مولانا را تا بہ سرود کند۔ سوے خود طلبید، و دو شالہ ملبوس خاص بدوشِ وے نہاد، و آب در دیدہ گرداند؛ و فرمود کہ وہ ہر گاہ شما می گوئید کہ من

در نظرم تیره و تار شد. نخست آنچه بنظر در آمد خرد آشوب خبرے بود که دل تا جگر خوں کرد۔ یعنی از جہاں رفتن خواہر عزیز شما۔ ہے ہے! ایں مخدومۂ مرحومہ ہماں ست کہ تا در کلکتہ خبر رنجوری وے شنودہ بودید دل از دست رفتہ بود، و سراسیمگی سراپاے خاطر را فرو گرفتہ در نظر دارم کہ از مردنش بر شما چہ قیامت گذشتہ باشد. توانا ایزد پاک شما را شکیب عطا فرماید، و تنومندی دل و توفیق ثبات ارزانی دارد، و ایں سانحہ را در روزنامۂ عمر شما خاتمۂ مکارہ و مقطع مصائب گرداند.

آشکارا شد کہ مخدوم مرا از علاقۂ تازہ خشنودی نیست. ہر آئینہ انکشاف ایں معنی غبار ملال بر دل فرو ریخت. خدارا دل تنگ نتواں شد، و کلکتہ را غنیمت باید پنداشت. شارستانے (معمورۂ) بدیں تازگی در گیتی کجاست. خاک نشینی آں دیار از اورنگ آرائی مرز بوم دیگر خوشتر. من و خدا کہ اگر متاہل نہ بودمے، و طوق ناموس عیال بگردن نداشتمے، دامن بر ہر چہ ہست افشاندمے، و خود را دراں بقعہ رسا ندمے. تا زیستمے دراں مینو کدہ بودمے، و از رنج ہواہاے ناخوش آسودمے. زہے ہواہاے سرد، و خوشا آبہاے گوارا، فرخا بادہ ہاے ناب، و خرما ثمرہاے پیش رس.

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

مولوی سراج الدین کو مرزا صاحب نے کسی واقعے کا قطعۂ تاریخ لکھکر بھیجا ہے اور اُنھوں نے بغیر خواہش مرزا صاحب کے وہ قطعہ بہت سی مدح و ستائش کے ساتھ اخبار آئینہ سکندر میں چھپوایا ہے۔ جب وہ پرچہ مرزا کی نظر سے گذرا ہے تو اُسکا شکریہ ادا اور

نیست، و قرار داد نیز ہماں ست۔ لاجرم دیوانہ بودمے اگر دریں کشور باز آمدمے، و با
یک قبیلہ (یعنی با جمعے کثیر) کہ خویشاں و برادرانِ من اند۔ بہ ستیزہ برخاستمے۔ و بہ
باطل ستیزی نام برآوردمے۔ + + + + + + +

چکنم کہ کار برگشت، و روزگار برگشت۔ خدا را بنگر، وہ بہ دردِ دل من وارس۔ کولبرگ
بتوسط کرنیل ہنری اللاک بر من مہرباں شود، و رپوٹے کہ خوشتر ازاں نتواں اندیشید۔
بصدر فرستد، و جوابے کہ سودمند تر ازاں نتواں سنجید۔ از صدر حاصل نماید، ہنوز
آں جواب در راہ باشد کہ کولبرگ معزول گردد۔ و ہاکنس۔ کہ بجاے کولبرگ نشیند۔
آنچہ برہم زدنِ ہنگامۂ سلطنتے را بس باشد۔ از بہرِ من بصدر نویسد، و من دراں داوری
(معاملہ) از مستر استرلنگ چشم یاوری داشتہ باشم، ہنوز آں رپوٹ بصدر نرسیدہ باشد
کہ مستر استرلنگ رہرو راہِ عدم گردیدہ باشد۔ چوں از ہمہ بگسلم، و بدامنِ جارج سوئٹین
بہادر آویزم، گرم از جا برخیزد، و دامن بہ شغلِ جہانبانی افشاند۔ سبحان اللہ!
معزول نگردد مگر کولبرگ، بمرگِ ناگاہ نمیرد مگر استرلنگ، بولایت نرود مگر جارج سوئٹین،
در خورِ ایں صدمہ ہاے جاں کاہ نباشد مگر اسد اللہ داد خواہ + + + + + + + + +

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک اور خط

،، دلنواز نامہ پس از عمرے
رسید، و عمرے دیگر بخشید، تا عمرِ باندوہ سپری شدہ را تلافی تواند کرد۔ اما تا شاد کردنِ دلے
کہ نہادش بہ غم سرشتہ باشند نہ آسانست۔ منم کہ چوں نامہ شما رسیدے مستانہ از جاے
برجستمے، و جہاں جہاں نشاط اندوختمے۔ اینک تا چشم بسوادِ ایں صحیفہ دوچار شد گیتی

گذرد و خبر ندا شتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست و چہ حال دارد۔ اگر جفا بپاداش
وفاست بسم اللہ ہر قدر توانی تیز اسے۔ کہ اینجا مہر و وفا فراوان ست، لاجرم جفا نیز باید کہ
فراواں باشد۔ و اگر خود ایں تغافل بہ باد افراد (یعنی بپاداش) جرمے دیگرست تخت گناہ مرا
خاطر نشان باید کرد، و انگاہ انتقام باید کشید، تا شکوہ درمیاں نہ گنجد، و ہرزہ گفتار نباشد۔
ستم کہ معاش من از گونہ گوں رنج و رنگ رنگ عذاب بہ معادِ کفار ماند، خوں در جگر، و آتش
در دل، و خار در پیراہن، و خاک بر سر، ہیچ کافر بدیں روز گرفتار مباد، و ہیچ دشمن
ایں خواری مبیناد۔ راست بہ تنہا روی مانم کہ در صحرا پایش بہ گل فرو رود، و ہر چند
خواہد کہ بالا جہد نتواند و فرو دتر رود۔ والا قدر نواب امین الدین احمد خاں بہادر
گیتی را بر ویش دیدمے، و وصالش را زندگی دانستمے، بہ کلکتہ رہگرا شد۔ و مگر زندگی از بہر کہ
خواہم و دل را بہ دیدار کہ شادماں دارم۔ واماندگی من از ینجا تواں سنجید کہ نتوانستم ہمپائی
کردن، و در وادا شتم او را تنہا گذاشتن +

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین کو اپنے مقدمہ کے بگڑ جانیکا حال اسطرح لکھتے ہیں:
"دو کارِ من بہ واد گاہِ دہلی۔ چنانکہ دانستہ باشید۔ تباہی گزید۔ حالیا براں سرم کہ اگر مرگ
اماں دہد بازبداں "دَر" (یعنی در سپریم گورنمنٹ) رسم، و درد دل بداں زمزمہ فروریزم کہ مرغان
ہوا و ماہیانِ دریا را بر خود بگریانم۔ ہیہات! اگر معاش من ہمیں پنجہزار روپیہ سالانہ بہم
بدیں تفریق۔ از روے دفتر سرکار ثابت شدہ بودے بایستے کہ صاحبانِ صدر مرا از پیش
رانندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروش، آنچہ تو بازیافت و اندوختہ یافتنی ازاں افزون تر

بے پدری پسران وے. ہر چند از مرگ نتواں نالید، و گسستن تار و پود پندار ہستی را چارہ نتواں کرد۔ لیکن انصاف بالائے طاعت ست، ہنوز ہنگام مردن مرزا احمد نبود، چرا آں قدر صبر نہ کرد کہ بہ کلکتہ رسیدمے، و روئے نظارہ فروزش دگر بارہ دیدمے. چرا آں مایہ درنگ نہ ورزید کہ حامد علی جواں گشتے، و کارہا باندازۂ دانش وے رواں گشتے، حیف کہ ہمیں پسرش خرد سال ست، و باشد کہ بہ حقیقت سرمایۂ پدر روانا، و بگرد آوردن زرہائے پراگندہ توانا، نباشد. و باشد کہ چوں آں سرمایہ بہ چنگ آرد بباد دہد، و بر فرودستان خود ستم کند، و ہمیں برادراں را ناکام گزارد. ہر آئینہ دریں حال امینے باید ہوشمند و حق شناس کہ گرد چارہ برآید، و غمخواری بے پدر ماندگاں نماید. للہ درّ من قال ؎

مرا باشد از درد طفلاں خبر　　　کہ در طفلی از سر برفتم پدر

واللہ کہ تیمار آں بیچارگاں عین فرض و فرض عین ست ہم بر شما و ہم بر مرزا ابوالقاسم خاں. بیکسی ایں جماعہ در نظر باید داشت و غافل نباید بود. ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین.

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد سے دوستانہ شکایت اِس طرح کرتے ہیں

"زنہار صد زنہار اے مولوی سراج الدین! بترس از خدائے جہاں آفریں۔ کہ چوں قیامت قائم گردد، و آفریدگار بنشیند، من گریاں و موئیہ کناں دراں ہنگامہ آیم، و در تو آویزم و گویم کہ ایں آنکس ست کہ یک عمر مرا بمحبت فریفت، و دلم برد، و چوں من از سادگی بر وفا تکیہ کردم، و ایں را از دوستاں برگزیدم۔ نقش کج باخت، و بمن بیوفائی کرد. خدا را بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد؟ و چہ عذر پیش خواہی آورد؟ وائے بر من کہ روزگارہا

ازہم گسیخت و تمعِ ایوانِ سروری مُرد، و نہالِ باغِ آگہی را برگ و بار فرو ریخت. دستگیرِ درماندگاں
از دست از کار رفت، و گرہ کشائے بستہ کاراں را ناخن بشکست. ندانم بدین چگونہ
گویم؟ و اگر نہ گویم کیست کہ بشنود؟ کہ مسٹر اندرو استرلنگ مُرد، و از گیتی جز نام نیک
باخود نبرد. کاش مرا نیز زہرے گداختہ (پگھلی ہوئی کانسی) بگوشم ریختندے تا نشنودمے
کہ چہ شد. اکنوں امید غمخواری از کہ باید داشت؟ و دل را بخیالِ گردشِ چشم کہ تسکین دہد؟
ریوسٹے کہ فرانسس ہاکنس بہادر در خصوصِ دادخواہی من بہ صدر فرستادہ است.
چگویم کہ چہ مایہ امید گاہ و اندوہ فرسا بودہ است تکیہ بر کارسازیِ آں چابک خرام
بیداسے شاد (یعنی استرلنگ) داشتم اکنوں از ستیزش سو فلک بکام دشمن ست. زنہار در
پاسخ ایں نامہ درنگ روا مدارید؛ و بنویسید کہ آں والاگہر را چہ روئے داد، و آں گلبنِ
روضۂ مردمی را کدام تند باد از پا فگند؛ و پس از وے سر انجام دفتر کدہ چہ شد و جایش کہ
گرفت. اللہ بس ماسویٰ ہوس.

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اپنے ایک کلکتے کے دوست مرزا احمد بیگ
کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں "والا نامہ رسید، و نوید فراقِ دائمی مرزا احمد رسانید۔
چہ مایہ سنگیں دل و سخت جانم کہ نامہ در تعزیتِ دوست انشا می کنم و اجزائے وجودم
ازہم نمی ریزد. می گفت کہ بدہلی می آیم؛ وعدہ فراموشِ بے مروت راہ گرداند، و ناقہ
بسر منزلِ دیگر راند. گرفتم کہ خاطر دوستاں عزیز نداشت چرا بحالِ خردسالانِ خود
نہ پرداخت، و سایہ از سرِ شاں باز گرفت. وائے بے یاری یاراں وائے، و دریغا

بنده، و خود را دوست دیرینۂ امین الدین خاں دانستہ آنچناں چارہ سازی و کار گشائی بجا آرید کہ ایں دردمند دور از خانماں (یعنی امین الدین خاں) اسد اللہ روسیاہ را فراموش کند، و شما را بجائے او داند، و نیز بہ برادر والا قدر گفتہ شدہ است کہ چوں بہ کلکتہ رسد شما را دریابد۔ و داند کہ اسد اللہ پیش از وے بہ کلکتہ رسیدہ است۔ قطع نظر ازیں مدارج کہ بہ شمردم۔ آخر خدائے ہست و دادے ہست۔ افسانہ ناکامی و ستم کشی ایں فروغِ ناصیہ سعادت یعنی امین الدین احمد خاں خارہ را دل بگدازد، و آہن را آب گرداند،،

دوسرا خط مولوی سراج الدین احمد کے نام اس طرح شروع کرتے ہیں "گوہر آگیں نامہ دلنواز پس از روزگارے دراز رسید، دیدہ و دل را فروغ و فراغ بخشید۔ نارسیدنِ نامہ مرا با شمردگی شوقم محمل کردید، چرا بہ مرگِ من محمل نکردید؟ تا از ادا شناسی ہائے شما خرسند بودمے، و شما را اہلِ دل و دانش بشمردمے۔ من و ایمانِ من کہ رشتۂ مہرِ شما بہ مغزِ دل و دیدہ، و محبتِ شما با جاں در آمیختہ تا زندہ ام، بندہ ام۔ وفا آئینِ من ست، و مودت دینِ من بست۔ اگر در نگارش نامہ درنگے روے دہد بر فراموشی محمول نشود۔ دردہا در دل، و ہنگامہ ہا در نظر، و تفرقہ ہا در خاطر، و سوداہا در سر۔ چہ گویم چہ می کنم، و روز و شب چگونہ بسر می برم"

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اسٹرلنگ صاحب فارن سکرٹری گورنمنٹ ہند کی وفات پر اس طرح لکھتے ہیں "عمرِ من و جانِ من! پس از رسیدنِ گرامی نامہ در بندِ آں بودم کہ پاسخ گزارشوم و ماجرائے خود شرح دہم۔ ناگہاں دی کہ دوشنبہ پانزدہم ذی الحجہ بود آوازہ در افتاد کہ مجموعۂ مکارمِ اخلاق را شیرازۂ وجود

دائم و دل که در شکوه چه روش ها ایجاد و در گله چه عربده ها بنیاد کردے ۔ صرفهٔ شما (یعنی مو
شما) در ناکامیِ من ست (جسکے سبب سے شکوہ کرنے کی فرصت نہیں ہے) ورنه اگر تاب و توان
داشتمے آں قدر با شما درآویختمے که شما را دامن و گریباں بزیاں رفتے، و مرا سر و رو شکستے۔
آخر از خدا بترسید، و از روے داد بسنجید که کارِ من و شما بداں رسد که روز ها بگذرد و نامه
یاد نه گردم ۔ گفتم (یعنی میں اوپر کہہ چکا ہوں) که در بندِ گزارشِ اندوہے تازه ام شکوه کجا
بخاطرِ ناشاد مے رسد ۔ اگرچه اندریں ورق گنجائیِ ایں دو سطر نبود لیکن اندیشه براں
بسنجید که مبادا دوستِ او انشناسِ من مرا از خود خورسند داند، و بدیں گماں از تلافی فارغ
باشد و من زیاں زده جاوید و گسسته امید باشم۔

بالجمله دریں نامه نگاری مدعاے اصلی بدیں رنگ ست که برادر صاحب مشفق
نواب امین الدین احمد خاں بہادر ابنِ فخر الدوله دلاور الملک نواب احمد بخش خاں
بہادر رستم جنگ را ہماں موجِ بلا که زورقم شکسته بود (یعنی تعدی رئیس فیروزپور) خانه
بسیلابِ فنا داد ۔ خونِ وفایم بگردن که دریں سفر از ہمراہیش باز ماندم ۔ واماندگی و
بیچارگیِ من از ینجا تواں سنجید که دنداں بر جگر نہم، و امین الدین احمد خاں را در سفر تنہا
گذارم ۔ اگر قاضیِ محبت بدیں جرم بر نطعم نشاند، و بہ تیغِ بے دریغ خونم ریزد، سزاوارم ۔
و لطف دریں ست که ہر چند در پنجاب بگفتار گرایم، و ہنگامهٔ پرورش آرایم، شرمساری
بیشتر گردد، و خجلت افزاید ۔ مگر سراج الدین احمد بتلافی برخیزد تا از گرانیِ تشویر (شرمندگی)
سبکدوش گردم، و گرنه خجلت از چہره برافشانم ۔ یعنی کمر بہ غمخواری و بہ ہمه رو نوازی استوار

چہار سال می گذرد کہ مقدمۂ من با جلاسِ کونسل در پیش ست، و دلم از تفرقۂ بیم و امید ریش حکمے کہ قطعِ خصومت تواند کرد بنیامدہ، و ہنگام بہ پایان رسیدنِ تیرہ شبانِ امیدی در نیامدہ۔ حالیا بر آں سرم کہ چوں جزوِ اعظمِ کونسل اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈس بنٹنگ بہادر بدیں دیار در آید بدامنش در آویزم، و داد خواہم، و استدعائے صدورِ حکمِ اخیر کنم۔ گروہے بر آنند کہ نواب عالی جناب بدہلی نخواہد آمد، و ہم ازاں رہگذر ہا با جمیر خواہد رفت۔ اگر ہمچنیں ست بدا من و روزگارِ من، و آوخ از دوریِ راہ و درازیِ کارِ من۔

خواستہ اید کہ نتائجِ طبعِ والائے شما بنگرم و از تراویدہ ہائے کام و زبانِ خود شما را معانی فرستم۔ فرصت آں کجا؟ و دماغِ ایں کو؟ آمد آمدِ نواب گورنر، و دریوزۂ اختیار از ہر در، و ترتیب افرادِ مقدمہ، و تمہیدِ نگارشِ حال، و سنجیدنِ اندیشہ ہائے رنگا رنگ، و سگالیدنِ اندازۂ بیاں۔ آں مایہ دستیاری و غمخواری از کسے چشم ندارم کہ چوں ورقے انشا کردہ باشم نقل آں تواند برداشت؛ یا چوں دفترے از بہر نگریستن پریشاں کنم آں اوراقِ پراگندہ را فراہم تواند کرد۔ بہر رنگ چند روز دگر معاف دارید، و تا زمانیکہ بمن پیوندید گاہ گاہ بہ نامہ زنگ زدائے آئینہ و داد باشید + + + +

مولوی سراج الدین احمد لکھنوی جو کلکتے میں کسی عمدہ خدمت پر ممتاز ہیں اور مرزا کے نہایت سچے اور گاڑھے دوست ہیں اُنکو نواب امین الدین احمد خاں مرحوم کے باب میں جبکہ وہ رئیسِ فیروزپور جھرکہ کے خلاف اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے کلکتے گئے ہیں۔ اِس طرح لکھتے ہیں "مخدومِ غالب! اگر نہ اندوہِ سترگ بند بر دلم نہادہ بودے من

و دیدهٔ جاں را توتیا آورد، و تارکِ اقبال را افسر و پیکر آرزو را زیور بخشید؛ لیکن از انجا که آں قدسی مفاوضه از شعر و غزل چوں نامهٔ اعمالِ زاہد از ذکر مَے و شاہد ساده بود؛ دل نوازندۂ بداں نیاسود، و خمارم بداں نکید و جرعهٔ صہبا نشکست گفتم نَے نَے نَے! نه فرودهٔ دیدارے که دل نشاط آں تواں بستن، و نه کرشمهٔ غزلے که لب بزمزمهٔ آں تواں کشودن. + + + + + + + + + امید که ازیں بعد نه ورزند دیر بانشاے غزل شادم فرمایند، و نوید روبکوتاہی نهادنِ روزِ فراق که اندریں موسم که خسروِ انجم به † اسد جاے دارد عجب نیست - بفرستند. دولت و اقبال روز افزوں باد.

جوابِ نامهٔ شیخ امیر اللہ سرور تخلص " رسیدنِ دلنواز نامه دل را تنومند و شاخِ آرزو را برومند ساخت. گله از نارسیدنِ پاسخ نامه ہاے خویش مے کنید، و از خدا شرم ندارید. من خود از جانبِ شما نگرانی داشتم که کجائید؟ و چه در سر دارید؟ بارے پرده از روے کارِ شما برگرفتم؛ و دانستم که یک چند مرا فراموش کرده بودید، ناگاه ورودِ جناب مولانا تراب علی بداں بقعه افتاد، شنیدید که فلانی (یعنی غالب) از سخت جانی ہنوز زنده است؛ مهرِ کہن بجنبید، خواستید که بنامه یاد آورید؛ از فراموشیِ روزگارِ گذشته اندیشه کردید، لاجرم دروغے چند برہم بافتید، و آں را دیباچۂ نامه ساختید. از حالِ من پرسیده اید چه گویم که گفتن نیرزد، چنانکه گفته ام:

شکسته دل تر ازاں ساغرِ بلورینم   که در میانهٔ خارا کنی زد و در رہا

خیره سرے و آشفته راے، نه زباں سخن سراے، و نه دل از سراسیمگی برجاے.

---

† یه خط مرزا نے اس وقت لکھا ہے جب آفتاب برج اسد میں تھا چونکہ اسد مرزا کا تخلص اور انکے نام کا جزو ہے اس لئے آفتاب کے برج اسد میں ہونے سے یہ شگون لیا ہے کہ ایسے وقت میں آپ کا مجھسے ملنا کچھ دور نہیں ہے ۱۲

از بندگانِ خویش بگرداند، و تابِ بے بصراں را دیدہ و دیدہ وراں را سُرمہ بدست افتد۔ کرشمۂ نیروے جبرئیلؑ و معجزۂ آسودگیِ خلیلؑ را در نظرہا تازہ کرد + + + اگر دانستمے کہ بیش خجلت و شرمساری نخواہم کشید، و مرا اندریں محال طلبی بر من زبانِ طعنہ دراز نخواہد شد۔ ازاں مخدوم بے عنایت پاسخ ایں نامہ و تفصیلِ ایں ہنگامہ درخواستمے و پرسیدمے کہ دراں ہنگام کہ آتش زبانہ زد، و نگہ بسراغ تیرگیِ دودے و تابشِ نمودے فرا رسید۔ شما چہ می کردید؟ و نورِ چشم مردمی و فرزانگی مولوی عبدالحق کجا بود؟ و پس ازانکہ رستخیز در ہمسایہ آشکار شد، و ہنگامہ در انجمن افتاد۔ سراسیمگیِ درونیِ پرستاراں و بیتابیِ برونیِ ہواداراں چہ قیامت آورد؟ و اینہمہ آشوب چہ پایہ دیر کشید؟ و فرجام کار۔ کہ مژدۂ ایمنی دادند۔ بر کارخانۂ دواب و بنگہ و بارِ کہاراں (یعنی اسباب ایشاں) کہ اینہا را جز باطرافِ کاشانہ محل نیست، و بیشتر ازینہا طعمۂ آتش بلکہ افروزینہ (ایندھن) آتش ست۔ چہ گذشت؟ لیکن۔ چوں ارزشِ التفات از من سلب کردہ، و مرا اینک در دل فرود آوردہ اند کہ حالیا دراں گوشۂ خاطرم جاے نماندہ۔ ہرچہ گفتہ ام بطریقِ آرزوست نہ بسبیلِ سوال۔ والسلام

نواب مصطفٰی خاں مرحوم کے خط کا جواب جس میں شوقِ ملاقات اور غزلِ تازہ کی خواہش ظاہر کی ہے اُسکے اوّل اور آخر کے فقرے یہ ہیں، دو سحرگاہے کہ دلم از دردِ شانہ۔ چنانکہ مومنٌ مہر پیشہ از رنجِ ہمسایہ دل آزار باشد۔ بیقرار بود، ودستم از آسیمہِ بیتابیِ دل رعشہ دار، فرخندہ سروشے از در درآمد، و سپردنِ بہار سامان نامہ گل بہ جیبِ تمنا ریخت۔ ہرچند نامہ سپار مسِ امید را کیمیا

ٌ دل کو مومن سے اور شانہ کو ہمسایے سے تشبیہ دی ہے ۱۲

چشم و دلم جاے باشد، و چوں نامہ من نرسد یہ آرزو دارزو. گردِ سرِ ایں نوازش گردم، و برِ ایں پرسش جاں برافشانم. + + + + + + + + +

مولانا فضل حق مرحوم کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعۂ خط موسومہ لالہ ہیرالال کے معلوم ہوئی ہے اُس پر مولانا ممدوح کو اس طرح لکھتے ہیں۔

"قبلہ و کعبہ! اگر نہ ایں بودے کہ لالہ ہیرالال را ہواے دیدنِ عنقا در سر، و ناگاہ شامگاہے بہ نشیمنِ تنہائیِ من گذر، افتادے۔ آہ در گرفتنِ آتش گرداگردِ والا کاشانہ، و سوختنِ خانہ و رختِ ہمسایگاں از ہر کرانہ، و نرسیدنِ آسیبے بلازماں دراں میانہ، از کجا شنودمے! واگر نہ شنودمے ہر آئینہ ہم حقِ دوستانہ پرسش۔ کہ شیوۂ غمخواری و اندوہ ربائی ست۔ ناگزاردہ ماندے، وہم ایزدی نیایش کہ لازمۂ حق شناسی و سپاس گزاری ست تبقدیم نرسیدے۔ ہاں اے وفا دشمن! بیگانگاں (چوں لالہ ہیرالال) کامیابِ پیام و نامہ، و آشنایانِ جگر تشنۂ رشحۂ خامہ!!

واے بر من کہ رقیب از تو بمن بنماید نامۂ واشدہ مُہر بہ عنواں زدہ

"ہمانا آں سوزندہ آذر سرگرمیِ شوق از من فرا گرفتہ بود کہ بیتابانہ گردِ سر گردید، و اندراں اشتلم (شدت) زبانہ و شرارہ در خویشتن نگہداشت. ہیہات من کجا و ایں ہمہ دعویِ بلند از کجا!! خود نمایہاے گمانِ تاثیرِ مہر و وفاست کہ مرا بدیں رنگ ہرزہ لاے و یافہ سراے وارد، ورنہ آں را کہ از شعلۂ آہِ جگر سوختگاں دامن نسوزد، عجب نیست اگر آتشِ افروختہ پیرامن نسوزد. شکوہ پیشکش، و پیغارہ (طعنہ) برطرف؛ خداے توانا را شکر گویم کہ بلاے بی زینہار
برطرف

انصاف بالاے طاعت است۔ بدعوی گاہے کہ توانائی قبیل را بفرو ہیدگی فرہنگ (یعنی بہ پسندیدگی روش) مسلّم داشتہ، و لواے نور العین واقف بشیوائی شیوہ (یعنی بخوبی طرز) برافراشتہ باشند۔ باکہ باید گفت کہ نتایج طبع ما کجائی ست، و ما را چہ لذت دریں جگر خائی ست۔ سطرے چند کہ بدیباچگی دیوان ریختہ کسوت حرف و رقم پوشیدہ، و دود سوداے کہ بآرائش سفینہ موسوم بہ گل رعنا از سویدا جوشیدہ است ارمغان می فرستم و از شرم تنک مایگی آب میگردم۔ والسلام

شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا دوسرا دیوان میر موسی جان کے ہاتھ مرزا کو بھیجا ہے اسکی رسید اِس طرح لکھتے ہیں "دریں ہنگام۔ کہ فرماندگی از اندازہ گذشتہ و دل بافسردگی خوے گرفتہ است۔ ندانم چہ مے نگارم و چہ می نگرم کہ دریں نگرستن نگہ از ناز بدیدہ در نمی گنجد، و دریں نگارش خامہ از شادی در بنان (سر انگشت) مے رقصد بخت را برسائی ستایم و پندارم کہ بطورِ معنی رسیدہ ام۔ خود را بگرانمایگی آفریں گویم و انگارم کہ موسے را باید بیضا دیدہ ام۔ اگر مخدوم مرا بگرفتنِ عیار ایں دعوی حیرتے روے دہد، و ایں مایہ بالاخوانی و خودنمائی از من عجیب آید۔ گویم ہاں انصاف، سخن بہ کنایہ می سرایم نہ بگزاف۔ موسی اشارہ بہ سیدی مکرمی میر موسی جان است و ید بیضا عبارت از دیوانِ فروغانی عنوان۔

زہے دیوان کہ مدادش از دودۂ چراغ طور ست۔ و غلافش از دیباے حلۂ حور۔ قلزم معنی را سفینہ است، و جواہر مضموں را گنجینہ۔ + + + سبحان اللہ سخن بہ روزگار مخدوم بپایہ بلند رسید، و از دو را رونقِ دیگر پدید آمد۔ اینکہ نارسیدنِ نامۂ من بخاطر عاطر جاے گرفت، و شکوہ آں بزبانِ قلم رفت۔ مرا آبرو افزود، و ارزش مرا در نظرم جلوہ گر ساخت۔ خوشا من کہ دراں

حضرت آزردہ* اگرچہ دوست اند ہرچند نوگرفتہ ام ہرگز بہ مقام ترجیح ایں فن سزاوار شان فضیلت باشد لیکن اگر بہ تقاضائے فرط محبت بہ نسبت بجا نیست گناہے نبود، و دنالائی

آں بے چیز پیش نیازمندے افتادہ در

حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے مرزا سے جب کہ وہ کلکتہ میں مقیم تھے یہ خواہش کی تھی کہ آپ نے اپنی کچھ تحریریں نقل کی ہوں تو بھیج دیجیے اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

"دردمند نوازا! نسیم درد و شکیب رقم نامۂ تنگیچہ ایں نیاز را پردہ کشا بود، و شمیم ایں نوید را غالیہ سائے آمد کہ روزگارے ہرگز لختے بہ طول زمانِ فراق نقش ہستیِ بے اعتباری باسے تن از صفحۂ خاطر احباب نستردہ و ترکتازِ ستم بیداد و جدائی خاکسار پیاسے در از یادِ عزیزاں نبردہ است و ہرچند طلب نثر زدہ ماندہ ترازاں میزبان بے دستگاہ کم کناگرفت (اتیانک) بہاسے خونریزش از راہ دور دور در ..... و تیار بہ صبا گرد سر پاسے سرمایۂ خویشتن گرد و تا شور پاسے وجود پیشتے و زبان کشیدنے (یعنی زبانِ حیرت) فراز آوردن و ایمان من کہ باز آوردنِ نثر پراگندہ پیر اختہ و خود را دریں کتاکش ہمیدانستہ امر، چہ پیدا ست کہ فرو ریختۂ کلک ایں کس (یعنی من) نقشے ست شرمندہ (یعنی زشت) یا ہستے ست نرمہندہ (یعنی خوب) در صورتِ اول چہ لازم ست خود را بہیچ فروختن، و وبالِ نظارۂ آیندگاں بہ سلم خریدن؛ و در شقِ ثانی اندیشہ می سنجد کہ روزگاں چہ بردہ اند و گذشتگاں چہ یافتہ کہ ما را آرزو سے آں؛ دایہ (یعنی دریوزہ) بتیاب دارد۔

*اول مسودہ میں مفتی صدر الدین خاں مرحوم متخلص بہ آزردہ کا ذکر نہیں کیا گیا تھا مگر مرزا نے جب یہ خط لکھا تو انھوں نے ان کا بھی تذکرہ درج کر دیا۔

نرجام پذیرائی ایں ہمہ قبول کجا؟ روزگار را از آزارِ خویش چگونہ پشیمان گیرمے کہ اینچنیں
شاعری را بخود در پذیرمے۔ دوستاں را کجا قدر ناشناس پندارمے کہ از شما اینقدر ستایش
در بارۂ خویش باور دارمے۔ حقا کہ نہ آسان ست ستودہ شدن بزبانِ شیوا بیانان (یعنی
فصحا) و دشوار تر از انست اندازہ نمائی باندازہ داناں"

"قبلہ مرز چہل سالہ جگر کاوی انست کہ فراہم آوردم و بر فرقِ فرقداں سایہ افشاندم
(یعنی مجموعہ نظم فارسی) اکنوں آہم بداں روانی و آتشم بداں گرمی نیست۔ گوئی پس از تختنِ آں
گنج گنجیداں رفتہ ام و از سخن ہر چہ ازل آزردمن بود گفتہ شد + + + + + + + + + + + +

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے تذکرۂ گلشنِ بیخار کا مسودہ مرزا کے مطالعے کے
لئے بھیجا ہے اسکو دیکھکر مرزا نے نواب صاحب کو یہ خط لکھا ہے "من کہ زبانم در ستایش
بیقرار ست و اندیشہ در سگالش (مشورہ) گستاخ۔ امید کہ دراں پایہ بزمرۂ خوشامد گویاں شمردہ
نشوم و بدیں پایہ جرأت بزہ مند نگردم۔ بنامیزد (چشمِ بد دور) تذکرۂ ترتیب یافتہ و مجموعہ فراہم آمدہ
کہ پیشِ طاقِ بلند نامی را نقش و نگار ست، و نہالِ نکو سرانجامی را برگ و بار۔ رہرو نظر چوں
بہ بیدائے کنار ناپیدائے ذوقِ سخن گام تماشا بر دارد توشہ بہ ازیں بر کمر نتواند بست۔ خضر
باآں ہمہ جگر تشنگی کہ سکندر داشت لبش بر چشمۂ آب برتر نتوانست کرد، و آں آب از دریا بخشیدن
بود۔ شما گروہے را از دور و نزدیک بہ سخن زندگانی جاوید بخشیدید، و ایں لختے از عمر بکار دیگراں
کردن ست۔ جاوداں زندہ باشید کہ سخن گویاں از شما زندۂ جاوید شدند۔ و ہمگناں را بہ نکوئی
نام بر آمد۔ پارۂ گہر سفتنِ خامہ و گوہریں نہ گشتنِ نامہ در ردیفِ الف بہ نگارشِ اشعار پرویں نثار

تحریر در میاں نہ گنجد، و بمیانجی گری خامہ کار بر نیاید۔ آرے نگارش یکدست است و گفتار لخت لخت۔ ستردن یک لفظ از میانہ، و آوردن لفظ دیگر بجاے آن بر نشانہ۔ و ناشناسد کہ چہ مایہ گفتگو و چہ قدر پرس و جو دارد۔ و حقِ ایں پرسش نتواں گزارد۔ مگر بہمزبانی۔ دریں تر زبانی یکے از برادراں۔ کہ در برادراں از وے عزیز ترے نیست۔ سخن ہاے پراگندہ مرا کہ عبارت از نثر ست۔ گرد آوردہ، و صورت سفینہ دادہ است۔ زیں پس آں مجموعہ پریشانی را پیش پیشگاہ شما مے فرستم، تا دستمایۂ سگالش در سخن و یاد نمائندۂ اندازۂ نکوئی فن تواند بود + + + + +

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم نے۔ جب کہ مرزا سے نیا نیا تعارف ہوا ہے۔ مرزا کو خط لکھا ہے اور اسمیں اُنکی شاعری اور نکتہ سنجی کی بہت تعریف کی ہے؛ اپنے نتائج افکار میں سے کچھ اُنکو بھیجا ہے اور اُن سے تازہ غزلوں کی جو حال میں لکھی ہوں درخواست کی ہے۔ مرزا نے اُسکے جواب میں جو ایک طولانی خط لکھا ہے اُسمیں ایک لمبی تمہید کے بعد لکھتے ہیں۔

"تا دکانم در کشادہ بود، و رنگ رنگ متاعِ سخن بروے ہم نہادہ؛ کس از مشتریاں حلقہ بر در نزد، و سوداے خریداری از ہیچ دل سر بر نزد۔ چوں دکاں را کالا، و زباں را حرفہاے جگر آلا (یعنی آلودہ بخونِ جگر) نماند۔ روزگار گرانمایہ خریدارے (یعنی نواب مصطفےٰ خاں) پدید آورد کہ نقدِ رائجِ سخنِ خود را بہاے گفتارِ نا سرہ من می دہد، و گوہر را بہ پلۂ بیعانگی خزف می نہد۔ + + + ہاں و ہاں اے خریدارِ دکانِ بے رونق! از فراوانیِ مسرّتِ ورودِ مسعودِ ہمایوں نامہ چہ گویم کہ مرا۔ با آنکہ نکوئی خواہ خویشتنم۔ بر من بہ رشک آورد۔ حوصلہ مرا۔ کہ فرسودۂ غمہاے دہرم۔ گنجائی ایں مایہ شادی کو؟ و اندیشہ مرا۔ کہ دل شکستۂ دوریِ یارانم۔

وکوتاه دم باشم، و بزرگانِ وطن را بیاد نیارم؛ در عالمِ انصاف بزہ مند نیستم۔ آما گرانمایگانِ جہانِ مہر و وفا۔ کہ از دور افتادگاں نپرسند و از مرگ و حیاتِ دوستاں باز نجویند۔ اگر گفتگو بمیاں آید، و سمندِ شکوہ عناں برعناں (یعنی بمقابلہ یکدگر) تازد گوے دعوی چگونہ خواہند برد، و قطع نظر از حریفِ آب و نداں (یعنی حریفِ مغلوب) کہ منم۔ خداے توانا راچہ جواب خواہند داد"

"کس از اہلِ وطن غمخوارِ من نیست　　　　مرا در دہر پنداری وطن نیست"

مولوی نور الحسن نامے ایک نوجوان نے کلکتے سے مرزا کو خط لکھا ہے اور اُسکے ساتھ ایک نثر کا مسودہ اصلاح کے لئے بھیجا ہے۔ اُسکے جواب میں جو خط مرزا نے لکھا ہے اُسمیں لکھتے ہیں۔ "پدید آمد کہ خاطرِ عاطر را بجانبِ نثر گرایشے، و ہنگامۂ ایں گفتار (یعنی نثر نگاری) را در انجا (در کلکتہ) آرایشے ہست۔ بارے ہم دل بہ پسندیدہ شغلے نہادہ آید، و ہم اندریں فن گزیدہ روشے پیش گرفتہ آید۔ دم سردیِ شما (یعنی کم شوقیِ شما) بہ دانش آموزی۔ انچہ دیروز (یعنی در زمانۂ گذشتہ) بہ کلکتہ دیدہ ام۔ یاد میکنم؛ و خوں گرمیِ شما (یعنی سرگرمیِ شما) در خرد اندوزی۔ انچہ امروز نگرم خود را بدیں شادی کنم؛ ہمانا در اندیشہ تماشائے برگذر دارم بداں زودی۔ کہ ثمر از شاخ افتد۔ نخلے شدہ، و رطب بار آوردہ؛ و نے نے ہنگامہ یوسفے در نظر دارم بداں خوبی کہ دل از فرشتہ برباید۔ از بندِ حجاب بدر آمدہ، و بہر ہفت کردہ۔ خواستہ آید کہ مسودۂ نثر در ہر ماہ بمن فرستید، و من آں را نگرستہ، و نشستِ ہر کرشمہ و انگیزِ ہر بذلہ را بایستگی آراستہ بشما فرستم۔ صاحبِ من! اگر ندانستہ اید کہ گفتار جز بگفتار سرہ نگردد، و سخن جز بہ سخن شناختہ نشود، ہر چند ارادتِ شما ذریعہ سعادتِ من و فرسندیِ شما موجبِ رضامندیِ من ست لیکن

کہ دُردِ بادۂ غفلتے بہ قدح داشتم (یعنی تقیۂ ہوا وہوس در سر بود) لختے از عمر بہ پیمودنِ جادۂ کامرانی ہوس گذشت، وبے راہہ خرامیدہ شد تا سر از مستی بگردید (یعنی بدمستی سے سر پھر گیا)، و اندراں بیخودی پائے مصطبہ بپایہ گوئے فرو رفت (گڑھے میں اتر گیا یعنی ایک ایسا صدمہ پہنچا کہ نشے ہرن ہو گئے) لاجرم درہم شکستہ سراپائے، وگردانندہ سر درد سے برخاستم۔ ہنگامۂ دیوانگی برادریک طرف، وغوغائے وام خواہاں یکسو۔ آشوبے پدید آمد کہ نفس راہِ لب، ونگاہ روزنۂ چشم، فراموش کرد، وگیتی بدیں روشنی روشناں در نظر تیرہ وتار شدہ بالبے از سخن دوختہ، وچشمے از خویش فرو بستہ۔ جہاں جہاں شکستگی، وعالم عالم خستگی، با خود گرفتم۔ واز بیدادِ روزگار نالاں، وسینہ بردمِ تیغ مالاں، بکلکتہ رسیدم۔ فرمانرواں سرتر بکی وکوچک دلی (یعنی مہربانی وشفقت) کردند، ودل را نیرو بخشیدند۔ آں ہمہ بخشایش۔ کہ مشاہدہ رفت۔ امیدِ کشایش آورد، وذوقِ آوارگی وہوائے بیاباں مرگی۔ کہ مرا از دہلی بدر آوردہ بود۔ بدل نماند۔ وہوسِ آتشکدہ ہائے یزد ومیخانہ ہائے شیراز۔ کہ دل را بسوئے خود کشیدے مرا بہ پارس می خواند۔ از ضمیر بدر جَست۔ (یعنی بمشاہدۂ شہر کلکتہ جملہ ہوسہا از خاطر بدر رفت) دو سال دراں بقعۂ نجا دربودم، چوں گورنر جنرل آہنگِ ہندوستان کرد پیشا پیش دویدم، وبدہلی رسیدم۔ روزگار برگشت، وکارِ ساختہ شدہ۔ صورتِ تباہی گرفت۔ اکنوں ششمیں سال ست کہ خانماں بباد دادہ، ودل بہ مرگِ ناگاہ نہادہ، بکنجے نشستہ ام، ودرِ آمیزش بروے بیگانہ وآشنا بستہ،،

"من اگر با ایںہمہ رنج واندوہ۔ کہ پارۂ ازاں باز گفتم۔ درنگارشِ نامہ وسپارشِ پیام کاہل قلم

سخن را از فراوانی بروے ہم افتادن ست، وگرہ در گرہ گردیدن۔ ومن آں می خواہم کہ اندک گویم، وسود بسیار دہد، وشنوندہ آں را زود دریابد۔ وایں بسیچ (قصد) روائی پذیر نیست مگر آنکہ گویندہ وراں کوشد کہ نبشتن از گفتن آں مایہ دور تر رود کہ سر ایں ہر دو رشتہ باہم گرہ نتواں یافت، ونقش یکے در آئینہ دیگرے نتواں یافت۔ زمانے گوش بمن دارید و فرا رسید کہ چہ می گویم، وازیں گفتن چہ می خواہم، وشما را دربرابر آں چہ می باید کرد، واندازہ آں بایست تا کجا ست،، اسکے بعد کچھ خانگی معاملات تحریر کیئے ہیں۔

میر اعظم علی اکبرآبادی مدرس مدرسۂ اکبرآباد جو میرزا کے ہموطن ہیں اور اُنھوں نے بیس برس کے بعد مرزا کو خط لکھا ہے اور خط نہ پہونچنے کی شکایت کی ہے اُنکے خط کا جواب اس طرح لکھتے ہیں۔

امروز شرارۂ بداغ ہم زدہ اند ۔۔۔ نشتر برگ صبر و فراغم زدہ اند

از کثرت شورِ عطسہ مغزم ریش ست ۔۔۔ تا عطرِ چہ فتنہ بردماغم زدہ اند

جنبشِ خامۂ عیسوی ہنگامۂ مطاعِ مکرمِ مخدوم اعظم را نازم کہ بہ احیاے ہوسہاے مردہ ساحتِ خاطر را عرصۂ محشر ساخت، وبازار رستخیز گرم کرد۔ خار خارِ دیریں آرزوہا سراز دل بدر آورد، بیاد آمد کہ مرا ہم در گیتی وطنے، واز مہربانان انجمنے بودہ است۔ چوں نشتر پرسش بمغز اندیشہ فرو بردہ اند (یعنی احوال پرسیدہ اند) خونچکانی نواہا تماشا کردنی ست۔ درازیِ زمانِ فراق۔ کہ بگمانِ مخدوم شانزدہ سال ست وبدانست نامہ نگار کم از بست سال نیست سترنگر ننگے بودہ است کہ نقشِ آسایش از صفحۂ خاطرہا ستردہ اند۔ آغاز ورود بہ دہلی

انتخاب از مکاتبات

مرزا کی نثر فارسی کا سب سے بڑا حصہ اُنکے مکاتبات و مراسلات ہیں جنمیں سے اکثر بہت صاف اور سلیس ہیں اسی لئے ہم اِس حصے میں سے بہ نسبت اور نثروں کے کسی قدر زیادہ انتخاب کرینگے اور جہاں تک ہو سکیگا مشکل فقروں اور دقیق عبارتوں کے نقل کرنے سے احتراز کیا جائیگا۔ اور نیز جو امور مرزا کے خانگی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں اُنکو بھی چھوڑ دیا جائیگا۔

مرزا علی بخش خاں فیروز پور جھرکے میں ہیں؛ نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہوگیا ہے اور اُنکی جگہہ شمس الدین خاں مسند نشین ہوئے ہیں۔ مرزا نے علی بخش خاں کو کلکتے پہنچکر خط لکھا ہے اُسمیں لکھتے ہیں۔

"میر فضل مولے خاں نام یارے داشتم؛ او را ناگرفتہ (ناگاہ) در عرض راہ بہ مرشد آباد دیدم؛ در نوردِ گفتگوہاے ویرس وجوہاے کہ رفت - از جامہ گذاشتنِ (یعنی از مردن) فخر الدولہ بہادر بمن خبر داد؛ و باز بہ کلکتہ مرزا افضل بیگ و دیگراں بر گفتند۔ آوخ! کہ چراغِ روشنِ ایں دودمان مُرد، و شبستانِ آرزوہا تیرہ و تار شد۔ از جانبِ شما اندیشناکم؛ و دانم کہ آنچہ شمارا پیش آید دلخواہ نباشد۔ ناکساں را روزبازار خواہد بود؛ و فرومایگاں راگرمی ہنگامہ۔ زود اکہ انجمن از ہم پاشید؛ و پراگندہ چند گرد آیند۔ دولت روے گرداند؛ و آسودگی برخیزد۔ زینہار ہوشمندی را کار باید بست؛ و ہموارہ بخود نگراں باید بود"

ایک اور خط کو جو علی بخش خاں کے نام لکھا ہے اِسطرح شروع کرتے ہیں "جانِ برادر!

داد کہ بہ دمیدن پردہ شکیب نظارگیاں نہ درد.

آں اثر پردۂ سازت چہ شد — زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد

آں زجنوں پردہ کشائیت کو — ولولہ سلسلہ خائیت کو

آں نفسِ نالہ کمندت کجاست — واں نگہ جلوہ پسندت کجاست

گفتی (یعنی درجواب گفتۂ) کہ سوزِ غم دود از دل برآورد، وگدازِ نفس آذر در زباں زد.
بادلے کہ ہر آئینہ نگداخت، وبازبانے کہ ہمانا فسوخت، عذرِ غمزدگی مسموع نیست. بیا تا ہیں
دل بہ زہرۂ الحذر نوائے را سخن نہیم؛ وہمیں زبانِ کز نغمہ ایں المفر سرائے را گفتار آریم
(یعنی طوعاً وکرہاً تقریظ دیوانِ تفتہ برنگاریم)

زمن جوئے ور بدنکوزیستن — جگر خوردن وتازہ رو زیستن

سمن چیدن ودررہ انداختن — دل افشردن ودرچہ انداختن

(مراد از سمن چیدن ودررہ انداختن آنکہ برہمگناں اظہارِ خوشحالی می کنم واندوہ درونی را
کہ دل افشردن عبارت ازاں ست درچاہ می اندازم تا بر ہیچکس ظاہر نشود)

رواں کردن از چشم ہموارہ خوں — بہ شورابہ شستن زرخسارہ خوں

شگفتن زداغے کہ بر دل بود — نہفتن شرارے کہ در دل بود

ستایشِ سخن چشم بد دور. خمکدۂ سخن را شرابے ست پر زور کہ زمیں ازاں بہ لائے
(یعنی بدروے) وسپہر ازاں بہ بوئے آنچناں برقص آید کہ اگر کعبہ را حجر الاسود از دیوار ومشتری
را عمامہ از فرق فرو افتد شگفت نماید.

دل وزباں خوں شد، واگرتا گہ از دل بزباں رسید - والا ایچی ہمت آں رانجامہ نسپرد، ہرچند منش (طبیعت) کہ یزدانی سروش ست در سر آغاز تیز گزیدہ گو سے دلپسندیدہ جو سے بود - اما پیشتر از فراخ روی (یعنی بسبب آزادہ روی) پسے جادہ شناساں برداشتے، وکثرئی رفتار آناں را لغزش مستانہ انگاشتے تا ہمدراں تکاپو پیش خراماں رانجستگی ارزش ہمقدمی (یعنی لیاقت ہمراہی خویش) کہ ورمن یافتند - مہر بجنبید، ودل از آزرم (مروت) بہ درد آمد، اندوہ آوارگیہاے من خوردند، وآموزگارانہ درمن نگرستند شیخ علی حزیں بخندہ زیرلبی بیراہہ رویہاے مرا در نظرم جلوہ گر ساختند، وزہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبش ہاے نارواد رپاے رہپاے من بسوختند، ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس (تاثیر کلام) حرزے بازو وتوشۂ کمر بست، ونظیری لا اُبالی خرام بہنجار خاصۂ خودم بجالش (رفتار) آورد"

دیوانِ تفتہ کے دیباچے کی تمہید میں ضعف و انحطاطِ قوی اور اپنے قلب ماہیت کو اسطرح بیان کرتے ہیں - "ہاں اے غالبِ تیرہ روزِ زم اختر اکہ بدیں ہستی وکسائی زخجستگی کہ تراست - بداں مانی کہ دانی در عالم فرضِ محال سپندے دیدہ ایم بر آتش آرمیدہ، اللہ اللہ چہ مایہ جوشِ سودا است (یعنی غلبۂ مادۂ سودا) کہ ہر نفسے کہ مے کشی - چوں خطے کہ از نقطہ برآورند ہمرنگِ سویدا است، آں قلم و اندیشہ - کہ از روانی خامہ وروانی گفتار آب وہوا داشت نا دیے تہش را فروردین بہ پرستاری بود، وچاشتگہش را نسیم سحری پیشکار - بدیں ناخوشی در زندگی بر ایں چہ راست، سبزہ راچہ افتاد کہ بہ چمیدن دل از دستِ تماشائیاں نبرد، وغنچہ راچہ روے

اہلِ جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمرِ سبک سیر بختے بہ جامۂ وخینگ سرآمد، وپارۂ بدر وغ ودریغ رفت، فرجامِ گران خوابی بر نجاست ہا، وآشوب ہوسناکی فرو نشست۔

خاتمۂ دیوانِ فارسی میں اس بات کا عذر - کہ دیوان کی تکمیل میں کیوں اس قدر دیر لگی کہ اکتالیسؔ برس کی عمر میں اُسکے چھپوانے کی نوبت پہونچی - اِس طرح کرتے ہیں کہ فکر نہایت خود سر اور بلند پرواز تھی اُسکی رُوک تھام میں بہت سا زمانہ گذر گیا - اور اِس مطلب کو اپنے طرزِ خاص میں یوں ادا کرتے ہیں۔

"ہاں وہاں رخشے بداں توسنی کہ عنانش موے ومشامش بوسے برتافتے، واز شموسی (سرکشی) گام بدرازی نہادہ جز بہ بہانہ شتافتے۔ از ترسندہ دلی عنانش کشیدہ، وبہ لابۂ آوازِ بوسہ اش آرمیدہ داشتمے۔ چوں پارۂ از راہ بدیں گونہ - کہ برشمر دم - بریدہ شد، ور وزبلند گشت، ہم جوشِ تندیِ توسن فرو نشست، وہم دست وپاے سوار از عنان ورکاب خستگی پذیرآمد۔ تابِ مہر نیمروزہ مغز در سرِ سوار گداخت، وتفتگیِ ریگ بیاباں نعل درپاے تگا ور نرم کرد۔ رانیض را دم وگرنہ را قدم بگداز آمدہ ہم آں بہ آخر گرائید، وہم ایں را بہ بستر نیاز آمد۔ توانائی بہ چارہ سگالیِ توسنی سرآمد، ودر ہنگام گستہ دمی خستگی روے آور د + + + + + + + کیست تا از من بپرسد؟ واگر نا پرسیدہ گویم دردلش فرود آید، کہ دریں سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزش ہا (یعنی جنگ ہا) روے دادہ، وپس از آنکہ - کاربداں جار سیدہ کہ ہمہ گراز کوفتگی فرو مانند - بیابانچی گری توفیق یکدام قرار وآشتی اتفاق افتادہ۔ خامہ دیر جنبش بود، وشوق زود گراے، (جلد باز) گفتار ہا از نہیبِ دُور باشِ اندیشہ بدرازناے فاصلۂ

قلم دیوان فارسی

تا شد، مہر جلوہ برتابد، و ذرہ بیتابی، و بحر روانی، و قطرہ آشتلم، دل را کہ گفتہ است کہ از شورش ستودہ آید، ہمانا بدانست این گروہ بادہ در خمخانۂ توفیق ہمان قدر بود کہ حریفانِ گذشتہ را تر دماغ ساختہ، حالیا بساطِ بزمِ سخن برچیدہ، و جام و سبو بر سرِ ہم شکستہ، و از آن قلزم قلزم راوقِ مے برجاے نماندہ، پندارند کاش باجمنے - کہ من در فردوس بردہ (یعنی صفِ پائیں) بہ حلقۂ اوباشِ قدح می گیرم - فرارسند تا دارسند کہ مے فراوانست، و ساقی بے دریغ بخش، و پیمانہ جرعہ ریز ست، ولہا التطش گوے۔ و للہ در من قال:

ہنوز آں ابرِ رحمت در فشان ست || خم و میخانہ با مہر و نشان ست

آرے صہباے سخن بہ روزگارِ من از کہنگی تند و پر زور ست، و شبِ اندیشہ را بہ فرّ دمیدنِ سپیدۂ سحری براتِ فراوانیِ نور ست۔ ہر آئنہ رندگاں سرخوش غنودہ اند، و من خراستم، پیشینیاں چراغاں بودہ اند، و من آفتابستم۔

اسکے بعد ایک جگہ اپنے تمام فخر و مباہات پر افسوس کرکے اس طرح لکھتے ہیں "دو انصاف بالاے طاعت ست - در ہوائے کہ بالِ بالاخوانی (یعنی خودستائی) زدہ ام، و در آوائے کہ خود را بہ شگرفی ستودہ ام، ہمہ از آں شاہد بازی ست، یعنی ہوا پرستی۔ و ہمہ دیگر توانگر ستائی، یعنی باژخوانی۔ بیداد بیں کہ ہر جا شانہ سخنے از زلفِ مرغولہ مویاں کشودہ شود - بلا در دلم ریزند، تا دل بہ بیچاکِ آں شکن بندے۔ و خواری نگر کہ ہرگاہ از خود غافل و از خدا فارغے بر اورنگِ سروری کج نشیند - ہوس مرا برانگیزد تا بہ پیشش بندہ وار راست ایستمے۔ شادم از آزادی کہ بسا سخن بہنجارِ عشق بازاں گزاردستم، و داغم از آزمندی کہ درستے چند بکردارِ دنیا طلباں در مدح

ہر ہفت کردہ معنی بجنبشِ نسیم بر افتادہ، یعنی تنگ کشاکشِ دست ناکشیدہ۔ باز بپیش چہرۂ عجیبت

از گرمیِ چراغانِ بیم سوختہ پہلو رخ با فروختن دادہ، یعنی داغ منتِ خس نادیدہ۔

ایک جگہ اس مطلب کو - کہ خدا تعالیٰ نے مجھے جیسا دماغ معنی خیز دیا تھا ویسا ہی معنی کی قدر و قیمت پہچاننے اور اسکے بیان کرنے کا ملکہ بھی عنایت کیا - اس طرح بیان کرتے ہیں

"سخن آفریں خداے گیتی آراے راستایم کہ تا نہانخانۂ ضمیرم را از فراوانیِ زنگار رنگ معنی پر لعل و گہر انباشت، بازویم را ترازوی مرجان سنجی و خامہ ام را ہنگامۂ گہرپاشی ارزانی داشت۔

اب ہم کچھ کچھ عبارتیں دیباچوں اور تقریظوں سے انتخاب کرکے ہدیۂ ناظرین باتمکین کرتے ہیں

دیوانِ فارسی کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو - کہ لوگ مجھے اکتسابی علوم سے بے بہرہ سمجھکر میرے حسنِ بیان پر تعجب اور میرے کمال سے انکار کرتے ہیں - اسطرح بیان کرتے ہیں "لاے خُم میخانۂ سرمدی نسبت ناچشیدگاں - سگالند کہ ہیچمدانے را این مایہ سیرابیِ نطق از کجا ست، غافل کہ ہم رشحۂ یک شبنم ست کہ سبزہ را دمیدن، و نہال را سر کشیدن، و میوہ را رسیدن، و لب را زمزمۂ آفریدن آموختست، و بہ پرتوِ مہتابِ ازلی ہدایت دستگیر نگردگان اندیشند کہ تیرہ سرانجامے را این ہمہ روشنائیِ گفتار چرا ست، بے خبر کہ فرۂ تابشِ یک نور ست کہ شمع را بہ شعلہ، و قدح را بہ بادہ، و گل را بہ رنگ، و درون را بسخن بر افروختست + + + +

و اعجم از کوتہ نظرانِ تنگ چشم کہ دمیدنِ تازہ گل از گیاہ، و درخشیدنِ برق بشبہاے سیاہ شگفت ندارند، و جنبیدنِ زبانہاے گویا بہ سخن ہاے نغز و شخوار انگارند، و غنچۂ شکیں نفس ست، و باد و غالیہ ساے، و گل کشادہ روے، و بلبل نواسنج، بزباں چہ گنہ کردہ است کہ سخن سراے

دیباچہ دیوان فارسی

واکیا ہے اس لئے جب تک کہ انکے ایک ایک فقرے کی شرح نہ کی جائے عام ناظرین اُن سے کچھ لذت نہیں اٹھا سکتے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا حجم زیادہ بڑھ جائیگا جسکی وجہ سے کتاب کا مطالعہ ناظرین پر شاق گذریگا لہذا اُن نثروں میں سے صرف اس قدر انتخاب کیا جائیگا جس سے مرزا کی ان جزئیل اور گرانمایہ نثروں کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔

اس غرض کے لئے ہم اول بطور مثال کے مختلف مقامات سے مختلف مضامین کے کچھ فقرے نقل کر دکھاتے ہیں کہ مرزا کس طرح معمولی باتوں کو تمثیل اور استعارے کا لباس پہنا کر بلند منظر پر جلوہ گر کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب پنج آہنگ کا دوسرا آہنگ۔ جو مرزا نے اپنے نسبتی بھائی علی بخش خاں کی خاطر سے لکھا ہے اور جسمیں اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف زبان فارسی کے متعلق کچھ ابتدائی قواعد اور ہدایتیں قلمبند کی ہیں۔ اسکے اول میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں طرح طرح سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس پھیکے سیٹھے مضمون پر کچھ لکھنا میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔

وہاں ایک جگہ مضمون مذکور کی نسبت لکھتے ہیں۔ " پیشۂ شور کہ چون ذوق سے در شکفت زاید ہیچ نکہین رادر نیابد بیشہ در خاک تر فرو رو۔ و نیسکہ نا استوار کہ ہر دیوار کہ دران ریگستان بر کشند پیش از سایۂ خود بخاک افتد۔"

فارسی دیوان کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو۔ کہ دیوان مذکور اور اُسکے نوادر افکار میں آورد اور تتبع یا کسی اُستاد کی بلا واسطہ تعلیم اور ہدایت کو مطلق دخل نہیں ہے اس طرح ادا کرتے ہیں " دو بامیر دیعنی چشم بد دور) نخستین نقابے ست از روے شاہد

نازم بخرامِ کلکِ طرز رقمش ۔ ناماست ز تیزی بدم تیغ دوش
چون اسمِ کتاب قاطعِ برہان بود ۔ گردید درفشِ کاویانی علمش

حاشا کہ در ہیچ محل از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم۔ سرودنِ سخنہاے ریزہ (متفرقہ) جز افزودنِ ہمہش انگیزہ (سبب و باعث) ندارد۔ یاران جفا کنند، ومن بہ ازاے ہر جفا (بعوضِ ہر جفا) وفا ورزم۔ ہمانا نکوئی وبہی یاران خواہم وبس۔ بند نہند، پند دہم۔ واد دریغ دارند، ما اندر زدریغ ندارم۔ سنگ زنند، ثمر بارم۔

از تقریظات و دیباچہ ہاے

مرزا نے جو تقریظیں اور دیباچے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں پر نثر میں لکھے ہیں اُن میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا شاعری کا عنصر نظم سے بمراتب غالب تر پایا جاتا ہے۔ وہ ہر ایک معمولی بات کو تمثیل اور استعارے کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں، فقروں اور اُنکے اجزا میں عموماً ایک خاص قسم کا وزن اور قول اور اکثر سجع کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں، اکثر جگہ صفات متوالیہ ومتشابہہ ایراد کرتے ہیں اور صفات مرکبہ جو نظم کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اکثر استعمال کرتے ہیں۔ پس سوا اِسکے کہ یہ نثریں شعر کے اوزانِ مخصوص سے جنکو اُسکی ماہیت میں کچھ دخل نہیں۔ معرا ہیں، ہر ایک اعتبار سے اُنپر شعر کی پوری پوری تعریف صادق آتی ہے۔ چونکہ یہ نثریں مرزا نے خاصکر اپنے عالی دماغ اور نکتہ سنج معاصرین کی ضیافتِ طبع کے لیئے لکھی ہیں اور اُن میں اپنی نوآئین طرازی اور نادرہ سنجی کا۔ جیسا کہ چاہیے۔ حق

نگردد که از بس تیزی در جوہرِ لفظ فرو دروند تا چگونگیِ پیوندِ الفاظ که انگیزشگاہِ معنی ست آشکار
شود. ہرگاہ آں را اینجا راہِ اہلِ زبان نه بینند- دانند که در سودائے زباندانی جز زیان نه بینند.
دگراں دانند و کارِ آناں؛ مرا نیز خردے در روانے دادہ اند- فراز آوردہ و پیش آوردۂ اندیشۂ
بیگانگاں را چوں پذیرم؟ و از نیروے خردِ خداداد کار چرا نگیرم؟ ہستی بخش را سپاس که نیروے فرائے
دانشِ من دانشمند† کسے ست که اگر چنانکه رازداں بود- رازگوے نیز بودے ششمین* ساسان
بشمار آمدے.

ز خویشاں به بیگانگی شادمانم	نمانم بکس چوں بکس مے نمانم (در صورت ۱۲ / در سیرت ۱۲)
غریبم ولے روشناسِ عزیزاں	چنارِ سرافراز در بوستانم
گرفتم که از تخمۂ افراسیابم	گرفتم که از نسلِ سلجوقیانم
دل و دستِ تیغ آزمائی ندارم	رہ و رسمِ کشور کشائی ندانم
بمیدانِ معنی خداوندِ رخشم	بمضمارِ پہلو زبان- پہلوانم
دو سی سال توقیعِ معنی نوشتم	سزد گر نویسند صاحبقرانم

قاطعِ برہاں- که صنعتِ نقشبندِ خیالِ من ست، نه نامۂ اعمالِ من ست که دراں جہاں
بمن خواہند سپرد- ہمدریں جہاں خواہد ماند. در دل فرود آمد که بمقامے چند کلامے چند بفرازم،
و ایں مجموعه را- که قاطعِ برہاں نام نہادہ ام- پیشِ درفشِ کاویانی خطاب دہم.

† مراد ازاں مولانا عبدالصمد اُستادِ میرزاست ۱۲ * ساسان نام پسرِ بہمن بن اسفندیار بود که از پادشاہی بسیاحت و تحصیلِ حکمت و ریاضت پرداخته و کسے از اولادِ وے نیز بطریقۂ وے بودہ اند و ایں ہر چہار را ساسانِ اول و دوم و سوم و چہارم نامیدہ اند من بعد پس از خسرو پرویز ساسانِ پنجم بظہور آمدہ که دساتیر را از لغت ترند در زبانِ دری ترجمه کردہ ۱۲

توقیعِ سرنوشت ہا یکے ست؛ (یعنی یکسانست) جز اشناس (مابہ الامتیاز) اگر ہست جز این
نیست کہ کار و بارِ گروہے از ہر یک بر یک ورق، و سود و سازِ جرگہ (گروہے) از ہر کس بر یک
صفحہ نوشتہ اند۔ آناں ورق از دفتر با خویش آوردند و برات روزی از ہر در کہ مقدر بود بُردند
اینان - ازاں رو کہ انفکاکِ صفحہ از ورق صورت نہ بست - تہیدست آمدند، و تہی کیسہ زیستند؛
گفتم از چیست؟ کہ در چارہ سوئے دہر ع

بخت صلۂ مدح و قبولِ غزلم نیست

گفت آن از نیست کہ برات (چٹھی یا چک) نیاوردہ و این از انست کہ سخنہائے بلند داری
و بہ ناآشنا زبان (یعنی اجنبی زبان) حرف می زنی۔ گفتم چہ کنم تا از اندوہ باز رہم؟ گفت شکیب
ورز، و نحوں گری؛ و آنچہ از شیخ علی حزین شنیدہ ای گوئے

کس زبانِ مرا نمے فہمد ۔۔۔ بہ عزیزاں چہ التماس کنم

نشاں دادنِ اغلاطِ برہانِ قاطع سپاس می خواست نہ ستیز؛ در قلمروِ ہند کس نماندہ باشد کہ مرا
بدیں نیکی بد نخواندہ باشد۔ یکے خنجر آورد کہ من قاطعِ قاطعِ برہانم؛ دیگرے اخگر آورد کہ من محرقِ قاطعم*
کیست تا از من بداں جوانمرداں گوید کہ از دریدن و سوختنِ کاغذ جز نقصان و زیاں چہ خیزد؟
بندہ (گناہگار) منم؛ اگر در آتش فگنند ور بہ تیغ دو نیم زنند بہرہ و گزند در خورستم (یعنی لایق
ہستم) و بہرہ و سزا سزاوار +
سخندانِ راستی جوئے را بایستہ آں کہ از ہر کتابِ فرہنگ عبارتِ جامعِ آں را بداں نگاہِ تیز

* جو کتابیں قاطعِ برہان کے جواب میں لکھی گئی ہیں اُنھیں سے ایک کا نام قاطعِ قاطع اور ایک کا محرقِ قاطع رکھا گیا تھا ۱۲

اینک هزار لشکر نگری همه سبے لشکر آراسے آراسته، و بسا سپاه بینی کمیسره بے سپهدار بجنگ برخاسته. توپ و گلوله و ساچمه (چهرا) و بارود همه از خانهٔ انگریز آورده، و با گنجینه دار ا روسے بستیز آورده. آئین با نبرد و ورزش پیکار همه از انگریز آموخته، و زرخ بکین آموزگاران افروخته. دل سست سنگ و آهن نیست چرا نسوزد؟ چشم سست رخنه و روزن نیست چون نگرید؟ آرے هم بداغ مرگ فرماندهان باید سوخت، و هم بر ویرانی هندوستان باید گریست. شهرها سے بے شهریار پر از بنده هاسے بے خداوند، چنانکه باغ هاسے بے باغبان پر از درختان نابرومند، رهزن از گیرودار آزاد و بازارگان از تمغا، خانه ها ویرانه ها و کلبه ها (دوکانها) خوانِ یغما.

از دیباچهٔ ثانی درفشِ کاویانی

غالبِ خاکسار بیرزه کار زا از آسمان بزمیں فرستادند، و فرمان دادند که دریں پیشه کشاورزی (کاشتکاری) ورزد، و ایں فرزمان (فرمان) را بازمان (توقف) نه پسندد. ناگزیری بایست (ضروریها) که رستن ورزمیں خستن، گاو راندن و دانه افشاندن. ناداں (کشاورزی نکرد بلکه) بهوس ورزمیںِ غزل جاں کند، و ازاں گهرها که باخویش آورده بود نیمه دراں زمیں پراگنده همانا (گویا) از هر دانه که کاشت هزار دانه چشم داشت. از مرواریدے که در خاک نهاں کنند شنیده؟ که ریشه سر برزند. کاش جو کاشتے تا سود برداشتے. دانست که همه را خاک خورد؛ (یعنی تلف شد ناچار) نیمهٔ دیگر را پیشِ شاهانِ روزگار برد. دیدند و پسندیدند و نخریدند. شبے با یکے از رازداناں پژوهش (پرسش) رفت که در مبداِ فیاض بخل نیست؛ ابر بر باغ و راغ و سمن و دمن یکساں بارد، چرا است؟ که مردم چندے نادار واندے (چندے) توانگرند. گفت راست گفتی؛

نوبہار نشد. ہاے! آں حیا ندارانِ دادآموزِ دانش اندوزِ نکوخوے نکونام، وآہ ازاں خاتونانِ پری چہرۂ نازک اندام، یارُخی چوں ماہ وتنے چوں سیمِ خام؛ ودریغ آں کودکانِ جہاں نادیدہ۔ کہ در شگفتہ روئی برلالہ وگل می خندیدند، ودر خوشخرامی برکبک وتذرو، وآہو ے گرفتند۔ کہ ہمہ یک بار بگردابِ خوں فرو رفتند. اگر مرگ بربالینِ ایں کشتگاں بموبہ (بگریہ) خروشد، ودریں سوگ سیاہ پوشد، رواست؛ واگر سپہرِ خاک گردد وفرو ریزد، وزمیں سراسیمہ چوں گرد از جا برخیزد بجاست.

اے نوبہار چوں تنِ بسمل بخوں بغلط	اے روزگار چوں شبِ ماہ تار شو
اے آفتاب روے بہ سیلی کبود کن	اے ماہتاب داغِ دلِ روزگار شو

بارے چوں آں روزِ تیرہ بشام رسید، وگیتی تاریکتر گردید، سیہ درونانِ خیرہ کُش (بجنگی کشندہ) ہم در شہر جابجا رختِ تن آسانی انداختند، وہم در ارکِ باغِ خسروی را آخرِ اسپاں ونشیمنِ شاہی را خوابگاہِ خویش ساختند. رفتہ رفتہ از شہرہاے دور دست آگہی رسید کہ شوریدگانِ ہر سپاہ، در ہر فرود آمدن گاہ، (منزل) خونِ سپہبداں ریختہ اند. گروہا گروہ مردم را از سپاہی وکشاورز دل یکے گشت، وہمہ بے آنکہ باہم سخن رود- دور و نزدیک یکدست بریک کار کمر بستند؛ وناگاہ چناں پُرزور کمرے وچگونہ استوار بستنی کہ جز بہ جنبشِ جوشِ خونے کہ از کمر گذرد کشادنہ پذیرد. پنداری ایں لشکرہاے بے مزد غنیمت جویانِ بیشمار را جاروب وار کمر بند یکے ست. آرے رُفت وروبِ ہندبوم بداں ساں کہ آرامش و آسایش اگر جویند. باندازۂ پرکاہے گاہے نیابند ہمچنیں جاروبِ گیتی آشوب ہمی خواست.

درزمیں لرز (زلزلہ) سخت رود؛ دراں روزِ جہاں سوز بخت برگشتہ و سرگشتہ چند از سپاہِ
کینہ خواہِ میرٹھ بشہر درآمدند؛ ہمہ بے آزرم و شورانگیز و بیداد و زرگستی تشنۂ خونِ انگریز؛ دیدبانانِ
دروازہ ہاے شہر کہ پژوں (علاوہ) از ہمگوہری و ہم پیشگی نشگفت (عجب نیست) کہ ہم از پیش
ہم سوگند نیز باشند، ہم پاسِ نمک و ہم پاسِ شہر گذاشتند، و مہمانانِ ناخواندہ یا خواندہ را گرامی
داشتند۔ آں سوارانِ سرگرانِ سبک جلو (سبک عناں) و پیادگانِ تندخوے تیزرو چوں
درہا باز و درباناں را مہماں نواز یافتند دیوانہ وار ہر سو تافتند، و ہر کرا از فرماندہاں، و
ہر کجا آرامشگاہِ آں جہاں، یافتند تا از نکشتند و پاک نہ سوختند روے ازاں سو بر نتافتند
مشتے گدایانِ گوشہ گیر، از بخششِ انگریزی توشہ گیر، کہ ناں باتُرّہ و دُوغ می خورند، و در شہر
و ور از یکدگر پراگندہ جابجا روزگار بسر مے بُرند (یعنی رعایاے شہر) ہمہ تیر از تیر ناشناسندگاں
و از غوغاے دزد در تیرہ شب ہراسندگاں، نہ پلارکے در دست، و نہ خدنگے در شست؛
اگر راست پرسی ایں مردم بہرِ آبادیِ کوے و برزن اند، نہ براے آنکہ بہ آہنگِ پیکار
دامن بہ کمر زنند؛ با اینہمہ ازاں رُو کہ راہِ آبِ تیز رَو بہ خاشاک نتواں بست، دست از
چارہ کوتاہ دیدہ ہر یکے در سراے خویش بماتم نشست۔ یکے ازاں ماتم زدگاں منم کہ در
خانۂ خویش بودم؛ چوں غریو و غوغا شنودم تا از تیرہ ہُش دم نزدم، دراں مایہ درنگ کہ مژہ
برہم نزدم، آوازۂ بخوں غلطیدنِ صاحب اجنٹ بہادر و قلعہ دار در ارک، (قلعہ) و دویدنِ
سواراں و پیاپے رسیدنِ پیادگاں در راستہ بازار از ہر گوشہ و کنار، بلند گشت۔ ہیچ مشتِ
خاکے نماند کہ از خونِ گل اندامان ارغوان زار نشد، و ہیچ کنج باغے نبود کہ از بسے برگی ماتمکدہ

نشکرست از خداوندانِ لشکر؛ چنانکه از داستانِ باستانِ پارسایانِ پارس بہم نمانستنِ (عدم مشابہت) ایں دو ستیزہ و آویزہ ہویدائی دارد۔ دراں بارکہ سخن در کیش بود۔ ایرانِ بر ایں بفترہ و فرہنگِ کیشِ نو (یعنی اسلام) فرجامِ آبادی، واز بندِ آذر بندگی (آتش پرستی) آزادی یافت۔ دراں بارکہ گفتار در آئین ست۔ ہندیاں بہ چشم داشتِ کدام آئینِ تازہ شادماں باشند؟ پارسیاں رُخ از آتش تافتند، و بسوئے خدا راہ یافتند۔ ہندیاں دامنِ دادگراں (یعنی اہلِ فرنگ) از دست دادند، و بہ شکنجۂ دامِ ہمدمیِ دَداں (درندگاں) افتادند۔ نمی بینی کہ از دامن تا دام و از داد تا دَد چہ مایہ دوری ست؛ داد آنست کہ آرامش (راحت) جز در آئینِ انگریز چشم داشتن کوری ست۔ زخمِ تازیانۂ تازیاں از خوبیِ آں کیشِ فرخ (اسلام) مرہمے داشت؛ روزگار در نوردِ ایں خستگی (یعنی غدر) خجستگی اگر میداشت، بار اندوہ از دوشِ دلہائے نژند (پریشاں وتباہ) برمیداشت۔ اگر در اندیشۂ راز داناں بہ ہر دانش وداد۔ ازیں پیش آمدے (بہبودی) ہست بمن نشاں دہند، و بر دلِ اندوہگینِ ہمناک سپاس نہند۔ جہانیاں با جہانباناں ستیزند، و لشکریاں خونِ لشکر آرایاں ریزند، و آنگاہ شادی ورزند، و بر خویشتن نہ لرزند۔ ہاں اے دانندگانِ فرزبود (حکمت الٰہی) شناسندگانِ زیان و سود ایں ہنگامہ بہ آتشِ خشمِ خداوند گرم ست؛ ورنہ کارزارِ پارس اینچنیں امید سوز و آرزو گداز نبود۔

دو چاشتگاہِ دوشنبہ شانزدہم ماہ روزہ و یازدہم مئی سالِ یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت ناگرفتہ در دو دیوارِ بارۂ و باروئے دہلی بجنبید واں جنبش زمیں را فرا گرفت سخن

فصیل۱۲ قلعہ۱۲

شورش ۱۸۵۷

ہواخواہانہ بداں جُستی۔ کہ گوئی گوے دولت بُرد۔ خود را آب در زدہ بارے بدانست آشکارا بیناں سقاے سخت کوشے بود، دیدہ والا دید معنی آشنایان فرّخ سروشے بود کہ جہانیاں را از گرداب برآورد و برجہانیاں منّت نہاد۔

از دستنبو

اگرچہ مرزا کی نثر میں عموماً عربی الفاظ بہت کم آتے ہیں لیکن کتاب دستنبو میں۔ جو غدر کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے۔ التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پائے۔ باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے دستنبو میں اپنی طرز خاص اور شاعرانہ ادا اور بانکپن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چنانچہ نمونے کے طور پر دستنبو کے چند فقرے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں۔

"دریں روزگار۔ کہ ہر زمزمہ را ہنجار، و ہر ہمہ را رفتار، و ہر کجا سپاہے بود از سپہدار، سخن پیوندی بگذار و بگوے کہ خود روز و روزگار، برگشت۔ اختر شناسان سپہر پیماے (یعنی منجماں) برآنند کہ دراں روزگار۔ کہ بزم نازیزدجرد شہریار پارس از ترکتازیاں (اہل عرب) بہم خورد۔ کیواں (زحل) و بہرام (مریخ) در خرچنگ (برج سرطاں) انجمن آراے و ہنر آزماے بودند۔ اینک ہماں پایۂ (درجہ) سیزدہم از خرچنگ ہمچناں بہم پیوستن گاہ (جاے قِران) بہرام و کیواں ست، و ایں شورش و پرخاش و جنگ، و خواری و خونخواری ہا در رنگ و نیرنگ، نمایۂ (ظہور) آنست۔

دانا بدیں گفتار کے گرود؟ آں تاختنِ لشکرے دیگر بود از کشورے دیگر، و ایں برگشتنِ

وسوارِ فرسوده اندام، و ستورِ پشت ریش- فریبِ دوستی از دشمن خوردگاں (یعنی همایوں و
لشکریانش که فریب از شیرشاه خورده بودند) دست از غارت و تاراجِ غنیم کشیدند، و دمِ
آسایش غنیمت شمردند. پایها به جادهٔ بزهٔ دامن آشنا شد (یعنی پا بدامن کشیده بخواب رفتند)
و پیکرها چوں صورتِ دیبا به بستر پیوند پذیرفت. سر از بالش برنمی خیزد تا کلاه و مغفر را چه کنند؛
و پیراهنِ حریر بر تن گران ست تا چلقه و جوشن کجا برند. هوا نمناک بود، و ابر رشحه فشاں،
تیغ در نیام زنگ بست، و سمند زیں بر بارگی گراں گشت. سپیده دمے که تیرگیِ تارِ میغ
جہاں را فرو گرفته بود- هنگامه سازانِ هنگام جوے یکسره بر غنودگاں ریختند،
شگرف سراسیمگی پدید آمد و طرفه هزاهز در لشکر افتاد. کلاه از کمر، و پاپوش از افسار نشناختند
از رختِ خواب جسته، و بر اسپانِ بے زیں نشسته، پراگنده هر طرف تاختند. گروهے
"هرچه باداباد" گویاں سواره خود را بدریا زدند، و هنرورے چند ساحل جویاں به شنا دست و پا
زدند. تا کداماں به زخمِ دمِ تیغ و کداماں به تجمِ موجِ رود مرده باشند، و کداماں از طوفانِ ایں
دو آبه (یعنی آبِ تیغ و آبِ رود) جاں بسلامت برده باشند. شهنشاهِ بحر و بر (یعنی همایوں)
نهنگِ دشت نوردِ دریا شگاف (یعنی اسپ) را از فرازِ ساحل در آب افگند. پاے از رکاب
و عناں از دست و اسپ از زیرِ راں بدر رفت. و شاهسوارے که شاهاں هنگام سواری
بوسه بر رکابش می زدند- غوطه در آب خورد. نظام نام آزادهٔ از آب کشانِ لشکر که پنهاں
از خویش اقبال را چشم براه و گوش بر صدا داشت (یعنی بے آنکه خبر داشته باشد منتظرِ
عروج و اقبالِ خود بود) و با خویشتن درایں اندیشه که از ساحل چوں گذرد بر ساحل جا داشت-

بیان سلدوز، و امیر کیخسرو - که ریش هاے نو و ناسورهاے کهن داشتند - زخمه تیز تر زدند
و بنواهاے خونچکانِ خونابه فشان فغان برآوردند که تا قصاصِ خونهاے ریخته می خواهیم
نه انتقام فتنه هاے انگیخته که والیِ ولایت آن را بحل تواند کرد - ناگزیر همین گفتار فرجام گیر و دار
بشرع حوالت رفت - کارآگاهان و دانش پناهان خون ریختن فرمودند، و سادات و
علما به کشتن فتوے دادند -

پنداری چون خون گرفته اینها شنیده باشد و در دل اندیشیده باشد که خود را بگریختن
از هنگامه بدر برد - و پس از آن در زاویهٔ گمنامی که همسایهٔ نیستی ست روزگار بسر برد - از انجا که سلاح
بسلب نداشت سراسیمه از جا رفت، و از خرگاه بدر آمده بجنگِ سیلی و مشت رهِ گریز پیش
گرفت - خون خواهان بجوشِ گرمی در وے آویختند، و خونش را که بدویدن گرم شده بود
گرماگرم بر زمین ریختند -

تو اے ندیم که مانی بتازه روئی خویش — بسبزهٔ که سر از طرفِ جویبار کشد
فریبِ مهرِ زرِ گردون مخور که این بے مهر — دهد فشار کسے را که در کنار کشد
هواے تاجِ شهی هر کرا بود در سر — سرے بدفنِ شاهانِ تاجدار کشد

شیرخان را دل دگر بود و زبان دگر، به لابه گری و فسون گستری پیامِ آشتی درمیان
داشت - تا چنان شد که هیچ کس را ستیزه در اندیشه نگذشتے - انان گل و لاے که در راه پیموده بودند
و روز و شب از رهروی - سَنے نَے از شتاوری - نیاسوده بودند، پیاده و آزرده پاے بوده

یعنی از شتاوری گل زدهٔ ۱۲

اما من آں نیم کہ پسندم طریقِ وہم ‏ زاختر چہ شکوہ چوں نبود جز خدا قسیم

نبود بجز ظہورِ صفات و شیونِ حق ‏ صلح و نبرد و فتح و شکست و امید و بیم

توقیعِ معنویست گر انصاف در ستم ‏ تشریفِ خسرویست گر اطلس و گر گلیم

از حق بود افاضۂ ہستی بہر صفت ‏ جز وایہ نبود آنچہ بہ سائل دہد کریم

ہمچنیں بارہا امیر حسین را از درماندگی و زبونیِ [مغلوبی۱۲] کار سخت افتادہ است، و سلطان سامِ ہم آوردِ [موصوف۱۲، صفتِ اول] افراسیاب ہمتا [صفتِ ثانی۱۲]۔ برلابہ گریِ وے بخشودہ بیاری و یاوری دل نہادہ است. کیں ہاے نہانیِ امیر حسین آشکارا بود. ہمہ می دانستند، و خدیو ہمہ واں از ہمہ فزوں ترمی دانست. داغِ درضمیرِ حق پذیر آزرم ناگزیر۔ می گذشتہ باشد کہ مگر ایں سست مہر خوہاے زشت و کردار ہاے نکوہیدہ بگذارد، و جہاندار را دگر بار آشتی و جہانیاں را اپیس بہ درازدستی نیازارد. آں ناجوانمرد را فرۂ ایزدی کجا کہ بخشم و کام [یعنی خواہشہاے نفسانی۱۲] نگرود، و راہِ دانش و داد رود. در آزردنِ دل آزرم [شرم۱۲] نداشت، و در بردنِ زر شکیب، و در کشتنِ خلق پروا.

تو پارسا طلبی عاشق و من آں رندم ‏ کہ مے بحلقۂ او باشش آشکار کشند

پایانِ کار لشکریانش از ناخوشی ستوہ آمدہ آں جوان میرِ خداگیر* را با ہر چہار پسرش گرفتہ آوردند و بخداوندگار سپردند. دارائے نبرد آزمائے را آہنگِ عاجز کشی نبود و خوں گرمیِ پاداش (یعنی جوشِ انتقام) نداشت. می خواست بر نابخشودنی بخشودن و گناہانِ نابخشیدنی بخشیدن. از نہادِ اہلِ بزم خروش برخاست. خاصہ شاہ محمد مرزبانِ بدخشاں، و شیخ محمد

* ناگزیر کسیکہ او را از آزرم و مروت چارہ نباشد۱۲ * خداگیر کسیکہ بغضبِ خدا گرفتار شدہ باشد۱۲

و برگ، و ساز گرد آید بر یکدگر بخشش کنیم، و با هم جز مهر، و با قوم جز آزرم، و با خلق جز داد نه ورزیم
بجوش گرمی این دو گرد دلاور، و دو سپهر مردم، گهر هنگامه گرمی پذیرفت، و گزین دستگاهے
یعنی بردوستی
و سترگ سپاہے فراہم آمد. صاحبقران نه از سادگی بلکه از آزادگی دل باز باں یکے داشت، و
امیر حسین ہموارہ در کمین آں بودے کہ انباز را از میاں بردارد، و بیکتائی علم دارائی افرازد.
شریک یعنی تیمور ۱۲
اندیشه وری بسگالشہاے آں نژند اندیشه ناراستی پیشه پے بردے، و از فرزانگی و مردانگی
سگالش خیالات ۱۲ — یعنی امیر حسین ۱۲
ہیچگاه بروی نیاوردے.

ستم بجان بکج اندیش میتوان کردن — خجل ز راستی خویش میتوان کردن

روزگارے دراز تر از رشتهٔ طول امل- با ملوک طوائف در کیدار و مریز و ستیز و آویز گذشت
همگناں چشم براه و گوش بر آواز داشتند تا ایل اسفندیار نیرو را از کدام سو چشم زخم رسد.
یعنی تیمور ۱۲
و تیره امیر حسین کہ جز بریو و غریو و رنگ و نیرنگ کار نمی کرد، و در انبازی و دمسازی- فتنه پردازی
حضور ساز ۱۲ — یعنی در دوستی ۱۲
و شعبده بازی شیوه داشت. نیرنگ سازی اقبال عدو مال صاحبقران کشورستان را
نازم که هم آں گروه بے شکوه را سو بسو پائے بسنگ خوردے، و هم این گرویده دستبرد را
یعنی امیر حسین را
جا بجا دست از کار رفتے. صدره اتفاق افتاده است که این نفاق پیشگان خرد دشمن
خون گرفته را از نژاد چنگیز خان دست گرفته بر تکیه گاه خانی و مرزبانی نشانده اند، و زود نه
و بتیغ شمشیر بر سرش رانده اند. تنهاے پیلتناں را مسند و نطع از پئے هم مهیا بود، و سرهاے
سروران را ناز بالش و خشت گور از پس یکدگر آماده.

سیر ستاره و روش چرخ نیلگوں — اینها کند هر آئنه در مذهب حکیم

خرمنِ ہستی قاجولی بہادر سوخت، و سپرش ارُوجی برلاس بسپرلشکری (سپہ سالاری ۱۲) رُخ افروخت۔

روزے میانۂ امیر قزغن و امیر طراغاے دربارۂ اولوس (قبیلہ ۱۲) و قشون (فوج ۱۲) سخن میرفت، و فرزانۂ فیروزی فر امیر تیمور دلاور باپدر ہمزباں بود۔ پدر را از گفتار باز داشتہ خود لشکری سخن سرائے شد، و بداں ہنجار زخمہ چند بر تارِ گفتار زد کہ امیر قزغن دراں شیوا بیانی و گہرافشانی بہ مہر دل بست، و بآفریں زباں برکشاد سخن گوے فرو ہیدہ ادا را پسر خواند، و ہمدراں بزم اولجاتو ترکاں خواہرِ امیر حسین نبیرۂ خویشتن را بآئین دین و قانونِ شرع بوے سپردہ تا خویشی (دامادی ۱۲) بر خویشاوندی (قرابت ۱۲) افزاید، و آمیزشے چون شیر و شکر درمیاں آید۔ امیر جہانجوے (یعنی تیمور ۱۲) پس ازاں پیوستہ با امیر قزغن در بزم ہمنشیں و ہمدم و در رزم پیش تاز و پیش آہنگ بودے۔ از نبرد آزمایانِ برلاس (نام قوم امیر ۱۲) و دلاورانِ ختیابیر (نام قبیلہ امیر ۱۲) کہ آں دست بُرد (یعنی جنگ امیر ۱۲) دگرگون سے شگفتی فرو ماندے (بجای حروف ای متعجب ماندے ۱۲)، و دست مریزاد (کلمہ دعا ۱۲)، گویاں براں دست و بازو آفریں خواندے۔ پس از امیر قزغن کہ [illegible] اتفاق تیمور ناگاہ در شکارگاہش کشت۔ جہاں پہلوانِ تہمتن (یعنی امیر تیمور ۱۲) تواں بہ تنہا دامنِ ہمتِ والا گرفت، و در تیغ زنی و خصم افگنی کارش بالا گرفت۔

ہرچند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ
در عہدۂ رحمتِ خدائیم ہمہ

در جلوہ و بد چنانکہ ائیم ہمہ (یعنی اگر ظاہر کندہ ۱۲)
شایستۂ نفرت و بدریائیم ہمہ

برادرِ زنِ صاحبقراں (یعنی ۱۲) ہمانا امیر حسین نیز بوے پیوست، و عہد بست کہ ہرچہ از ملک و مال

---

* امیر قزغن نام یکے از امرائے چغتائیہ ۱۲ * امیر طراغاے نام پدر امیر تیمور ۱۲ § یہ رباعی گویا آیندہ آنیوالے مضمون کی تمہید ہے ۱۲

شهنشاه دانا دل و دیده ور | که چون لعل بودے سراپا جگر
بران شد که لشکر فراز آورد | بسوے خطا ترکتاز آورد
ز مردان و گردان و کُند آوران (پهلوانان ۱۲) | به جنبش در آورد کوهے گران
ازان رو که پابست خونریز شد (یعنی اسپہ سے کہ خونریزی ہونا منظور تھا ۱۲) | منش با بخون ریختن تیز شد
دلیران ز دشمن کشی دم زدند | ز دم باد بر روے پرچم زدند
ز تاتار تا گرد انگیختند | به بنگاه خان خطا ریختند

الیاس خان دل و دست و عنان و سنان بکار در آورد، و خود را با سپاهے از ستاره بیشمار افزون تر (چہار سو طرف ۱۲ – صفت ۱۲) به پیکار در آورد. کوشید و کوشیدن سود نداشت؛ رقم فیروزی بنام قولیه خان کشیده بودند. شکیبائی گسل شکستے (صفت ۱۲ – موصوف ۱۲) بر خطائیان افتاد؛ علم ها واژگون شد، و اندیشه بگریز رهنمون. جهانیان الیاس خان به گریختن جان برد، و تن هاے خسته و دلهاے شکسته از میان برد. بشهر اندر آمد، و در بروے سپاه کینه خواه بست. قولیه خان و لشکریانش نه آنمایه برگ و ساز پیکار بودند که در اندیشه گنجد. سپاس گزار چرخ و اختر گشتند، و گرانبار و سبک عنان برگشتند. پادشاه بچشم روشنی پیروزی سپاه و رعیت را صلاے عشرت اندوزی داده هنگامه جشن گرمی پذیرفت، و بزم سور آرایش یافت. خواهی هنگامه گرم کن و خواهی بزم آراے! هر گاه نه آن خدنگ به کمان ست که خطا کند، قولیه خان را نیز بهنگام خویش ناوک بسان خورد. چون پسر نداشت برتان بهادر جاے پدر را ز برادر گرفت. بسکه دلیر و مردانه بود نامش از خانی به بهادری در جهان رفت. به روزگار جهانداری این شهریار والا رتبت ایلیا

بُرد. خطائیان روے بازگشتن نداشتند، پَے* امیدگاهِ تگاپوے خویش برداشتند. خانِ سپهرآستان نخست بآرامش جارسید و خطائیان سپس (یعنی از پس رسے ۱۲). با قاجولی بهادر و فرزانگانِ لشکر سِگالِش (مشوره ۱۲) رفت که چه می باید کرد. انجامِ کار به بهبدِ (صوابدید) یکدگر بدخواهان را کُشتند، تا از تحمینکه کُشتند چه در یوند. (یعنی اب دیکھیے اس حرکت کا انجام کیا ہو ۱۲)

شهریار قبل خاں از یک بانوے نکو دیدار - که از قومِ قنقرات بود - شش پسر داشت. نخستیں و دومیں به اوکیں برتاق و قوبلہ خاں نام آور، و دیگراں به نامهاے دگر روشناس. روزے نخستیں ایں دو برادرِ نام آور - ناگاه بشکارگاه از همرہاں جدا همی ماند، و راه گم کرده هرزه همی گردد. تاتار خانیاں - که غارتگری پیشه داشتند، و پیرامنِ قلمروِ مغول همواره راه می زدند - با ایں شهسوارِ پریشاں رفتار بر می خورند، و چوں مے دانند که کیست باسیری می برند، و بالتاں خانِ خطائی می سپرند. خاں که دلے پُر داشت (یعنی جیرا بیٹھا تھا ۱۲) فرماں می دهد که شاهزاده را بر خرِ چوبیں به میخهاے آهنیں بر دوزند، و تنِ نازنینش از رواں بپردازند. خیداوند (یعنی قبل خاں ۱۲) مغولستاں را که از پیش رنجور بود به جگرتابیِ ایں داغ درد افزود. چوں دانست که ناکام همی باید مُرد دومیں پسرِ خویش قوبلہ خاں را به جانشینی گزیده، و به کشیدنِ انتقامِ خونِ برادر وصیت کرده چشم از تماشاے جهاں پوشید. قوبلہ خاں تاتگینِ سلیماں بکف آورد و بفراهم آمدنِ سپاه فرماں نبشت. فرماں براں و کینه خواهاں از هر سوے بتختگاه روے آوردند.

---

* پَے برداشتن تعاقب نمودن - امیدگاهِ تگاپوے خویش یعنی کسیکه در طلب او تگاپوے نمودند ۱۲

گرفت و بسوے خود کشید، و ناسزا گفت. میزبان خشم فرو خورد، و نزدیکان خود را که بہم آویزہ بودند

از گستاخی باز داشت. بامدادان میہمان آہنگ بازگشت بسرود (ظاہر کرد۱۲). میزبان که از بادۂ مستیِ دوشینہ

سرگراں بود- چنانکه میزباناں دامنِ میہماں زود از دست ندہند، و آرزوے وے ماندن

کنند- نکرد. کلاہ ہاے گوہر آگیں، و کمرہاے زریں، و رخشندہ نگیں ہاے بیش بہا، و پیستہ ہاے (یعنی بقچہ۱۲)

پرنیاں و دیبا پیش کشید، و پدرود کرد (رخصت۱۲). ہنوز رہرو (یعنی قبل خاں۱۲) دور نرفتہ بود که بدآموزاں التان خاں

را از جاے بردند (اغوا کردند۱۲)، و برآں آوردند که قبل خاں را از راہ برگردانند، و بدرگاہ آورند، و کالبدش

را بدشنہ و خنجر از ہم فرو گشایند. سخن بنرمی گزارندۂ ستارہ از سپہر فرود آرندہ۲- بدیں کار

کمر بست. و قبل خاں را براہ دریافت، و بباز آمدن فریفت. رسیدہ راہم نہ شد، و از

راہ برگشت. فرستادہ تنہا باز آمد و بفرستندہ خبر داد. بگروہے از گرداں و یلاں فرماں

رفت که جلو گسیختہ (بگٹٹ۱۲) شتابند، و ہر کجا یابند اگر بشادی و رادی (آدمیت۱۲) نیاید بخواری و زاری آورند.

مگر قبل خاں را براہ دوستی بود از دودۂ ستودۂ سلجوق- بکاشانۂ وے فرود آمد. و انجم از بہر آسایش

آہنگِ دو سہ روزہ آنجا پردہ داشتہ (اقامت۱۲) باشد. خطائیانِ شوریدہ مغز دراں دہ رسیدند، و خاں را

دراں خانہ دیدند. سخن بداں لابہ ساز (چرب زبانی۱۲) کردند که خاقان فریب خوردہ، و خواست که سوے

خطا برگردد. خانہ خدا (میزباں۱۲) که خرد از مہر فزوں داشت- نہفتہ بادپائے پیش کشید و گفت کارہا

دگرگون ست، با رفتن بخطا خود ہیچ روے روا نیست، تنہا بدیں گروہ میاویز، و بریں

بادپا توسن نام برنشیں، و سوے ایل و اولوس (قوم و قبیلہ۱۲) بگریز. ناگزیر ہمچناں کرد، و جانِ گرامی بتیزگامی

---

۲ یعنی کسیکہ بلطفِ زبانی و حیلہ سازی ستارہ را از سپہر فرود آرد۱۲

نگرندگاں ہمہ تن چشم باشند، و شنوندگاں سراپا گوش ۔

طرزِ واقعہ نگاری مرزا نے مہر نیمروز میں جس طریقے سے واقعات تحریر کیئے ہیں یہاں دو
ایک مثالیں اُسکی بھی لکھی جاتی ہیں ۔

خانِ خطا با خویشتن سنجید کہ با قہرمانِ قومِ مغل مہر ورزد مہر انگیز نامہ رواں داشت و
[یعنی قبل خاں ۱۲]
گزیدہ ردشے را بہ نامہ بری و میانجی گری گماشت ۔ فرستادہ آمد، و جہاں پہلوان قبل خاں
[نامہ بر ۱۲]
را زمیں بوسید، و نامہ سپرد، و پیام گزارد ۔ صرفہ ور آشتی بودنہ در فروگذاشت ۔
[یعنی مصلحت ۱۲]
قاجولی بہادر را بجائے خود نشاند، و بہمعنانی نامہ آور توسنِ تیز گام سوئے خطا راند ۔
[نام برادر قبل خاں ۱۲]
فرمانروائے آں کشور سرانِ لشکر را پذیرہ فرستاد، و مہمان را بخوشتریں نشیمن فرود آورد ۔ دو
[استقبال ۱۲]
پادشاہِ سپہر بارگاہ بر یک خواں نشستند، و ناں خوردند، و راوق آشامیدند ۔ مگر خرد پیشہ
[شراب ۱۲]
قبل خاں را در اندیشہ گزشتہ باشد کہ مبادا خطائیاں زہر بہ بادہ آمیزند، و بدیں رنگ
[اہل خطا ۱۲]
خونِ مہماں ریزند ۔ و در ہر بزم پس از اندک مایہ درنگ بہ بہانۂ آب تاختن بیروں آمدے
[یعنی ہر صحبت ۱۲] [تاشیدن ۱۲]
و بہ پیہم شگوفہ کردے، و خوردہ و آشامیدہ از دہن فرو ریختے ۔ چوں بزم اندر آمدے
[یعنی پیہم قے کردے ۱۲]
دگر بارہ ساغر گرفتے، و خوردنی از سر گرفتے ۔ خطائیاں بہ شگفت فرو ماندہ کہ یارب ایں چہ
نیرومند و زور آور کسے ست کہ از ما بیشتر می خورد و خورش را بروئے گرانی نیست، و مے از ما
فزوں تر می کشد و ہشیار تر از ماست ۔ میکشاں دانند کہ چوں بادہ بہ زور دمادم خورند، ہر چند
ہر بار شگوفہ اندازند ۔ نہ آنست کہ مستی روئے ندہد، و تابِ مے و زبونیِ قے منش را بہم برزند ۔
[یعنی مزاج ۱۲]
شبے بادہ بہ خرد و زور آورد ۔ قبل خاں ریشِ دارائے خطا کہ التان خاں نام داشت ۔

نہ آں دستور ست کہ بہ ہر ہیکرے کہ خود کشند عشق نہ بازند. مگر مانی [نام نقاش مدعی نبوت ۱۲] آں نقش را کہ خود میبرد
از اعجاز نمی شمرد؟ و آزر آں بت را کہ خود می تراشید نماز نمی برد؟ یزداں را بندۂ سپاس گزار
باشم اگر قلم را بہر جنبش آفریں نگویم، و از سخن بہ ہر اندیشہ سپاس نہ پذیرم [ناشکر ۱۲] - رفتارِ کبک و
تذرو دل از دست بَرَد، و خرامِ ایں رعنا لعبت [ممنون نشوم ۱۲] رقاص سر مست نکند؟ حاشا کہ خرامشِ
کلک [یعنی قلم ۱۲] بر ورقِ ایں نامہ ذوق انگیز تواند بود؛ تیر [تیر عطارد ۱۲] ست کہ بسنبلہ [نام برج ۱۲] در حالتِ سرمستیِ تقسیم خود نگاہ
بنازی خرامد. ایں پارسیِ آمیختہ بہ تازی - کہ از زبانِ چیرہ دستیِ عرب بر عجم در گیتی پدید آمدہ -
خسروی گنجینۂ دربستہ بود کہ خامۂ من قفلِ درش را کلید آمد. بہ دو بنگر کجاست تا بنگرد کہ دریا
رہروی کدام رہ سپردہ ام، و بہرام کجاست تا فرارسد کہ سخن را از کجا بکجا بردہ ام.

خسروی بادہ دریں دور اگر میخواہی - پیشِ ما آے کہ تہ جرعۂ از جامی ہست

خودستائی غروہم، و بندِ پندار گسلم. آوخ ازاں روزگار کہ از خوی بنا سازی و از کار پیاز بی سیری
شد، و داد ازاں بیداد کہ در ورزشِ [مشق ۱۲] افزونیِ خشم و کام بر روان و ہوش رفت. از کار و رنا ہے
ایں نگارش سپاس پذیرم کہ بپرداختنِ [آراستن ۱۲] ایں نمط - کہ خود را چوں سایہ بازمیں ہموار ساختہ ام،
تا پرداختہ ام - و بانگیختنِ ایں نقش - کہ چشم و دل و نگاہ و نفس باہم آمیختہ ام، تا انگیختہ ام - دست
از کارہای دگرگوں تاہ ست، و دل از اندیشہ ہاے دگر بر کنار. نامہ نگار - کہ از کردار گزاری گفتنِ
درد و دل روے آوردہ بود - بازیہ پاے سخن می آید، و جادہ کہ نشاں دادہ اند سپے پیماید.

* تقسیم اور احتراق منجمین کی اصلاح میں دو متقابل لفظ ہیں۔ جب کسی ستارے کا فاصلہ مرکز آفتاب سے ۶ درجہ ہو تو کہتے ہیں کہ یہ ستارہ احتراق میں ہے اور جب یہ فاصلہ ۱۶ دقیقہ یعنی بہ نسبت احتراق کے ۴۴ ۳ دقیقہ کم ہو تو کہتے ہیں کہ ستارہ تقسیم میں ہے الغرض ستارے کا تقسیم میں ہونا اسکی عمدہ ترین حالت ہے ۱۲

بسیم و زر و لعل و گہر سختہ اند، من آں خواہم کہ دیدہ وراں را دستوری دہی تا از کشش و
(سنجیدہ اند ۱۲)
کوشش تر نجنند، و یکبار گفتارِ مرا با کلام کلیم بسنجند۔ + + + + + + + + + + + + + + + + + +

پریشاں نوائیِ من در ستائشِ گفتارِ خویش اگر خود گزاف نباشد، گفتار راست بگستاخی
گزاردن ہم از انصاف نباشد۔ آخر نہ ہما ام؟ کہ ہمہ وقت خود را ہیچ شمردمے، و ہیچگاہ بر خود گمان
کمالے نبردمے۔ سرمستیِ ذوقِ برگزیدنِ ایں ہمہ الا نظر کہ برگزیدہ تست مرا از من بُرد، و
(یعنی حکیم احسن اللہ خاں ۱۲)
خامۂ بے پروا پوے را بدیں روش و آہنگ بخرامش و رامش آورد۔ + + + + + + + + + +

ہمانا بلند نامیِ سلطانِ دہر در آفاق چشم داشت، کہ چوں منے را کہ بجادو بیانی شہرۂ آفاقم
بکردار گزاری گماشت۔ من خود ازاں رو کہ دل و زبانِ ایں بیدار مغز آئینہ دار دل و زبانِ
(حسرت نگاری ۱۲) (یعنی حکیم ۱۲)
شاہ است۔ دانم کہ آنچہ عمدۃ الحکما دریں باب میں فرمودہ۔ فرمانِ شاہ است۔

پادشاہاں را ثنا گفتن نہ کارِ ہر کس ست ۔۔۔۔ دیدہ ور شاہے کہ کارِ گفتن اندر آورین

نامہ نگارِ کردار گزار را بہ تنومندیِ توفیقِ سر انجامِ خدمت۔ سعادتِ جاودانی، و خاقاں را
بہ سایۂ سوادِ ایں نگارش کہ ظلماتِ آبحیوان ست حیاتِ ابد ارزانی باد۔

فخریہ فقرے مرزا نے مہر نیم روز میں جہاں سبب تالیف کتاب لکھا ہے اُسکے آخر میں یہ
ظاہر کیا ہے کہ کسر نفسی کی معمولی رسم کے برخلاف اگر میں اپنی طرز بیان کی داد لوگوں سے
چاہوں تو یہ کوئی بیجا بات نہوگی بلکہ عین تنقید و تمیز کی بات سمجھی جائیگی اسکے بعد کہتے ہیں۔
"کالا شناسی را نہ آں آئین ست کہ نکوئی کالاے خویش از نظر انداز ند، و پرکار بیکشائی را
(جسوری ۱۲)

؎ خاندان تیموریہ کی تاریخ نویسی کیلئے مرزا کو حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے تجویز کیا تھا یہاں اُسی مضمون کی طرف اشارہ ہے ۱۲

ستانه نیار (متواتر ۱۲) و چمید. گسستگیِ پیوندِ نشاطِ کهن شد، و خوں از دلِ همچناں در چکیدن ست؛ تا پیوند چه قدر استوار بود؟ و چه مایه به زور گسسته اند.

شبے با دلِ دیوانه که بختے (کسی قدر ۱۲) از من هوشمندتر ست. گفتم که اگر بگفتار نیرو دهی (یعنی اگر طاقتِ گفتار دہی ۱۲) پیشاهِ ارم کارگاه بارگاه. عرضه دارم که آئینهٔ رازم. مرا می‌توان زدود، و نیِ بندهٔ سخن طرازم. مرا می‌توان پرورد. گفت اے ناداں این سخن از جاے دگر بود و هنگام آں گذشت؛ اکنون اگر همی توانی گفت بگوے! اے خسته ام. مرهم می‌توان نهاد، و مرده ام. جاں می‌توان بخشید.

رباعی

شاها هرچند دایه جوے (دریوزه ۱۲) آمده ام   دانی که چه مایه نغز گوے آمده ام
آنم که محیط را بجوے آمده ام   رنگم که بهار را به روے آمده ام

اگر چنانکه پروردگانِ توام. بروزگارِ فرزانه جمشید بودمے. جمشید روزگار را آفریں گفتمے؛ و اگر بدانساں که ثناخوانِ شهریارم. فرخ فریدوں را ستودمے. فریدوں چرخ و ستاره را گردِ گشتمے. و دراں انجمن که زردشت آتش افروخت، و ژند آورد، اگر من بدیں دمِ آذرفشاں جا داشتمے. آذر از بیمِ من زبانه (شعله ۱۲) نزدے؛ و از دلفریبیِ بیانِ من کس بشنیدنِ ژند نپرداختے. من بدیں فرخیِ بخت که چوں تو خداوندِ کارفرماے دارم. هر قدر بر خویشتن بنازم جا دارد؛ حسرت گردم! تو نیز بدیں گرمیِ هنگامه بناز. که همچو غالب بندهٔ آتشیں نواے داری. اگر باندازهٔ هنرِ داد التفات می‌دهی. جاے مردمکِ دیده بمن بازگزار، و در دل بروی من بکشاے.

گویند در عهدِ جهانبانیِ حضرت صاحبقرانِ ثانی (یعنی شاهجهاں ۱۲) بفرمانِ آں خسرو دریادل. کلیم را صدره

سروبرگِ آزادانہ آسایشے ۔ سرگذشتِ ہرکس ہماں فرمانہائے امضا پذیرفتۂ سرنوشتِ اوست، درآنچہ برمن رفت دوستاں را بامن چہ جای سرزنش، ومرا با دشمناں چہ گنجائی پرخاش۔ (گنجایش ۱۲)

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج — دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد

پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزی رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد، بفروغِ آں فرۂ ایزدی کہ فریدوں را بہ فرتابِ دادگری دل افروخت، و مرا فرہنگِ سخن گستری آموخت، بداں در فرودم آوردند کہ تو نیز چوں حلقہ چشمے بداں در داری، و نتوانی کہ دیدہ برداری۔ +

تا ہمسایۂ ادیم سپہریاں در سایۂ من اند، و تا خاک نشین آں درم فرشتگاں در رشکِ پایۂ من اند۔ در دل و دیدۂ روشناں (ستارگاں ۱۲) جائے من ست، و بر سر ماہ و ستارہ پائے من۔ درین گوشہ گزینی و خوشہ چینی بخت آیۂ رحمتے کہ بر من از بالا فرود آمد، رو دادن فرخندگی زمیں بوسِ کیہاں خدیوِ خداداں بود۔ دولت روئے آورد، بخت از خواب جست، حور چشم روشنی (مبارکباد ۱۲) گفت، رضواں رضا جوئے آمد، چرخ از رفتہ عذر خواست، روزگار از گذشتہ بحلی (معافی ۱۲) طلبید۔

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بہ کفر — نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

کالبدِ خاکی مرا چوں پیکرِ گردباد جائے در میاں نیست، ہمیں یک دو دمہ سرگشتگی تماشا دارد، مگر عندلیبِ گلشنِ تصویرم کہ بوئے گل زمزمہ از وے نتواند دمید، یا سبزۂ جوہرِ شمشیرم کہ بوزیدن باد

۱؎ اس در سے میاں کالے صاحب کا دروازہ مراد ہے جو بہادر شاہ کے پیر تھے اور مرزا انکے مکان میں رہتے تھے ۱۲

در بادهٔ اندیشهٔ ما دُرد نه بینی   در آتشِ هنگامهٔ ما دود نیابی

از والیسیانِ ایں قافلهٔ نیاے من [جد ۱۲] - که در قلمروِ ما وراء النهر، سمرقند شهرِ مسقط الراسِ [جاے ولادت ۱۲] وے بود - چوں سیل - که از بالا به پستی آید - از سمرقند بهند آمد. در دفترِ سپهبدِ شاه نشان ذوالفقار الدوله میرزا نجف خاں توقیعِ نوکریِ شاهش نوشتند، و بر پرگنهٔ پچاسو براتِ روزیِ وے و سپاهش نوشتند. پدرم پیشهٔ پدرِ خویش داشت، و هم در کارزار جا به گذاشت [مُرد ۱۲]. هما نا گلبنِ ثناے ترا نو آئیں نوا بلبلے همی بایست که مرا زمزمه سنج و دستانسراے آفریدند.

رباعی

غالب به گهر ز دودهٔ زادشمم   زاں رو بصفاے دمِ تیغست دمم
چوں رفت سپهبدی زدم چنگ بشعر   شد تیرِ شکستهٔ نیاگاں قلمم

خاکم بسر که بفریبِ پندارِ آزاده روی بسخنِ لاابالیانه پرداختم، و اندازهٔ ارزشِ سخن و پایهٔ والایِ گوهرِ خویش نشناختم. سینهٔ من نفسے داشت برواں آسائی نسیمے که از نسترن زار وزد، زیاں زدهٔ من - که دم عجز به نابایست نزدم. و بناں مرا قلمے بود به دجله باریِ ابرے که از قبله خیزد. بیهده کوشِ من - که باراں بشوره زار فروریختم.

با ایں فروغِ گوهر و رخشانیِ نهاد   زیں ساں سیاه روز مرا کرد روزگار

با فرّهٔ فرهنگ بیگانه، و با نام و ننگ دشمن، با فرومایگاں همنشیں، و با اوباش همرنگ، پای بیراهه پوے، و زباں بیصرفه گوے، در شکستِ خویش گردوں را دستیار [مددگار ۱۲]، و در آزارِ خویش دشمن را آموزگار، دل پُر از خار خار، و دیده نشتر زار، نه دستگاهِ خودنمایانه آرایشے، و نه

خطاب کا نام خطاب زمیں بوس رکھا ہے۔ اُسکو کسی قدر حذف و اِسقاط کے بعد ہم اِس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"قاآن شیوہ خاقانا! و خواقین خدایگانا! رُوی آوردنِ من از عدم بوجود بسودای گہرسنجی و گہر فروشی بود؛ کالاے بیش بہاے من درین چارسو رُوی روائی ندید؛ و متاعِ گرانمایۂ مرا دریں بازار ارزش ارزانی نہ شد؛ ناچار ہر چہ با خویش آوردہ ام۔ چوں گویم کہ با خویش می برم۔ لختے در سفینہ ہا، و پارۂ در سینہ ہا میگذارم و میگذرم۔ پس از من آں گنجِ شائگاں را اگر ہمہ باد ببرد گو ببر، و اگر ہمہ خاک بخورد گو بخور۔ سینہ آرزوہاے جواں میر را مدفن ست، لمعۂ نگاہِ کرم چراغِ گورِ غریباں باد۔

نیاگانِ نامہ نگار از تخمۂ افراسیاب و پشنگ بودہ اند، و فرماندہانِ با فرّ و فرہنگ فرو مُردنِ چراغِ ہستی نوردیدۂ تور بہ بادِ آستینِ کینۂ کیخسرو، پشنگیاں را روزِ سیاہ پیش آورد۔ خداوندانِ اورنگ و دیہیم را از آں برگ و ساز ہا جز تیغِ گندناگوں بکف نماند۔ بہ مرز و بومِ بیگانہ روی آوردند، و بہ دستِ مُزدِ تیغ زدن ناں خوردند۔ ہم ازیں نیستاں ایوانانِ کُہسار نشیمن۔ سلجوقیاں دگر بارہ سر بافسر و افسر بگوہر آراستند۔ چرخِ گردندہ چنانکہ خوی اوست ایں نامدارانِ کاؤس کوس را نیز از پای افگند۔

در مشربِ ما خواہش فردوس نجوئی | در مجمعِ ما طالعِ مسعود نیابی

✱ مرزا اکثر بلکہ تقریباً ہمیشہ اُن لفظوں کے بعد جنکے آخر میں واو یا الف ہوتا ہے بغیر اضافت کے بھی قدما کی طرز پر یاے زائد لاتے ہیں مثلاً رُو یا سُو یا پا اور جا کی جگہ روے سوے پاے اور جاے لکھتے ہیں ۱۲

ذوق سلیم رکھتے ہیں امید ہے کہ وہ مرزا کی نثر میں ایک عجیب طرح کی لذت اور شوخی اور ایک
نئی طرح کا بانکپن پائیں گے جس سے تمام متاخرین کی نثریں بالکل مبرا ہیں۔

چونکہ مرزا کی طرز انشا پردازی سے اکثر لوگ نا آشنا ہیں اس لئے جہاں تک ممکن ہوگا
ہم انکی نثر میں سے ایسے مقامات اخذ کرینگے جو صاف اور سلیس ہوں اور باینہمہ جہاں
ضرورت ہوگی کہیں بین السطور میں کہیں بریکٹ میں اور کہیں فٹ نوٹ میں حل طلب
مقامات کی شرح بھی کرتے جائینگے۔

مرزا کے تمام فارسی کلام کی املا میں ایک خصوصیت ہے جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں
یعنی وہ بعض الفاظ کو تمام اہل زبان اور زباندانوں کے برخلاف دوسری صورت سے
لکھتے ہیں مثلاً صد کو سد، شصت کو شست، غلطیدن اور طپیدن کو غلتیدن اور تپیدن،
گذشتن اور گذاشتن کو گزشتن اور گزاشتن، آذر اور تذرو کو آدر اور تدرو وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ
یہ املا ناظرین کے تردد کا باعث ہوتی اور نیز ہم اس املا کو صحیح نہیں سمجھتے اس لئے اس کتاب
میں جہاں کہیں مرزا کا کلام نقل کیا گیا ہے وہاں الفاظ مذکورہ قدیم معمولی طریقے کے
موافق لکھے گئے ہیں۔

نثر فارسی کا انتخاب

از مہر نیمروز

خطاب بزرگ بہادر مہر نیمروز کے دیباچے میں حمد اور نعت اور مدح پادشاہ کے بعد ابوظفر
سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف خطاب کرکے اپنا دردِ دل بیان کیا ہے اور اس

تسلیم کرنی چاہیئے) کہ مرزا نے متاخرین کی طرز انشا پردازی سے استفادہ حاصل کیا ہے تو بھی متاخرین کی نثروں میں مرزا کی طرز کا سُراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسا تخمی آم میں پیوندی آم کا مزا ڈھونڈھنا۔ تقریباً ساٹھ برس گذرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لایق آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابوالفضل اور مرزا بیدل دونو کے مختلف اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں اخذ کرکے ایک جدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے؛ لیکن جب مرزا کی نثر کا اُن دونو کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو مرزا کی کوئی ادا اُن کی طرزِ ادا سے میل نہیں کھاتی۔

اگرچہ مقتضای مقام یہ تھا کہ مرزا کی نثر میں جو خصوصیتیں ہمکو معلوم ہوئی ہیں اُن کو یہاں مفصّل طور پر بیان کیا جاتا اور ہر ایک خصوصیت مثالوں کے ذریعے سے ناظرین کے ذہن نشین کی جاتی لیکن چونکہ لوگوں کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلبستگی نہیں ہے اس لئے ہم اِس بحث سے قطع نظر کرکے حسبِ وعدہ اُن اصحاب کی ضیافتِ طبع کیلیے جنکو فارسی زبان کے ساتھ باوجود اُسکی کساد بازاری کے اب تک کچھ نہ کچھ لگاؤ چلا جاتا ہے مرزا کی نثروں میں سے بطور نمونے کے کچھ کچھ التقاط کرتے ہیں اور ہمکو امید ہے کہ یہ نمونہ اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے کافی و وافی ہوگا کہ مرزا نے نثرِ فارسی میں بھی اُسی قدر بلند پایہ بہم پہنچایا تھا جیسا کہ نظمِ فارسی میں اُنکو حاصل تھا۔

اگرچہ مرزا کی نثر کو اگلے نامور انشا پردازوں کی نثر پر ترجیح دینا تاوقتیکہ اُسکو دلیل و برہان سے ثابت نہ کیا جائے ایک بے معنی بات ہے لیکن ہمکو اُن لوگوں سے جو وجدانِ صحیح اور

جنبے قبیلۂ آدمی زادگاں	نظر گاہِ پیشین فرستادگاں
کسائی دہ نسلِ آدم بخویش	روائی دہ نقدِ عالم بخویش
بلندی دہ کعبہ بالاے او	گرامی کنِ سجدہ سیماے او
یمن روشن از پرتو روے او	ختن بستۂ چینِ گیسوے او
ز بت بندگی - مردم آزاد کن	جہانے بیک خانہ آباد کن
بمحرابِ مسجد رُخ آراے دیر	بہ اندیشِ خویش و دعا گوے غیر
تو گوئی - ز بس دل ز دشمن ربا ست	کہ سنگِ درش سنگِ آہن ربا ست

"یعنی خوبیاں وند"

نثرِ فارسی مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے اِس بنا پر کہ وہ وزن سے مُعرّا ہے صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جا سکتا ہے ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کی جائے تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً کلیاتِ نظم کا دیباچہ اور خاتمہ، مہر نیمروز کے ابتدائی عنوان، تمام تقریظیں اور دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں، اور مکاتبات کا ایک معتد بہ حصّہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پوئٹیکل نظم و نسق پر مبنی ہے۔

متاخرین میں ابو الفضل، ظہوری، طاہر وحید، اور جلالاے طباطبا بڑے نثار مانے جاتے ہیں۔ مرزا بیدل کی نثر اگرچہ اُنکی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رکھتی ہے مگر وہ بھی اپنی شان اور آن بان میں بےنظیر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لیجائے (اور ضرور

به بند امید استواری فرست | به غالب خط رستگاری فرست

محمد کز آئینهٔ روی دوست | جز اندیش ندانست داناکه اوست

زهی روشن آئینهٔ ایزدی | که در وی نه گنجیده زنگ خودی

ز راز نهان پردهٔ برزده | ز ذات خدا معجزی سرزده

تمنای دیرینهٔ کردگار | بوی ایزد از خویش امیدوار

تن از نور پالوده سرچشمه | دلی همچو مهتاب در چشمه

بهر جام از و تشنه جرعه خواه | بهر گام از و معجزی سر براه

کلامش بدل در فرود آمدن | ز دم جسته پیشی بزود آمدن

خرامش بسنگ از قدم نقش بند | برنگی که نادیده پایش گزند

به پیوستش گشاد قلم نارسا | بکلکش سواد رقم نارسا

کنایه از امی بودن آنجناب ۱۲

دل امیدجای زیان دیدگان | نظر قبله گاه جهان دیدگان

امیدگاه ۱۲

برفتار صحرا گلستان کنی | بگفتار کافر مسلمان کنی

بدنیا ز دین روشنائی دهی | بعقبی ز آتش رهائی دهی

بخوی خوش اندوه کاه همه | بآمرزش امیدگاه همه

ز بس محرم پردهٔ راز بود | بنزدیکی حق سرافراز بود

ز رازی که با وی سرود سروش | صدائیش بود ز اول بگوش

اگر حور در دل خیالش که چه | غم هجر و ذوق وصالش که چه
چه منت نهد ناشناسا نگار | چه لذت دهد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسه ایمنش کجا | فریبد به سوگند دینش کجا
برد حکم و نبود لبش تلخ گوے | دهد کام و نبود دلش کامجوے
نظربازی و ذوق دیدار کو | به فردوس روزن به دیوار کو
نه چشم آرزومند دلاله | نه دل تشنهٔ ماه پرکاله
ازینها که پیوسته میخواست دل | هنوزم همان حسرت آلاست دل
چو پرسش رسد گر بجا ور ز دل | دو صد دجله خونم تراود ز دل
بهر جرم کز روے دفتر رسد | ز من حسرتے در برابر رسد
بفرماے کایں داوری چوں بود | که از جرم من حسرت افزوں بود
هر آئینه چوں سخن را به بند | تلافی فراخور بود بے گزند
بدیں مایه در روز امید و بیم | بگریم بدانساں که عرش عظیم
شود از تو سیلاب را چاره جوی | تو بخشی بداں گریه‌ام آبروی
وگر خون حسرت هدر کرده | ز یاد اش قطع نظر کرده
گذشتم ز حسرت امیدیم هست | سپیدابه روی سپیدیم هست
که البته ایں رند ناپارسا | کج اندیشه گبر مسلماں نما
پرستار فرخنده منشور تست | هوادار فرزانه دستور تست

یعنی قرآن کریم

اگر تافتم رشته گوهر شکست — وگر یافتم باده ساغر شکست

چه خواهی ز دلق مے آلود من — ببیں جسم خمیازه فرسود من

بنا سازگاری ز همسایگاں — بسرمایه جوئی ز بے مایگاں

سر از منت ناکساں زیر خاک — لب از خاکبوس خساں چاک چاک

بگیتی درم بینوا داشتی — دلم را اسیر هوا داشتی

نه بخشنده شاهے که بارم دهد — بهر بار زر پیل بارم دهد

که چوں پیل زاں جا برانگیزمے — ز زرش بر گدایاں فرو ریزمے

نه نازک نگارے که نازش کشم — بهر بوسه زلف درازش کشم

بدیں عمر ناخوش که من داشتم — ز جاں خار در پیرهن داشتم

چه دل زیں هوسها بجوش آیدے — ز دل بانگ خونم بگوش آیدے

هنوزم هماں دل بجوش اندرست — ز دل بانگ خونم بگوش اندرست

چو آں نامرادی بیاد آیدم — بفردوس هم دل نیاسایدم

ولے را که کمتر شکیبد بباغ — در آتش چه سوزی بسوزنده داغ

صبوحی خورم گر شراب طهور — کجا زهره صبح و جام بلور

دم شب رو یهاے مستانه کو — بهنگامه غوغاے مستانه کو

دراں پاک میخانه بے خروش — چه گنجائی شورش ناے و نوش

سیه مستی ابر و باراں کجا — خزاں چوں نباشد بهاراں کجا

اِس مطلب کو اِس طرح ادا کرنا کہ "در آتش بگورم از دست" اور "در پروازِ مورم از دست"
منتہائے بلاغت ہے نشۂ شراب سے جو عارضی نشاط اور اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے اُسکو
پروازِ مور سے بہتر کسی استعارے میں ادا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جس طرح چیونٹی کی پرواز
اُسکی موت کی علامت ہے اِسی طرح نشۂ شراب کا عارضی نشاط آخرکار موجبِ ہلاکت
ہوتا ہے۔

من اندوہگین و مئے اندہ رُبائے — چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے
حسابِ مئے و رامش و رنگ و بوے — ز جمشید و بہرام و پرویز جوے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند — دلِ دشمن و چشمِ بد سوختند
نہ از من کہ از تابِ مئے گاہ گاہ — بہ دریوزہ رُخ کردہ باشم سیاہ
نہ بُتاں سرائے نہ میخانۂ — نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط — نہ غوغائے رامشگراں در بساط
بسا روزگاراں بہ دلدادگی — بیا تو بہاراں بہ بے بادگی
بہار و زباران و شبہائے ماہ — کہ بودہ است بے مے بچشم سیاہ
اُفق ہا پُر از ابرِ بہمن مہی — سفالینہ جامِ من از مے تہی
بہاراں اُدمن در غمِ برگ و ساز — درِ خانہ از بینوائی فراز
جہاں از گُل و لالہ پُر بوی و رنگ — من و حجرۂ و دامنی زیرِ سنگ
دمِ عیش جز رقصِ بسمل نبود — بہ اندازۂ خواہشِ دل نبود

بپرسش مرا وہم افسردہ گیر | پرِ کاہ را صرصرے بُردہ گیر

پس انگہ بدوزخ فرستادہ دان | در آتش خس از باد افتادہ دان

پرسش سے مراد باز پرس قیامت ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے باز پرس سے مستثنیٰ رکھ اور یہ سمجھ لے کہ مجھ سے باز پرس ہو چکی اور ایک پرِ کاہ کو بادِ صرصر اڑا لے گئی اور یہ فرض کر لے کہ میں دوزخ میں بھیجا جا چکا اور ہوا سے ایک تنکا دہکتی آگ میں گر چکا۔

وگر ہمچنیں ست فرجامِ کار | کہ می باید از کردہ راندن شمار

یعنی اگر انجامِ کار یہی ہے کہ اعمال کی باز پرس ہونی ضرور ہے تو۔

مرا نیز یارائے گفتار دہ | چہ گویم بداں گفتہ زنہار دہ

پناہ ۱۲۵

دریں خستگی پوزش از من مجوے | بود بندۂ خستہ گستاخ گوے

یعنی اس خستگی اور مصیبت کی حالت میں جو کچھ میری زبان سے نکل جائے اس پر مجھ سے عذر مت چاہنا کیونکہ خستہ و مصیبت زدہ غلام گستاخ گو اور بیباک ہوتا ہے۔

دل از غصہ خوں شد نگفتن چہ سود | چو ناگفتہ دانی نگفتن چہ سود

زباں گرچہ من دارم آواز تست | بہ تست ارچہ گفتارم آغاز تست

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم | پرستارۂ خورشید و آذر نیم

نکشتم کسے را بہ اہرمنی | نبردم زکس مایہ در رہزنی

مگر مے کہ آتش بگوہرم ازوست | بہنگامہ پرواز مورم ازوست

یعنی صرف مجھ میں ایک عیب ہے کہ میں شراب پیتا ہوں اور اسی سے میری زندگی ہے

گهرهای شهوار پیش آورند / فرو ریده کردار پیش آورند

ز نوریکه ریزند و خرمن کنند / جهان را بخود چشم روشن کنند

بهنگامه با این جگر گوشگان / درآیند مستے بجگر تشنگان

ز حسرت بدل برده دندان فرو / ز خجلت سر اندر گریبان فرو

در آن ناقه من باشم و سینهٔ / ز غمهای ایام گنجینهٔ

در آب و در آتش بسر برده / ز دشوارے زیستن مرده

تن از سایهٔ خود به بیم اندرون / دل از غم بسا دود و نیم اندرون

ز ناسازی و ناتوانی بهم / دم اندر رگ آتشش نپویدم

ز بس تیرگیهاے روز سیاه / نگه خورده آسیب دوش از نگاه

ز بخشایش برناکسی هاے من / تهیدست دور مانده ام واے من

بدوشش برانداز مست بار من / نسنجیده بگذار کردار من

بکردار سنجی مسنزاے سنج / گران باری درد و غم را بسنج

که من با خود از هرچه سنجد خیال / ندارم بغیر از نشان ملال

اگر دیگران را بود گفت و کرد / مرا مایهٔ عمر رنج ست و درد

چه پرسی چو آن رنج و درد از تو بود / غمے تازه در هر نورد از تو بود

فرومانده حسرت تمیز من ست / دم سرد من زمهریر من ست

مبادا بگیتی چو من هیچکس / جحیمی دل و زمهریری نفس

اگر دیوساریست بیهوش و هنگ | که همواره پیکر تراشند ز سنگ

دیوسار یعنی گمراه ۱۲

به بت سجده زاں رو روا داشته | که بت را خداوند پنداشته

وگر خیره چشمیست نیر پرست | به وردِ مے از جامِ اندیشه مست

بهرش ازاں راه جنبیده مهر | کزیں روزنش دوست بنموده چهر

یعنی بخورشید ۱۲

ز تاری درونانِ اهریمنی | گروهے بود کز خرد دشمنی

زبس دادِ ناآشنائی دهند | به آتش نشانِ خدائی دهند

به تن ها به آذر گرایش کناں | به دلها خدا را نیایش کناں

گروهے سراسیمه در دشت و کوی | خداوند جوی و خداوند گوے

ز رسمے که خود را براں بسته اند | بیزداں پرستی میاں بسته اند

ز مهرے که بنجواست در دل بود | پرستند حق گرچه باطل بود

نظرگاهِ جمعے پریشاں یکیست | پرستنده انبوه - و یزداں یکیست

کدامی کششگاں ازاں سوی نیست | بد و نیک را جز بوی روی نیست

جهاں چیست ؟ آئینهٔ آگهی | فضاے نظرگاهِ وجه اللّهی

بهر سو که رو آوری سوی اوست ؟ | خود آں رو که آوردهٔ روی اوست

از مناجات

به ورزشے که هر دم شوند انجمن | شود تازه پیوندِ جانها به تن

رواں را به نیکی نوازندگاں | به سرمایهٔ خویش نازندگاں

جگر را ز خونابه آشام ده | نفس را به بیتابی آرام ده
شناسندگان را بجو رهنمای | هراسندگان را غم از دل ربای
نفسها بسودای او ناله خیز | جگرها بصحرای او ریزه ریز
رگ ابر را اشکباری از وست | دم برق را بیقراری از وست
زبانهای خاموش گویای او | نهانهای اندیشه پیدای او
خرد را که جوید شناسائیش | نگه خیره در برق پیدائیش
دوئی بی کفن مرده در رهش | خودی دادگر تشنهٔ درگهش

❊ ❊ ❊

زهی هستی محض و عین وجود | که نازد به یکتائیش هست و بود
ز شاخابه کز قلزمی سر دهد | بهر تشنه آشام دیگر دهد
بیک باده بخشد ز پیمانهٔ | بهر ذره رقصی جداگانهٔ
جهانی ز طوفان بقعر آب در | هنوزش همان چین بگرداب در
گروهی ز مستی بغوغا درون | هنوزش همان می به مینا درون
اسیرش ز بندی که بر پای اوست | شناسد که بر تخت چین جای اوست
شهیدش بجوشش از طرب بهره مند | بجز چشم زخمش نباشد گزند

❊ ❊ ❊

بهر لب که جوئی نوائی از وست | بهر سر که بینی هوائی از وست

نگه را که بیرون نباشد ز چشم — دهد بال پیدائی مهر و خشم

دل دوست با هم گره دوخته — درین کیسه کردار اندوخته

یعنی در کیسه که از هم دوختنِ دلِ دوست بهم رسیده - کردارِ مردم اندوخته است ۔

روان و خرد با هم آمیخته — ازین پرده گفتار انگیخته

نه زین سو گهر باشمردن توان — نه راه اندرین پرده بردن توان

+ + + + + + + +

به نیروی نه چرخ برهم زدن — نشاید ز دانستِ او دم زدن

یعنی بقوتے که ازان نه چرخ را برهم میتوان زد از معرفتِ الٰهی دم نمیتوان زده

گروہے به بندِ گهر یافتن — فرو بسته دل در زمین کافتن

یکے را دم تیشه بر کان نخورد — یکے ره به نایاب گوهر نبرد

خرد کز جهانے ست بینشش خبر — نباشد ز عنوانِ خویشش خبر

نه بیند جز این هیچ بیننده — که مارا بود آفریننده

نگارنده پیکرِ آب و گل — شمارنده گوهرِ جان و دل

به گردش در آرنده نه سپهر — به گردون برآرنده ماه و مهر

روان را بدانست سرمایه ساز — زبان را بگفتار پیرایه ساز

بشاهی نشاننده خسروان — ز رهزن رهاننده رهروان

بدانش براندیشِ فرزانگان — به مستی نگهدار دیوانگان

نہیں پہنچی، صرف دیباچہ کے چند عنوان لکھنے پائے تھے کہ مکروہات روزگار نے گھیر لیا مگر یہ مثنوی انکی تمام مثنویوں میں ممتاز ہے اور ہم اسی مثنوی کے کچھ اشعار توحید میں سے اور کچھ اشعار مناجات میں سے جو نہایت آزادانہ اور رندانہ طور پر لکھی ہے اور کچھ نعت میں سے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

از توحید

سپاسے کزو نامہ نامی شود — سخن در گزارش گرامی شود
سپاسے کہ شوریدگانِ الست — دہندش بہ بانگِ قلم دل ز دست
سپاسے بہ پوزش در آمیختہ — ز دل جستہ و با دل آویختہ
سپاسے ز بوئی سوزِ کثرت رُباسے — سپاسے دل افروزِ بینش فزاسے
خدا را سزد کز درون پروری — بدیں شیوہ بخشندہ شناساوری
خدائے کہ زاں گونہ روزی دہد — کہ ہم روزی و ہم دو روزی دہد

ـــــــــــــــــــــ
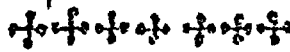
بجنا جوئے ہر دل کہ در ویش ہست — ہوا خواہِ ہر رُخ کہ گر دیش ہست
ز بخشد ز انبوہِ خواہندگاں — نیاید ستوہ از نیاہندگاں
خرد جنسِ ہستی فروشندگاں — دہد مزدِ بیہودہ کوشندگاں
ز باید دل آنانکہ دل دادگاں — کشد ناز لیکن ز افتادگاں
ز بادے کہ بردل وزد در نہفت — زباں را بہ پیدا در آرد بگفت

نظیری

سرسبز از دعاے ثنا گستر تو باد

کارش بہ حسنِ شاہد فرخندگی بود

ہر چند بر تو مرگ - بر و زندگی بود

اِس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں افسوس ہے کہ اِسوقت کتاب کے چھپنے کی جلدی میں ہمکو اِس قدر مہلت نہیں ملی کہ کلیات نظیری کے صحیح نسخہ کے ملنے کا انتظار کیا جاتا اور بعد کامل اطمینان کے اُسکے ترکیب بند میں جو اشعار حل طلب تھے اُنکی شرح کیجاتی جس سے ناظرین کو دونو ترکیب بندوں میں موازنہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ اگر اِس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی تو بشرطِ زندگی اِس نقصان کی تلافی کی جائے گی ؂

اب ہمکو مرزا کی کلیات نظم فارسی میں سے صرف مثنوی کا نمونہ دکھانا باقی رہ گیا ہے - اگرچہ پہلے حصّے میں کہیں کہیں مختلف مثنویوں سے کچھ کچھ اشعار مقتضاے مقام کے موافق نقل ہو چکے ہیں مگر نمونے کے طور پر یہاں بھی ایک دو مقام کسی مثنوی کا دکھانا مناسب معلوم ہوتا ہے - مرزا نے کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی اُنکے کلیات میں گیارہ مثنویاں ہیں جنمیں سب سے بڑی مثنوی ۹۲۰ بیت کی ہے اِس مثنوی میں - جسکا نام مرزا نے ابر گہربار رکھا تھا - اُن کا ارادہ آنحضرت صلعم کے غزوات بیان کرنے کا تھا مگر چونکہ یہ اُنکی آخری تصنیف تھی اور اخیر عمر میں طرح طرح کے عوائق اور موانع پیش آنے اِس وجہ سے غزوات کے شروع کرنے کی نوبت

غالب

در نوحه شاعری مکنید از من التماس
در پرده سنجی از دم خویشم رسد گزند
(نغمه سنجی ۱۲)
در رهروی ز سایهٔ خویشم بود هراس
من میهمان و چرخِ سیه کاسه میزبان
دُردی خورِ بلاکم و تلخابه نوشِ یاس
باقی نمانده اشک چه گریم به های های
از کار رفته دست چه بر تن درم لباس
سر حلقهٔ پلاس نشینانِ ماتم
اندوهِ همرهانِ شه از خود کنم قیاس
چون بود در بزمِ ماتمِ شهزاده بے خروش
من دم زدم ز تلخ نوائی بریں پلاس
از نوحه عرضِ لطفِ سخن میتوان گرفت
غالب سخن سرائی و شیفته سخن شناس
یارب جهان ز فیضِ تو با برگ و ساز باد
عمرِ ابوظفر شهِ غازی دراز باد

نظیری

رسم العمل به روزِ جزا دفترِ تو باد
فردا که روزِ حشر برانگیزی از زمیں
دوش و کنارِ حور و پری بسترِ تو باد
روزی که کارها همه موقوفِ حق شود
جبریل کارساز و خدا یاورِ تو باد
وقتِ سوال گوش و لبِ منکر و نکیر
پُر از قبولِ نکتهٔ جاں پرورِ تو باد
آں حلّه که آدم از و ز آلِ وی قدر یافت
گر رحمتِ دو کون نبود در برِ تو باد
مجموعهٔ عمل چو به محشر در آورے
کارِ تو راست همچو خطِ مسطرِ تو باد
مغز از بخورِ روی عمارت معطر ست
بوسے بہشت ہم نفسِ مجمرِ تو باد
آدم بہاے تو نشناسد دریں جہاں
تسبیحِ قدسی در دلِ کانِ گوہرِ تو باد
نخلِ ریاضِ ملک که با بیخِ عزیز تست
(نسخه بیخ عزیز قست ۱۲)

غالب

بے باغ و قلعہ و لبِ دریا چگونۂ
بعد از تو شاہ خیلِ ترا بر قرار داشت
اینجا عزیز بودہ ام آنجا چگونۂ
اے بعدِ مرگ راتبہ خوارِ تو عالمے
پروانۂ چراغِ مزارِ تو عالمے

نظیری

اے بخت خوش بخوابِ پریشاں چگونۂ
اینجاست کارِ دفتر و دیوان عمر ربود
آنجا بگو ز پرسشِ دیوان چگونۂ
قلزم سبک ثبات ترا آنجا ز شبنم است
در بحرِ کل تو قطرۂ باراں چگونۂ
بشنو کہ بانگ بہرِ تو بر حشر می زنند
تا بنگریم در صفِ دوراں چگونۂ
چوں کارِ رفتگانِ دگر نیست کارِ تو
محشر شتاب میکند از انتظارِ تو

اِس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں۔ نظیری کا یہ بند اُسکے تمام ترکیب بند کی جان ہے اگرچہ مرزا کے ہاں اِس بند میں نظیری کے برابر بلند شعر نہیں ہیں مگر مرثیت کا رنگ نظیری سے بڑھکر پایا جاتا ہے۔

بندِ ہفتم

غالب

گفتار را بنوحہ گری چیدہ ام اساس

نظیری

فردا کلاہِ پادشہی بر سرِ تو باد

---

* خاندانِ تیموریہ میں دستور تھا کہ خاص پادشاہ کی اولاد میں سے جب کوئی شاہزادہ مرجاتا تھا تو اُسکی تنخواہ اور نوکر چاکر اور اُسکی سرکار بدستور بنی رہتی تھی ۱۲

زیبائی و جوانی فرخندہ شاہ چیست	خون ست بے تو گرہمہ آہن دلِ من ست
آں نو نہالِ سروِ قدِ کجکلاہ چیست	ہر دل کہ بے تو خوں نشود سنگ و آہن ست

اگرچہ یہ دونو بند اپنی اپنی جگہ نہایت بلیغ ہیں مگر متانت و جزالت کے لحاظ سے نظیری کا پلہ غالب معلوم ہوتا ہے ۔

بندِ ششم

غالب	نظیری
اے رہ نوردِ عالمِ بالا چگونۂ	اے شاہِ مصر دور ز کنعاں چگونۂ
ما بے تو در ہجومِ تو بے ما چگونۂ	اے یوسف از جدائیِ اخواں چگونۂ
از سایہ در غمِ تو سیہ پوش شد ہما	ہر گاہ جلوہ کردہ تقاضا چہ میکنی
اے خفتہ در نشیمنِ عنقا چگونۂ	با حسنِ شوخ در تہ زنداں چگونۂ
زاں پس کہ با تو آبِ ہوایِ جہاں نساخت	اسکندر از غمِ تو بظلمت نشستہ است
در روضۂ جناں بہ تماشا چگونۂ	در زیرِ گل تو چشمۂ حیواں چگونۂ
با گلرخانِ دہر وفائے نداشتی	اے پارۂ ز جان و جگر گوشۂ پدر
با حوریانِ آئنہ سیما چگونۂ	گشتہ جدا ز دیدہ و داماں چگونۂ
ما ہیچو داں بخلوتِ ماتم نشستہ ایم	ما بارے از فراقِ تو در خون دیدہ ایم
از خویشتن بگو سے کہ تنہا چگونۂ	تو در میانِ روضۂ رضواں چگونۂ
بے مطرب و ندیم و غلامانِ خرد سال	آوازِ نوحہ طبع و دل آشفتہ می کند

لے گیا ہے جیسا کہ اصحابِ ذوق پر پوشیدہ نہیں ہے۔

بند پنجم

غالب	نظیری
دستے ست ای سپہر ترا در ستمگری	رفتی و کارہا ہمہ درہم گذاشتی
بارے برم ز جورِ تو پیشِ کہ داوری	آشفتگی بہ مردمِ عالم گذاشتی
نیرنگ سازِ چرخ کہ بیداد خوی اوست	جانہای غم رسیدہ و دلہای بیقرار
باگل کند سمومی و با شاخ صرصری	در پیچ و تابِ طرۂ پرچم گذاشتی
داغم ز روزگار کہ شہزادہ برنخورد	از تو غبار بر دلِ بیگانہ نہ بود
از خوبی و جوانی و فرخندہ گوہری	بہر چہ بر دلِ پدر این غم گذاشتی
حیف ست مردنش کہ در ایام کودکی	روز و شبت برسمِ جنیبت ستادہ بود
بود اوستادِ قاعدۂ بندہ پروری	در زینِ خویش اشہب و ادہم گذاشتی
شہ در دہ و دو سالگیش کردہ کدخدا	شمع مزار و خشتِ لحد ساختی قبول
با فرِ خسروانی و فرتابِ قیصری	رخسارِ تخت و طرۂ دیہیم گذاشتی
ناگاہ روزنامۂ عمرش دریدہ شد	ہمت ترا بہ ملک نیاورد سر فرو
امضا پذیرنا شدہ توقیعِ شوہری	عالم بہر کہ خواست مسلم گذاشتی
جز نو عروسِ صاحبِ عالم نیافتند	حرمت نگاہ داشتی و جای خویش را
دوشیزۂ کہ بیوہ کنندش بد اختری	بہ برادرانِ مقدم گذاشتی

علم ۱۲

اینی بجہانگیر ۱۲

غالب	نظیری
گردے بدل نشست و غبارے بدیدہ ماند	شد بزم تیرہ - پردہ ازاں رخ بر افگنید
بستانیاں بماتمِ شہزادہ بیخود اند	شمعے کہ دہر روشن ازو بود - مردہ است
زیں رو بود کہ پیرہنِ گل دریدہ ماند	پروانہ را برید و بخاکستر افگنید
خوں گشت و در دل و جگرِ دوستاں فتاد	در خانہ آتش ز حلقۂ ماتم حرام نیست
آں بادہ ہائے ناب کزو ناکشیدہ ماند	ایں حلقہ را ز صحنِ سرا بر در افگنید
در مدحِ شاہزادہ سخن ہائے دلپذیر	ریحانِ جلوہ یاسمنِ عشوہ ریختہ
دردا کہ ہم نگفتہ و ہم ناشنیدہ ماند	چینید و ہم بر آں قدِ جاں پرور افگنید
در وادیِ عدم نتواں رفت با حشم	بالیں ز تابِ کاکلش آشفتگی کشید
ماند آنچہ بود و صاحبِ عالم جریدہ ماند	کوتہ کنید و عسر بدہ در کشور افگنید
زاں گلبنے کہ صرصرِ مرگش ز پا فگند	رفت آں سرے کہ تاج باو سرفراز بود
خارے بیادگار بدلہا خلیدہ ماند	برسر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید
اخلاقِ شاہزادہ بود دلنشینِ خلق	پوشید چند جامۂ نیلی ز جورِ چرخ
بوئے ازاں شگفتہ گلِ نو رسیدہ ماند	بر آفتاب جامۂ نیلوفر افگنید
آں سروِ سایہ دار کہ بارش نبود - کو؟	خیزید تا بآں سرِ تابوت دم زنیم
واں نو گلِ شگفتہ کہ خارش نبود - کو؟	عرضے کنیم و کارِ وداعش بہم زنیم

اس بند میں مرزا کا بیان صفائی اور سادگی اور لطافت میں نظیری کے بیان سے سبقت

غالب

اے اہلِ شہر مدفنِ این دودماں کجاست؟
خاکم بفرق۔ خوابگہِ خسرواں کجاست؟

نظیری

کس را سرودِ در خورِ این تعزیت نبود
پیدا کنید کا وّلِ این داستاں کجاست
خلقے بشیون اند و نگویند حال چیست
صبرِ سخن شنیدن و تابِ بیاں کجاست
آفاق در مصیبتِ او ممتحن شدہ
این مرگ باعثِ الم مرد و زن شدہ

اِس بند میں نظیری نے برخلاف پہلے بندوں کے دو شعر زیادہ کر دیئے ہیں نظیری کا بند بلاغت میں شاید مرزا کے بند سے کسی قدر فائق ہو مگر مرزا کے بین نہایت دل خراش ہیں متوفی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکا ہے اور راہ میں بہت خطرے ہیں اُسکو جانے سے رُوکو وہ جو کچھ مانگے اُسکو دو اور جو بہانہ مناسب سمجھو وہ کرو اور اگر سیدھی طرح وہ کہنا نہ مانے تو اُسکو سختی سے سمجھاؤ اور اگر یوں بھی کام نہ نکلے تو روؤ اور پیٹو اور کپڑے پھاڑو اور چیناں کرو اور چنیں کرو اور بادشاہ کو اطلاع کئے بغیر تابوت مرقد کی طرف لیجاؤ۔ یہ تمام پیرائے بیان کے نہایت مؤثر اور دل خراش ہیں اور گرہ کا شعر سارے بند کا نچوڑ ہے۔

بند چہارم

غالب

زاں سبزِ خط کہ بر رُخِ او نادمیدہ ماند

نظیری

غم تنگ است۔ در پیالہ می از ساغر افگنید

جس رتبے کا ہے ایسا کوئی شعر غالب کے بند میں نہیں ہے۔

بند سوم

غالب	نظیری
اے قوم ا خویش را بشکیب امتحاں کنید	اے بزم تیرۂ آں رخ چوں ارغواں کجاست
ایں کار را بشیوۂ کار آگہاں کنید	وے رزم درہمی ! آں شہ گیتی ستاں کجاست
طفل ست شاہزادہ و دررہ خطر بسی ست	شوق سجود و حرمت تعظیم کمتر ست
منعش ز عزم رہروی آنجہاں کنید	آں ناز صدر و سرکشی آستاں کجاست
از میوہ و گل آنچہ دلش خواہد آں دہید	امروز غم بہ مسند شاہی نشستہ است
از حیلہ آنچہ رای شما باشد آں کنید	پہلو نشین خسرو ہندوستاں کجاست
ہر حرف دل نشیں کہ بگوئید و بشنود	آں حکم ہا کہ بود از و آب کار کو ؟
آں گفتہ را بعبرہ بہ خاطر نشاں کنید	واں کار ہا کہ آمد از و بوی جاں کجاست
ور خود ز رفتنش نتوانید باز داشت	دلہا پر از غم ست . عزیزاں چہ واقع ست
بیخود شوید و جامہ درید و فغاں کنید	یک دل شگفتہ نیست خوشی در جہاں کجاست
گیرید دشنہ در کف و ہم بر جگر زنید	ہر جا بسوگ مرگ گروہے نشستہ اند
تا سینہ را ز دیدہ فزوں خونچکاں کنید	زیں غم کہ عام گشت ندانم اماں کجاست
زنہار پیش شاہ مگوئید و بجنبید	برگ و شگوفہ ریخت - ثمر از کجا خورم
تابوت را بجانب مرقد رواں کنید	بشکست شاخ و برگ - مرا آشیاں کجاست

غالب	نظیری
شاہِ سخن سرائے سخنور نواز را	عیشے پر اضطراب - چہ جای تمکن ست
در بزمِ عیش نوحہ سرا کرد روزگار	دہرے پر انقلاب - چہ جای اقامت ست
شاخے کہ بود موسمِ آتش کہ بر دہد	ایں ماتم کسے ست کہ از گریہ تا بحشر
از نخلِ عمرِ شاہ جدا کرد روزگار	بر جیبِ صبح و دامنِ شبہا علامت ست
مرگ ایں چنیں برخ و تنِ نازک ندیدہ بود	خوں میکند بجلوہ دلِ خلق - گوئیا
کامِ اجل بہدیہ روا کرد روزگار	نخلِ جنازہ رستہ ازاں نخلِ قامت ست
شہزادہ خرد سال و بود روزگار پیر	ہر کس چنیں جمال درآرد بحشرگاہ
شوخی بشاہزادہ چہ سر کرد روزگار	رضواں [مبتدا۱۲] گرش بہشت دہد در غرامت ست [خبر۱۲]
فرزندِ پادشہ نشناسد معانقہ	دل از نویدِ صحبتِ او بزمِ سور بود
آغوشِ گور بہرِ چہ وا کرد روزگار	اکنوں سرائے ماتم و کوی ملامت ست
اے آں کساں کہ خاکِ رہِ شہریار را	یاراں! عجب تبہ کاری از دست دادہ ایم
توجیہ آبروے شما کرد روزگار	بر سر زنید دست کہ وقتِ ندامت ست
ہرچند بے اجل نتواں ہیچ گاہ مرد	شہبازِ ما پریدہ رہِ آسماں گرفت
آتش بجو و زنید کہ فرخندہ شاہ مرد	مرغے نرفتہ است کہ دیگر تواں گرفت

یہ دونو بند سادگی اور مرثیت میں تقریباً برابر سرابر ہیں۔ البتہ نظیری کے بند کا چوتھا شعر

؎ یہ اشارہ ہے اس دستور کی طرف کہ خاندانِ تیموریہ کے سلاطین اور شاہزادے کسی سے معانقہ نہیں کرتے تھے ۱۲

نظیری	غالب
دستِ اجل بہ تیغِ سیاست بریدہ باد	اے نوبہار چون تنِ بسمل بخون بغلط
از خاک مُہر بر دہنِ تنگ میزنند	اے روزگار چون شبِ بے ماہ تار شو
آرایشِ جنازہ و دستار میکنند	اے ماہتاب روی بہ سیلی کبود کن
گوئی کہ گل برافسر و اورنگ میزنند	اے آفتاب داغِ دلِ روزگار شو
ایں چرخِ شوخ دیدہ عجب بے بصارت است	اے فتنہ بادِ صبح وزید- ایں قدر مخسپ
بر جامِ عشرتِ کہ؟ چنیں سنگ میزنند	اے رستخیز وقت رسید آشکار شو
فرزندِ شاہ اکبرِ والا نژاد مُرد	آہ ایں چہ سیل بود کہ مارا ز سر گذشت
شیون برآورید کہ سلطان مراد مُرد	تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گذشت

مرزا کے بند میں الفاظ بہت پرشوکت و شاندار واقع ہوئے ہیں اور کوئی شعر صنعتِ شاعری اور شاعرانہ نزاکت سے خالی نہیں ہے مگر واقعہ کی عظمت جس قدر کہ بیان ہونی چاہیے تھی اس سے بمراتب زیادہ ظاہر کی گئی ہے بخلاف نظیری کے کہ اسکا بیان اگرچہ پھیکا معلوم ہوتا ہے مگر متانت اور اعتدال کا سررشتہ اسنے کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بند دوم

نظیری	غالب
آفاق پُر ز تیغ و جہاں پُر ندامت است	بگذر کہ بر من و تو جفا کرد روزگار
ایں روزِ مرگ نیست کہ روزِ قیامت است	با پادشاہِ عہد جفا کرد روزگار

مرزانے بھی مرحوم بہادر شاہ کے بیٹے فرخندہ شاہ کا۔ جو عین نشو و نما کے زمانے میں فوت ہوگیا تھا۔ مرثیہ اُسی بحر کے ترکیب بند میں لکھا ہے جو مرزا کے کلیات میں موجود ہے۔ چونکہ دونو ترکیب بند تیموری شہزادوں کے مرثیہ میں لکھے گئے ہیں اور دونو کا وزن متحد ہے اور ہر ایک میں سات سات بند اور دونو کا ہر ایک بند آٹھ آٹھ بیت کا ہے اس لئے ہم یہ دونو نظمیں مقابل یکدگر لکھے دیتے ہیں تاکہ ہر شخص جو فارسی شاعری کا مذاق صحیح رکھتا ہے دونوں میں باسانی موازنہ کر سکے۔ مگر افسوس ہے کہ کلیات نظیری کا کوئی صحیح نسخہ ہمکو دستیاب نہیں ہوا لہذا جیسا کچھ لکھا ہوا پایا نقل کر دیا گیا ہے چنانچہ پہلے بند کے بعض شعر بالکل سمجھ میں نہیں آئے جنکی نسبت ظن غالب یہ ہے کہ ان میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے۔

نظیری	غالب
لب خوش نگشتہ خندہ دردِ خیگ میزند	ایدل بجنبشم زجنبشم حوادث فگار شو
در بزم مرگ خندہ بر آہنگ میزند	اے چشم از ترا وشِ دل اشکبار شو
ہرگز زمانہ جامۂ ماتم بروں نکرد	اے خوں بدیدہ درد گدازِ جگر فرست
تا رفتہ شب بدامنِ شب چنگ میزند	اے دم بسینہ دودِ چراغ مزار شو
وقتِ گذشتہ را بتاسف زپے مرو	اے لب بنوحہ نالۂ جانکاہ سازدہ
کانجا نشاط گام بفرسنگ میزند	اے سر بغصہ خاکِ سرِ رہگذار شو
ایں دہر روز کور کش ایام خصم باد	اے خاک اچرخ گرنتواں زد زجا درآے
دستِ طمع بگیسوی شبرنگ میزند	اے چرخ اخاک گرنتواں شد غبار شو

گشاده در سر این رشته عقده - ورنه | نه مرده تو - و نے رازق العباد بخیل
ز چند سال بمرگ تو تباہی رزق | شدست حکم خود از پیشگاہ رب جلیل
فرشته که میکیل ہست بر خزائنِ رزق | نکرد ہیچ توقف به رزق در تعطیل
(یعنی در تعطیل رزق توقف نکرد)
دوم فرشته که یادش بخشم مقرون باد (یعنی ملک الموت ۱۲) | روا نداشت در اہلاک شیوه تعجیل
لطیفه گفتم از قولِ شاعرے تضمین | که در لطیفه مرا ورا کسے نبود عدیل
"اگر خداے بداند که زنده تو ہنوز | ہزار مشت زند بر دہانِ عزرائیل" (ملک الموت)

به آدم نزل - بشیطان طوق لعنت | سپردند از ره تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم | گران تر آمد از طوقِ عزازیل

اب ہم مرزا کی ایک نظم کا مقابلہ دورۂ اکبری کے ایک نہایت ممتاز اور نامور شاعر کے کلام کے ساتھ کرتے ہیں - مرزا کے قصائد و قطعات و مسمطات وغیرہ میں صرف ایک نظم ایسی ملی ہے جسکا مولانا نظیری نیشاپوری کی نظم سے بخوبی مقابلہ کیا جا سکتا ہے . نظیری نے جلال الدین اکبر کے بیٹے سلطان مراد کا جو عنفوانِ شباب میں گذر گیا تھا ایک مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے جو اُسکے کلیات میں موجود ہے اور چونکہ نظیری کو اُسکے ساتھ نہایت خصوصیت تھی اور اُسکی شان میں نظیری نے متعدد قصیدے لکھے ہیں اور گراں بہا صلے اُنکے جلدو میں پائے ہیں اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ نظیری نے اُسکا مرثیہ کمالِ صدقِ دل سے لکھا ہے .

قطعات

هزار معنیِ سرجوش خاصِ نطقِ من ست | کز اہلِ ذوقِ دل - وگوی از غزل بُرد ست
ز رفتگاں بہ یکے گر توارد م رو داد | مداں کہ خوبیِ آرایشِ غزل بُرد ست
مراست ننگ و لے فخرِ اوست کاں بہ سخن | بسعیِ فکرِ رسا - جا بداں محل بُرد ست
مبر گمانِ توارد - یقیں شناس کہ دزد | متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل بُرد ست

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار | ساقی و مغنّی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند | حق را بسجودے - و نبی را بدرودے

اے کہ خواہی کہ بعد ازیں باشم | مخلصِ صادق الولاے تو من
گر ترا شیوہ شاہدی بودے | کردمے جان و دل فداے تو من
ور ترا پیشہ شاعری بودے | سُودمے چشم و سر بپاے تو من
ور ترا پایہ خسروی بودے | سُفتمے گوہرِ ثناے تو من
چوں ازینہا نہ - مرا چہ ضرور | کہ شوم ہرزہ مبتلاے تو من
راست گویم - بہانہ چند آرم | ناصحِ مشفقم براے تو من
بسکہ بر مال و جاہ مغروری | نیستم خوش ازیں اداے تو من

چوں بغیر از عمر کاں مفتست ہیچم مایہ نیست | نبود م ہیم زیاں گر چرخ کج باز د بمن
بر تنش دستے تواند بود - زاں بالاترم | دل بنازم - شیر گردوں پنجہ گر یاز د بمن

پہلے مصرع کی تقدیر عبارت یہ ہے "من ازاں بالاترم کہ فلک را بر من دستے تواند بود" شیر گردوں سے مراد خود گردوں یا برج اسد یا مریخ - پنجہ یازیدن دست دراز کردن و حملہ نمودن - دل باختن بدحواس شدن -

ہر کرا گردوں بلند آوازہ تر خواہد بدہر | نوبت شاہی دہد و آنگاہ بنواز د بمن

بنواز د بمن - یعنی اسکو میرے ذریعے سے معزز کرتا ہے دوسرے شعر میں اسکی تشریح ہے -

پادشاہاں را سخن گفتن نہ کار ہر کس ست | دیدہ ور شاہے کہ کار گفتن انداز د بمن
ور تو گوئی پادشہ را مایہ نبود - ہیچ نیست | خود بشاہاں مایہ بخشم گر بپرداز د بمن
آنکہ چوں در ملک ہستی سکۂ شاہی زند | سکۂ شاہی بطغرائے یداللٰہی زند

قولہ "پادشہ را مایہ نبود" اس سے یا تو یہ مراد ہے کہ سلاطین عہد اس قدر مایہ نہیں رکھتے کہ میرے کمال کے موافق میری قدر کریں ؟ اور یا یہ مطلب ہے کہ بہادر شاہ مرحوم جو اس زمانے میں مرزا کے ممدوح اور پادشاہ کے لقب سے ملقب تھے وہ گردش روزگار سے بے مایہ ہیں - قولہ "گر بپرداز د بمن" بپرداز د کا فاعل دوسری بیت میں واقع ہوا ہے یعنی "آنکہ چوں در ملک ہستی الخ" مراد اس سے حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ ہیں جنکی منقبت میں مرزا نے یہ ترکیب بند لکھا ہے ہو - رسول اللہ کے داماد ہے صلو وسلم علیہ

سختی اور مصیبت کا کھینچنے والا ہے کہتا ہے کہ نہ میں علم سے کامیاب ہوں اور نہ سختی اور مصیبت سے گھبرانے والا ہوں تو گویا مشتری اور زحل دونوں کی کوششیں میرے باب میں رائگاں جاتی ہیں اور اسلئے میں ان دونوں سے شرمندہ ہوں۔

رفتہ مسکیں را ز یاد و گنج پنہانش منم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ در لئیمی شہرۂ دہر از تہیدستیست چرخ

کہتا ہے کہ آسمان جو لئیمی اور بخل میں مشہور ہے یہ اسکی تہیدستی کا نتیجہ ہے کیونکہ اسکے پاس دینے کو کچھ باقی نہیں وجہ یہ کہ اسکا گنجینۂ پنہاں میں تھا سو وہ اپنے خزانے کو یعنی مجھکو بھول گیا ہے۔ مسکیں سے مراد خود آسمان ہے جیسے اردو میں کہتے ہیں کہ غریب اپنا خزانہ کہیں رکھکر بھول گیا۔

خوردہ ام از شست غم تیر کہ پیکانش منم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ در غریبی خویش را از غصہ در دل می خلم

یعنی عالم غربت میں بسبب غم کے میں خود اپنے دل میں چبھتا ہوں گویا غم کی چٹکی سے وہ تیر میرے آکر لگا ہے کہ خود میں ہی اس تیر کی بھال ہوں۔

خانہ دارم کہ پندارند دربانش منم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ماندہ ام تنہا بکنج از دورباش پاس وضع

دورباش۔ ہٹو بچو کی آواز کو کہتے ہیں جو نقیب امرا و سلاطین کی سواری کے آگے آگے پکارتے جاتے ہیں۔ مگر شعرا اسکو اکثر مطلق روک ٹوک اور ممانعت و مزاحمت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کہتا ہے کہ پاس وضع مجھکو گھر کے کونے سے کہیں باہر نہیں جانے دیتا پس میری اپنے گھر پر ایسی مثال ہے کہ گویا اسکا درباں میں ہی ہوں۔

پائے من جز بہ چشم من نیاید در نظر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

از بند چہارم

دیکھا۔ مطلب یہ کہ یہ تمام نظر فریب سیمیائی جلوے تھے جنکو محض وہم نے اختراع کیا تھا اور اسی لئے صبحِ صادق اُنپر خندہ زن تھی۔ اِسکے بعد بند کو اِس گرہ کے شعر پر ختم کرتا ہے اور کہتا ہے۔

محرمِ رازِ نہانِ روزگارم کردہ اند   تا بحرفم گوش ننہد خلق خوارم کردہ اند

کہتا ہے کہ اگرچہ مجھکو زمانے کے پوشیدہ اسرار کا محرم بنایا ہے، مگر اس لئے کہ کوئی میری بات نہ سُنے اور پوشیدہ راز ظاہر نہونے پائیں مجھکو دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا ہے۔

ازبندِ سوم

روشناسِ چرخ در جمعِ اسیرانش منم   نورِ چشمِ روزنِ دیوارِ زندانش منم

کہتا ہے کہ آسمان کے مظلوم اسیروں میں اُسکا روشناس اور پہچاننے والا صرف میں ہوں؛ گویا میں اُس زنداں کے روزنِ دیوار کی جسمیں آسمان کے مظلوم قیدی اسیر ہیں۔ آنکھ کا نور رہوں۔

ثابت و سیارِ گردوں از رصد بستم بعلم   رشتۂ تسبیحِ گوہرہای غلطانش منم

چونکہ رصد باندھنے سے اکثر ستارے منتظم ہو جاتے ہیں اس لئے کہتا ہے کہ میں نے جو آسمان کے ثوابت و سیارات کی رصد باندھی ہے تو گویا میں اُسکے گوہر ہاے غلطاں (یعنی کواکب) کی تسبیح کا ڈورا ہوں جسکے سبب سے تمام ستارے مثل دانہاے تسبیح کے منتظم ہو گئے ہیں۔

نے ز دانش کامیابِ فیِ ز فیروزی بخت (؟) سنگدل   شرمسارِ کوششِ برجیس و کیوانش منم

اہلِ نجوم کے نزدیک برجیس یعنی مشتری علم کا افاضہ کرنے والا ہے اور کیواں یعنی زحل

کہ ایسا سویرا تھا کہ پھولوں کی خوشبو کا قلم ابھی گردش میں نہیں آیا تھا کہ میں نے فیضِ سحر کا مکتوب جسکا ابھی سرنامہ نہیں لکھا گیا تھا دیکھا۔ مطلب یہ کہ فیضِ سحر ابھی عام ہوا تھا اور پھولوں کی خوشبو سے باغ مہکنے نہیں پایا تھا۔

شانۂ بادِ سحر گاہی بجنبش نامدہ   طرۂ سنبل ببالیں پریشاں دیدہ ام

اس بیت میں بادِ سحر گاہی کو کنگھی فرض کیا ہے جسکے ملائم جھونکوں سے گویا سنبل کی زلف سلجھ جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ابھی شانۂ نسیمِ صبح کو جنبش نہیں ہوئی تھی اور طرۂ سنبل بالینِ راحت پر پریشان پڑا ہوا تھا۔

باد سرمستانہ می جنبید و شبنم می چکید   غنچہ را در رختِ خواب آلودہ دامان دیدہ ام

یہ اُس حالت کے بعد کا بیان ہے جو پہلے دو شعروں میں بیان ہوئی ہے کہتا ہے کہ ہوا رسان رسان چل رہی تھی اور شبنم ٹپک رہی تھی جسکی وجہ سے میں نے غنچہ کو رختِ خواب میں آلودہ داماں دیکھا یعنی اگرچہ غنچہ ابھی دوشیزگی کی حالت میں معلوم ہوتا تھا مگر چونکہ وہ عنقریب کھلنے والا تھا اس لئے وہ گویا اپنے رخت میں آلودہ دامن ہو چکا تھا۔

صبحِ اول گو بروئے کس نیاورد از حیا   صبحِ ثانی را بریں ہنگامہ خنداں دیدہ ام

اب اُن تمام عجائبات کی جو آخرِ شب اُسکو نظر آئے اُنکی قلعی کھولتا ہے اور کہتا ہے کہ صبحِ اول (یعنی صبحِ کاذب جو گویا کہ شرم و حجاب سے ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہے) اگرچہ وہ حیا کے اصل بھید منھ پر نہیں لائی مگر صبحِ ثانی یعنی صبحِ صادق کو میں نے اس تمام ہنگامے پر خندہ زن

ہر ایک برج کسی نہ کسی سیارے کا خانہ کہلاتا ہے یا وبال مثلاً جدی و دلو زحل کے خانے اور شمس و قمر کے وبال ہیں اور برعکس اسکے اسد و سرطان شمس و قمر کے خانے اور زحل کے وبال ہیں اسی طرح ہر برج ایک سیارے کا خانہ اور دوسرے کا وبال ہے ثور اور میزان جن کا دوسرے شعر میں نام آیا ہے یہ دونو زہرہ کے خانے ہیں اور ثور کے تین درجے چاند کے شرف اور میزان کے اکیس درجے زحل کے شرف کے مقام ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے چاند کو اسکے شرف کے مقام (یعنی ثور) میں اور کیواں یعنی زحل کو اسکے شرف کے مقام (یعنی میزان) میں دیکھا اور چونکہ ثور اور میزان زہرہ کے خانے ہیں اس لئے اس مطلب کو اسطرح ادا کرتا ہے کہ میں نے ایک لولی (رنڈی) یعنی زہرہ کی عشرتگاہوں یعنی ثور و میزان میں دو ایسے مہمان دیکھے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کے حال سے بے خبر اور ہر ایک اپنے حال میں خوش ہے کہ میرے سوا کوئی دوسرا زہرہ کی عشرت گاہ میں نہیں ہے پھر دوسرے شعر میں دفع دخل مقدر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس بیان کو کسی برے معنی پر محمول نکرنا چاہیے بلکہ صرف مطلب یہ ہے کہ میں نے ماہ کو ثور میں اور زحل کو میزان دیکھا ہے۔

رفتہ ام زاں پس بسیر باغ و مرغانرا بباغ ۔۔۔ سر برسم خواب زیر بال پنہاں دیدہ ام

برسم خواب یعنی جیسا کہ پرندوں کے سونے کا دستور ہے۔ سر زیر بال پنہاں یعنی بازو میں سر گھسائے ہوئے۔

کلکِ موجِ نکہتِ گل و م زگردش نازدہ ۔۔۔ نامۂ فیضِ سحر ننوشتہ عنواں دیدہ ام

موجِ نکہتِ گل کو کلک یعنی قلم قرار دیا ہے اور فیضِ سحر کو نامہ یعنی خط ٹھیرایا ہے۔ کہتا ہے

اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی مشکل مقامات کی شرح بھی کیجائیگی۔

بند اول

ان سحر خیزم کہ مہ را در شبستان دیدہ ام　　　شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام

اس تمام بند میں مرزا نے اپنی سحر خیزی اور جو کچھ اُس نور ظہور کے وقت میں آسمان پر یا زمین پہ نظر آیا ہے اسکو نہایت بلیغ و جزیل اشعار میں بیان کیا ہے اور آخر کو اس سے ایک لطیف نتیجہ نکال کر شکایت آمیز فخر پر بند کو ختم کیا ہے۔ شعر مذکور کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ سحر خیز ہوں کہ میں نے چاند کو اُسکی خوابگاہ میں دیکھا ہے اور شب بیداروں یعنی کواکب یا ملائک کو اس گردندہ ایواں (یعنی آسمان) میں مشاہدہ کیا ہے۔

اینت خلوتخانۂ روحانیاں کانجا ز دور　　　زہرہ را اندر ردائے نور عریاں دیدہ ام

اینت کلمۂ تحسین و تعجب ہے بمعنی زہے و خہے۔ روحانیاں فرشتے۔ آسمان کو کہتا ہے کہ کیا عمدہ خلوتخانہ روحانیوں کا ہے جہاں میں نے دُور سے یعنی زمین پر سے زہرہ کو چادرِ نور میں عریاں یعنی بغیر کسی حجاب کے دیکھا ہے۔

ہر یکے فارغ ز غیر و ہر یکے نازاں بخویش　　　لولئے را در دو عشرتگہ دو مہماں دیدہ ام

ہر گدائے اداں بسوائی بیندی ول کرّن　　　ماہ را در ثور و کیواں را بہ میزاں دیدہ ام

ان دونو شعروں کا سمجھنا کسی قدر نجوم کی اصطلاحات جاننے پر موقوف ہے نجومیوں نے دورِ فلک کو بارہ حصوں پر تقسیم کیا ہے جن میں سے ہر ایک حصّے کو برج کہتے ہیں اور اُنکے نام یہ ہیں حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت۔ اِنمیں سے

خیزند دسته دسته مغان نشسته رو — در آرزوی چیدن † برسم زنار رون

(گروہ گروہ ۱۲)

از شور ویریان بگمان خروش صور — اموات را ز رقص بتن بر درد کفن

رخشند ستاره از رخ ناشسته صنم — بالد بنفشه از قد خم گشته شمن *

بر روی خاک جلوه کند سایه در نظر — بر بوی او وست حلقه زند مرغ در چمن

خواهد چراغ کشته چو شخص بریده سر — خیزد دگل شگفته چو زنجیر خسته تن

بر جام مل ز دیده شبنم چکید نگاه — بر روی گل ز طره سنبل فرو شکن

غوغای روز پرده کشاید ز خوب و زشت — آوای کوس خواب رباید ز مرد و زن

فخر و خود ستائی با شکوۂ بخت و گردوں

اس مضمون کے کچھ متفرق اشعار ہم مرزا کے ایک ترکیب بند میں سے جو جناب امیرؑ کی منقبت میں لکھا گیا ہے نقل کرتے ہیں۔ چونکہ یہ نظم ایک خاص انداز کی منقبت اور خاص طرز کی شاعری پر مبنی ہے جس سے زمانۂ حال کے عام مذاق ناآشنا ہیں مگر باوجود اسکے مرزا کے کلام میں شاعری کی حیثیت سے نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے اسلئے نہ اسکو اس موقع پر بالکل قلم انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ وہ اول سے آخر تک نقل کیجا سکتی ہے۔ لہذا متعدد بندوں میں سے جستہ جستہ اشعار متضمن مضمون مندرجۂ عنوان انتخاب کرکے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں

---

† برسم جھاؤ یا انار وغیرہ کی پتلی پتلی بالشت بھر کی شاخیں جن کو آتش پرست عبادت یا غسل یا طعام کے وقت ہاتھ میں رکھتے ہیں ۱۲

* شمن بت ۱۲

صفت موسم بہار

سحر کہ بادِ سحر عرضِ بوستاں گیرد ‏ ‏ دہد بہ نکہتِ گل حکم تا جہاں گیرد
برات بر زرِ گل کردہ اند پنداری ‏ ‏ کہ غنچہ را سپہ سبزہ درمیاں گیرد
مگر بگردِ گل از بہرِ پاس حلقہ زدہ است ‏ ‏ کہ نزالہ را ز ہوا سبزہ بر سناں گیرد
ستادہ سرو چناں اہتمام بردر باغ ‏ ‏ کہ تا بہار دگر راہ بر خزاں گیرد
نزالہ غنچہ بہ سرمست شاہدی ماند ‏ ‏ کہ بعد بادہ شکر ریزہ در دہاں گیرد
چمن ز عکسِ شفق سا تگینِ مل گردد ‏ ‏ سمن ز جوشِ طرب رنگِ ارغواں گیرد
زنند گر ہمہ آتش بہ خار گل بالد ‏ ‏ کشند گر ہمہ پیکر ز سنگ جاں گیرد
ز انبساطِ ہوا بعد ازیں عجب دارم ‏ ‏ کہ مرغِ قبلہ نما جا در آشیاں گیرد
ز گل نگہ نتواں داشت دل بحیلۂ عشق ‏ ‏ اگر ز ما نتواند ز دلستاں گیرد
چناں بکنجِ چمن یافت ذوقِ طاعتِ حق ‏ ‏ کہ شیخِ شہر چو ما ترکِ خانماں گیرد
حریصِ جلوہ نگہ در ہجومِ لالہ و گل ‏ ‏ چو آں گدائے کہ دنبالِ کارواں گیرد
سحر چنیں کہ بشاخ ہمی سینہ بر زمیں مالد ‏ ‏ چرا کسے ثمر از دستِ باغباں گیرد

کیفیت صبح

صبحے کہ در ہوای پرستاری وثن ‏ ‏ جنبد کلید بتکدہ در دست برہمن
در رفت و روب دیر دمِ گرم راہباں ‏ ‏ آرد برون گداختہ شمع از لگن

زآں رشحہ یعنی مداد۔ مطلب یہ کہ میرے ساتھ خط کتابت جاری رہے۔ ۹

امید کہ بپذیری و برمن نہ کنی قہر — نپذیرم اگر معذرتِ فرطِ مشاغل

امید کہ آں شیوہ نورزی کہ بگویم — کز دردِ دلم فارغ و از من شدہ غافل

تشبیبِ قصیدۂ بہ مدحِ نواب وزیر الدولہ رئیس ٹونک

۵ کیفیتِ آغازِ موسمِ سرما

عیدِ اضحیٰ بسرِ آغازِ زمستاں آمد — وقتِ آراستنِ حجرہ و ایواں آمد

گرمی از آب بروں رفت و حرارت ز ہوا — محملِ مہرِ جہاں تاب بہ میزاں آمد

روز می کاہد و شب راست در افزایش روی — موسمِ دیر غنودن بہ شبستاں آمد

آذر افروز و خز و اطلس و سیفور بدوز — مہر مہ میر شد و اینک مہِ آباں آمد

ہند و رفصلِ خزاں نیز بہارے دارد — گونہ گوں سبزہ محلّیٰ بندِ خیاباں آمد

دَے و بہمن کہ در اقلیمِ دگر یخ بندد — اندریں ملک گل و سبزہ فراواں آمد

یعنی در دے و بہمن ۱۲

غنچہ گر بسکہ صف آراست کہ در پویہ نسیم — گفت جا نیست دگر سرزدہ نتواں آمد

باغبان و کاشتکار ۱۲ — یعنی ورزنا یا منہ اٹھائے ۱۲

نخلِ نارنج نہ بینی کہ ہم از میوہ و شاخ — گوی و چوگاں بکف آورد و بمیداں آمد

تا برد داغِ غمِ ہجرِ شقایق ز دلش — گلِ صد برگ بہ دلجوئیِ دہقاں آمد

لالہ ۱۲ — گیندا ۱۲

گر نہ ایں گرمیِ ہنگامہ تماشا دارد

ز چہ نرگس پئے نظارہ بہ بستاں آمد

تا نزدِ تو چوں آیم و دُرد راز تو چہ سازم | ماندن ز تو دشوار و رسیدن تو مشکل
یعنی از لقائے تو وا ماندن ۱۲

اے کاش بکوے تو چنیں روی نمودے | زینساں کہ فرو رفتہ مرا پائی ز ریں گل
پیشتر در دمن خود ۱۲

چونست کہ گاہے نکنی روی بدیں سوے؟ | از چیست کہ ہرگز نہی زاویہ بہ سائل
دریوزہ ۱۲

گر جاں و ہم از غصہ تو دانی کہ بہ گیتی | حرفے غلط از صفحۂ ہستی شدہ زائل

خواہی کہ مرا نبگری؟ از دور بفرما مے | تا نزدِ تو آرند یکے طائرِ بسمل

از صنعتِ استادِ ازل داں کہ ز ہر سوے | چوں قبلہ نما سوی توام ساختہ مائل

غالبِ سخن نامِ من آمد- ازل آورد | دانی کہ دریں شیوہ نیم عامی و جاہل
یعنے قدیم و ازلی ۱۲

در فنِ سخن دم مزن از عرفی و طالب | ایں آیۂ خاص ست کہ بر من شدہ نازل

من گنجم و گردوں بگل اندودہ درم را | مے ہیں درِ گنج- ارچہ کشودن شدہ مشکل
یعنے میرے در کو تیغا کر دیا ہے ۱۲

خود در خرابۂ ویرانہ بود- گنجِ گرانمند | غم نیست گر آبادیِ دہلی شدہ زائل
گنج گراں بہا ۱۲

ہاروت- فسونِ نفسِ گرمِ چہ داند | اعجاز ز دہلی بود و سحر ز بابل

آں را کہ صریرِ قلمم ہوش رباید | دیگر نبرد ذوق ز آوازِ عنادل

توقیعِ بریلی بتو فرخندہ کہ من نیز | بستم بہ فرہ مندیِ خویش از رمِ دلہا
یعنے فرمان الحاق بریلی برام پور ۱۲ — اقبال مندی ۱۲

حاشا کہ ستانم رتبۂ قاضی و مفتی | حاشا کہ پذیرم عملِ شحنہ و عامل
یعنی عہدۂ قاضی و مفتی نخواہم ۱۲

بفرست خرد مند کساں را بحکومت | در جیبِ گدا ریز قلیلے ز مداخل

ہر سال از اں شہر بمن وایہ رواں دار | کز بہرِ ہمیں گشتہ در اقطاعِ تو شامل
یعنی از محاصلات بریلی ۱۲ — جاگیر ۱۲

امید کہ لبِ تشنگیِ من نپسندی | زاں رشحہ کہ بر صفحہ فشانی ز انامل

چوں نیست مرا شربت آبے ز تو حاصل | دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل

در بادیہ بر گور غریباں ز چہ سوزد | آں شمع فروزاں کہ بود درخور محفل

زاں خسرو خوباں چہ قدر چشم وفا بود | صد حیف کہ شد نقش امیدم (یعنی من ۱۲) ہمہ باطل

افسانۂ غم گر بسر آریم نبود عیب | با دوست کہ پیوستہ ہمی بُرد غم از دل

میگوییم و ہمدم زندم طعنہ کہ دو تن زن (خاموش باش ۱۲) | چوں می ندہد داد ز فریاد چہ حاصل

از طعنہ شدم خستہ دل و از رہ تیمار (غمخواری ۱۲) | دل گفت کہ ہاں شیوۂ عشاق فرو ہل

تا کس نبرد ظن کہ بہ شاہد بودم روے (یعنی از روی سخن ۱۲) | حاشا کہ حکایت کنم از لیلی و محمل *

شاہد بود آں دوست کہ اندر غزل اورا | خوانند ستمگارہ و خونخوارہ و قاتل

من نالم ازاں دوست کہ در عالم انصاف | شایاں بودش گویم اگر خسرو عادل

او خسرو خوباں بود و بندہ گدایش | او قلزم و عماں بود و من خس ساحل

خود ہر چہ سرودم ہمہ با دوست کزیں پیش | امید کہم بود بہر وادی و منزل

یارب چہ شد اینک کہ نگیرد خبر از من | پیوستہ بدَویم در ارسال رسائل

ای یوسف ثانی کہ بود در ہمہ عالم | مشتاق جمال تو چہ دیوانہ چہ عاقل

---

† نواب یوسف علیخاں مرحوم صاحبزادگی کے زمانے میں جب تحصیل علم کے لئے دلی میں آتے تھے اُس وقت مرزا صاحب سے بہت ربط تھا مفتی صدرالدین خاں مرحوم سے عربی پڑھتے تھے اور مرزا صاحب سے فارسی۔ مرزا نے اِس قصیدے میں اُس زمانے کو یاد دلایا ہے چنانچہ اسی قصیدے پر نواب ممدوح نے سو روپیہ ماہوار مرزا کے لئے مقرر فرمایا تھا جو مرزا کی دم واپسیں تک برابر جاری رہا ۱۲

* چونکہ تشبیب میں اکثر معشوق کی طرف خطاب ہوتا ہے اس لئے کہتا ہے کہ میں اس تشبیب میں لیلی و محمل کا ذکر نہیں کرتا یعنی معشوق کی طرف میرا روئے سخن نہیں ہے ۱۲

x دور بندہ خود ز خشم خطِ بندگی درید — توقیعِ خوشدلی ز خداوندگار یافت
مہ روشنی و مہر فروزش ز سر گرفت — لیل و نہار صورتِ لیل و نہار یافت
بہرام دل بہ بستنِ تیغ و کمر نہاد — ناہید ذوقِ ورزشِ مضرابِ تار یافت
نظّارہ (یعنی "چشم") فتنہ ہای عیاں از نظر سترد — اندیشہ گنجہای نہاں آشکار یافت
جام از شراب روشنی آفتاب داد — بزم از بساطِ تازگی نوبہار یافت
روی سخن صفای بناگوش گل گزید — بانگِ قلم نشاطِ نوای ہزار (بلبل) یافت
برہم زدند قاعدہ ہائے کہن بہ دہر — ہر کس نشاطِ تازہ ز ہر گونہ کار یافت
فیضِ سحر بہ غالبِ پیمانہ کش رسید — ذوقِ صبوح عابدِ شب زندہ دار یافت
رہزن متاعِ خویش بر ابن السبیل ریخت — کودک رضای لہو ز آموزگار یافت
گر زاہد ست نیز ز من مے بجام برد — ور مجرم ست نیز ز شحنہ زنہار یافت
با فتنہ ہم مضائقہ در خرمی نرفت — خود رخصتِ خواہش از رگِ گل پود و تار یافت
دولت سپند سوخت کہ شد ملک تازہ روی — ملک آفریں سرود کہ دولت مدار یافت
از انتظامِ شاہی و آئینِ سروری — سور و سرور و رونق و داد انتشار یافت
x بر خستگانِ ہند بہ بخشود از کرم — و کشور را کہ رونق از روزگار یافت

شکوۂ تغافل و عدم توجہ بہ نواب یوسف علیخاں مرحوم رئیس رامپور در زمانۂ سختی دستیابی کہ بعد از فتح دہلی روزے چند روی دادہ بود

میکدهٔ خسروِ گل ست - رزستان	صورتِ مینا ز غوره در نظر آمد

کہتا ہے کہ رزستان یعنی انگور کی ٹٹیاں گویا خسروِ گل کا شرابخانہ ہے کیونکہ اسمیں نیم خام انگور لگے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے شراب کی بوتلیں۔

رَو غمِ تردامنی مخور - که جہان را	موجِ گل از ہر کرانہ تا کمر آمد
فتویٰ مے داد ابر و باد و لیکن	شیشہ نہاں بہ کہ ژالہ بد گہر آمد

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں امن ہو جانا اور معافی کا اشتہار جاری ہونا۔

در روزگار ما نتوان اند شمار یافت	خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
پرکارِ تیزگردِ فلک در میان مبیں	حق داد دادِ حق کہ بمرکز قرار یافت
درہاے آسماں بزمیں باز کردہ اند	ہر کس ہر آنچہ جست بہر روزگار یافت
آمد اگر بفرض ز بالا بلا فرود	بر روی خاک پیچ و خمِ زلفِ یار یافت
چوں حسنِ ماہِ یک شبہ بینی - بداں کہ ماہ	پاداشِ جانگدازیِ شبہای تار یافت
چوں رنگِ روی گل نگری - شاد شو کہ گل	اجرِ جگر خراشیِ پیکانِ خار یافت
در خاک و باد و آتش و آب آشتی فزود	ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت
ناچار جز بہ داد گرایش نمی کند	در دہر ہر چہ صورت ازیں چار یار یافت
ہر کس بقدرِ فطرتِ خویش ارجمند گشت	ہر شے بحسنِ جوہرِ خویش اشتہار یافت
گر خواجہ بندہ را خطِ آزادگی نبشت	ہم بر درِ سرای خودش بندہ وار یافت

دل نہ بندند بہ نیرنگ ورنج و رنگ | ہر چہ بینند بعنوان تماشا بینند
جام جو بینند و زرندی نہ گرایند بزہد | سبحۂ انجم اگر دید بیضا بینند
ہر چہ در سو نتواں یافت بہر سو یابند (جہت ۱۲) | ہر چہ در جا نتواں دید بہر جا بینند (مکان ۱۲)
ہمہ گر دند دراں پایہ کہ او را دانند | ہیچ باشند دراں وقت کہ خود را بینند
ایں نظر ہائے گرانمایہ فراموش کنند (یعنی ایں ملاحظات کہ بالا مذکور شد ۱۲) | چوں بہ نیرنگ سخن شعبدۂ ما بینند
نظم ما موجۂ سرچشمۂ حیواں فہمند | نثر ما نسخۂ اعجاز مسیحا بینند
گہ پئے نقل بصد گونہ تقاضا خواہند | گہ پئے فال بصد رنگ تمنا بینند
برود از یاد کہ دنیا ست نمود بے بود | ایں دل افروز نمود یکہ ز دنیا بینند

اس مقام پر اس شعر کی خوبی وجدانی ہے بیان میں نہیں آسکتی۔ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ دل افروز نمود یعنی ہماری نظم و نثر جب اہل اللہ کی نظر سے گذرے گی تو وہ انکے دل سے اس عارفانہ خیال کو فراموش کردیگی کہ دنیا محض ایک نمود بے بود ہے۔

صفت موسم بہار

شکر کہ آشوب برف و باد سر آمد | نامیہ از بند زمہریر بر آمد
کسب ہوا نفع آب خضر رساند (آب حیواں ۱۲) | سبزہ جہان را بہ بیشہ راہبر آمد

یعنی آج کل جنگل کی ہوا کھانے سے وہی فائدہ ہوتا ہے جو آب حیات کے پینے سے ہوتا ہے اور جس طرح خضر آب حیات کا رستہ بتاتا ہے اسی طرح سبزہ جنگل کا رستہ بتاتا ہے۔

در چمنستاں کشودہ بار نوادر (نفائس ۱۲) | باد کہ بازارگان بحر و بر آمد (سوداگر ۱۲)

اشعار تحریر

تشبیب قصیدہ مدح ملکۂ معظمہ

تشنہ چشمے ہیں اور ہر وقت چشمۂ بقا کی روانی اور جوش کو بیان کرتے ہیں یعنی انکو خود دو
وقت پیدا کرنی پڑتی ہیں۔

تشنہ چشمہ اگر عمر دو صد سال گزرد — نخورد تشنہ اگر محمل لیلیٰ بنشیند

خون خورند و جگر از غصہ بدندان گیرند — خویش را چون بسر مائدۂ تنہا بنشیند

یعنی جب تک ساتھ کوئی دوسرا دستر خوان پر نہیں ہوتا تو دانت پیستے ہیں یعنی غصہ ان کو
آتا ہے کہ اس میں اوروں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔

سر و تن را اگر از دست دو انگارند — جان و دل را اگر از دوست شکیبا بینند

قطرۂ آب چو بر دست دشمن شمرند — پارۂ نان چو گل ریزۂ مینا بینند

یہ دونوں شعر دوست و گریباں ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ مطلب سے اکتا جانا اور دوست کے خیال
سے فارغ ہونا کبھی نہیں چاہتے۔

قشقہ را رونق ہنگامۂ ہند و شمرند — بادہ را شمع طربخانۂ ترسا بینند

یعنی ہر ایک شے کو جو اپنے محل پر مناسب و موزوں خیال کرتے ہیں اور کسی چیز سے
از روئے تعصب ناک نہیں چڑھاتے۔

برہم و زمزمہ و قشقہ و زنار و صلیب — خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلیٰ بینند

برہم و زمزمہ آتش پرستوں کے ساتھ۔ قشقہ و زنار ہندوؤں کے ساتھ اور صلیب عیسائیوں
کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے مصرع میں شعائرِ اسلام کا بیان ہے کہتا ہے کہ وہ
لوگ برہم و زمزمہ وغیرہ اور خرقہ و مصلیٰ وغیرہ میں کچھ فرق نہیں سمجھتے۔

یہ شعر گویا ماحصل ہے اِس قول کا کہ "لَیْسَ فِی الْاِمْکَانِ اَبْدَاعُ مِمَّا کَانَ" یعنی جو نظامِ عالم کہ اب موجود ہے اِس سے بہتر نظام ناممکن تھا۔

دور بینانِ ازل - کوریِ چشمِ بد بیں	ہم دریں جا نگرند انچہ در آنجا بینند
راز زیں دیدہ دراں جوے کہ از دیدہ وری	نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند
راہ زیں گرم روان پرس کہ در گرم روی	جادہ چوں نبضِ تپاں از رگِ صحرا بینند
شررے را کہ بناگاہ بدر خواہد جست	زخمہ کردار تبارِ رگِ خارا بینند
قطرہ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست	صورتِ آبلہ بر چہرۂ دریا بینند
شام در کوکبۂ صبح - نمایاں نگرند	روز در منظرِ خفاش ہویدا بینند
وحشتِ تفرقہ در کاخِ مصوّر سنجند	مجمعِ اُنس ہمہ نُہ بستِ زلیخا بینند

یعنی چشمِ بد ۱۲ ; یعنی گہر خواہد شد ۱۲

کاخِ مصوّر وہ محل جسکو زلیخا نے وصالِ یوسف کے لئے آراستہ کیا تھا اور جس میں تمام سامانِ عیش و کامرانی جمع تھا۔ نُہ بست وہ جھونپڑا جو یوسف کے قید ہو جانے پر اُنکی جدائی کے غم میں زلیخا نے اپنے لیئے بنا لیا تھا اور اُسمیں رہتی تھی - کہتا ہے کہ یہ لوگ یعنی اہل اللہ کاخِ مصوّر جیسے آراستہ محل میں اُس تفرقہ کی وحشت کو دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا کے حق میں وہاں سے آخر کار پیدا ہوا اور اُنس اور ملاپ کو اُس نُہ بست میں دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا کو اُسکے بعد نصیب ہونے والا تھا۔

ہر چہ گویند عجم از خسرو و شیریں شنوند	ہر چہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند

یعنی خسرو و شیریں کا قصہ جو اہلِ عجم بیان کرتے ہیں یہ لوگ اُسکو خود خسرو اور شیریں کی زبان سے

آں راکہ طالعِ کفِ گنجینہ پاش نیست | نعم البدل زخانۂ پرویں فشاں دہد
دانم کہ آسماں بزمیں پیشکارِ کیست | عکس چہ جلوہ روشنیِ روشناں دہد
(ستارگاں ۱۲)
چوں جنبشِ سپہر بفرمانِ داورست | بیداد نبود آنچہ بجا آسماں دہد
رنگ از گل است سایۂ نخل و نواز مرغ | ہر جا بہار ہر چہ بود در خورِ آں دہد
در نشترِ نفحۂ قرعہ بنامِ ہوا زند | در نشو سبزہ حکم بہ آبِ رواں دہد
مستیز با نسیم اگر بلبلے بباغ | جاں در نورد خارِ خسِ آشیاں دہد
دارو زبہرِ زندگی آید نہ بہرِ مرگ | جرمِ پزشک چیست اگر خستہ جاں دہد
(طبیب ۱۲)
پرویز دیر یابِ شہے بود ورنہ بخت | آوارہ را براہ زشیریں فشاں دہد
فرہاد زود میر کسے بود ورنہ دہر | کامِ دلِ غریب پس از امتحاں دہد
دارم زروزگار نویدے کہ آں نوید | در پیریم بشارتِ بختِ جواں دہد
از داور زمانہ بایدنشیہ درست | شادم کہ مژدہ بندگیم ناگہاں دہد
(مراد از داور زمانہ خود ذات ۱۲)
ہر گہ ببر نوشت سرآید شمارِ عمر | راہم ببارگاہِ شہِ انس و جاں دہد
سلطانِ دین محمد مہدی کہ رائے او | منشور بر روشنی بہ شہِ خاوراں دہد

صفتِ سالکانِ طریقت

رہرواں چوں گہر آبلہ پا بینند | پائے را پایہ فراتر ز ثریا بینند
(سالکاں ۱۲) | (بالاتر ۱۲)
ہر چہ در دیدہ عیانست نگاہش دارند | ہر چہ در سینہ نہانست ز سیما بینند
(یعنی آنرا بنظر غور بہ بینند ۱۲)
راستی از رقمِ صفحۂ ہستی خواہند | نقشِ کج بر ورقِ صفحۂ عنقا بینند

به بینی سرخوشِ خوابِ عدم عباسِ غازی را — نه کشکش در خمِ بازو نه تیرش در کمان بینی

هجومِ خستگان و سوز و سازِ نوگرفتاران — نوائین بزمِ طوسی قاسمِ ناشاد مان بینی

نمی بینی که چون جان داد از بیداد بدخواهان — علی اکبر که همچون بخت بدخواهش جوان بینی

گر فهمت تا بیمنه بینی دلے داری و چشمے هم — بخون آغشته نازک پیکرِ اصغر عیان بینی

چه دندان بر جگر افشرده باشی کاندران وادی — حسینِ ابنِ علی را در شمارِ کشتگان بینی

نیاری گرد ران کوشی که پایش در رکاب آری — نه بینی گر خود آن خواهی که دستش بر عنان بینی

تنے را کش رگِ گل خار بودے بر زمیں یابی — سرے را کش ز افسر عار بودے بر سنان بینی

ستایشِ روزگار

هست از تمیز گر به هما استخوان دهد — آئینِ دهر نیست که کس را زیان دهد

مردستِ مرد هر چه کند بے خطر کند — را دست راد هر چه دهد رایگان دهد

گلزار را اگر نه ثمر گل بهم نهد — درویش را اگر نه سحر شام نان دهد

گنجِ سخن نهد به نهان خانهٔ ضمیر — وانگه کلیدِ گنج بدستِ زبان دهد

تا روز خاک تیره نه گردد ز رشکِ چرخ — رخشانی ستاره بریگِ روان دهد

تا آدمی ملال نگیرد ز یک هوا — سرمائی نو بهار و تموز و خزان دهد

هم در بهار گل شگفاند چمن چمن — تا راحتِ مشام و نشاطِ روان دهد

هم در تموز میوه فشاند طبق طبق — تا آرزوے کام و مرادِ دهان دهد

آں را که بختِ دسترسِ بذل مال نیست — طبعِ سخن رس و خردِ خرده دان دهد

عباسؑ دلاور کہ دراں راہروی داشت | شمشیر بیکدست و بیکدست لوا - ہاے

آں قاسمِ گلگوں کفنِ عرصۂ محشر | واں اکبرِ خونیں تنِ میدانِ وغا - ہاے

آں اصغرِ دل خستۂ پیکانِ جگر دوز | واں عابدِ غمدیدۂ بے برگ و نوا - ہاے

اے قوتِ بازوے جگر گوشۂ زہراؑ | دستِ تو و شمشیر شد از شانہ جدا - ہاے

اے شہرہ بدامادی و شادی کہ نداری | کافور و کفن - بگذرم از عطر و قبا - ہاے

اے مظہرِ انوار کہ بود اہلِ نظر را | دیدارِ تو دیدارِ شہِ ہر دو سرا - ہاے

اے گلبنِ نو رستۂ گلزارِ سیادت | نایافتہ در باغِ جہاں نشو و نما - ہاے

اے منبعِ آں ہشت کہ آرایشِ خلد اند | داغم کہ رسن شد بگلوے تو روا - ہاے

بالغ نظرانِ روشِ دینِ نبی - حیف | قدسی گہرانِ حرمِ شیرِ خدا - ہاے

ماتم کدہ آں خیمۂ غارت زدگاں حیف | غارت زدہ آں قافلۂ آلِ عبا - ہاے

آں تابشِ خورشید دراں گرم روی حیف | واں طعنۂ کفار دراں شورِ غزا - ہاے

غالب بملائک نتواں گشت ہم آواز | اندازۂ آں کو کہ شوم نوحہ سرا - ہاے

بیا در کربلا تا آں ستمکش کارواں بینی | کہ در روے آدم آلِ عبا را ساربان بینی

نہ بینی ہیچ بر سر خازنانِ گنجِ عصمت را | مگر در خار بن تا تار و پود طیلساں بینی
(جھاڑیاں ۱۲ — چادر ۱۲)

ہمانا سیلِ آتش بردہ بنگاہِ غریباں را | کہ ہر جا پارۂ از رخت و موجے از دخاں بینی

بہ بینی چشمۂ از آب و چوں جوئی کنارش را | ز خونِ تشنہ کاماں چشمۂ دیگر رواں بینی

چہ ستیزم بقضا ورنہ بگویم غالب ۔ علم شاہ نگوں شد ۔ تو چنیں بایستے

۴ وقت ست کہ در پیچ و خم نوحہ سرائی ۔ سوز د نفس نوحہ گر از تلخ نوائی
وقتست کہ آں پردگیاں ۔ کز رہ تعظیم ۔ بر در گہ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی
از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند ۔ چوں شعلہ دخاں بر سر شاں کردہ ردائی
جانہا ہمہ فرسودۂ تشویش اسیری ۔ دلہا ہمہ خوں گشتۂ اندوہ رہائی
اے چرخ چو آں شد ، گر از بہر چہ گردی ۔ اے خاک چو ایں شد ، گر آسودہ چرائی
خوں گرد و فرو ریز ! اگر صاحب جہری ۔ برخیز و بخوں غلط ! اگر از اہل وفائی
تنہا ست حسین ابن علی در صف اعدا ۔ اکبر تو کجا رفتی و عباس کجائی
توقیع شفاعت کہ پیمبر ز خدا داشت ۔ از خون حسین ابن علی یافت روائی
فریاد از آں حامل منشور امامت ۔ فریاد از آں نسخۂ اسرار خدائی
فریاد از آں زاری و خونابہ فشانی ۔ فریاد از آں خواری و بے برگ و نوائی
فریاد ز بیچارگی و خستہ درونی ۔ فریاد ز آوارگی و بے سر و پائی
غالب جگری خوں کن و از دیدہ فرو بار ۔ گر روے شناس غم شاہ شہدائی

۴ سرو چمن سروری افتاد ز پا ۔ ہاے ۔ شد غرقہ بخوں پیکر شاہ شہدا ۔ ہاے
بر خاک رہ افتادہ تنے ہست سرش کو ۔ آں روی فروزندہ و آں زلف دوتا ۔ ہاے

ز حسین ہست ایں حسودی بحسینے بخشش بہ پیچ — بوسہ چوں باقی نماندے وردہان مصطفیٰ

قدسیاں را نشنیدن آں نوحہ غائب رسا ع — گشتہ ام در نوحہ خوانی مدح خوان مصطفیٰ

اے کہ اندیشہ فلک تر ہست دین بایستے — علم شاہ دیگرگوں شدند چنیں بایستے

تاچہ انما وکربہ نیزہ سرش گردانند — عزتِ شاہ شہیداں بہ ازیں بایستے

نیست باشد کہ فتد خستہ تن بسنان برخاک — آنکہ جہ لانکہ او عرش بریں بایستے

نیست باشد کہ زامداد مراسپے طلبد — آنکہ سائل بدرش روح امیں بایستے

تازیاں را بہ جگر گوشۂ احمد بہ نزاع — وطنِ اصلی ایں قوم زمیں بایستے

ایہا القوم اگر تنزل بود از خود گویم — میہماں بے خطر از خنجرِ کیں بایستے

یعنی یہ تو ادنیٰ درجے کی بات ہے اگر یہ کہا جائے کہ اے اہلِ شام کربلا کا میہمان خنجرِ کیں سے محفوظ رہنا چاہیے تھا بلکہ جو سخن اس موقع پر کہنے کے لائق ہے وہ یہ ہے یعنی جیسا اگلے اشعار میں بیان ہوا ہے۔

سخن انیست کہ در راہِ حسین ابنِ علیؑ — بہ یہ از روی عقیدت بہ جبیں بایستے

چشم بد دور ز ہنگام تماشای رخش — رو نما سلطنتِ روی زمیں بایستے

داشت ناخواستہ زر شکر قدومش دادن — اگرش ملک وگر تاج و نگیں بایستے

(دادن داشت یعنی بایست داد)

چوں بفرمانِ خود آرائی و خود بینی و بغض — آں نکردید کہ از صدق و یقیں بایستے

با اسیرانِ ستمدیدہ پس از قتل حسینؑ — دلِ نرم و منشِ مہر گزیں بایستے

باید بدرد هرزه گریستن - وگر گریست | بیجا گریستیم - دریغا گریستن
رشک آیدم بابر که در حدِ وسع اوست | بر خاکِ کربلائے معلّی گریستن
رفت آنچه رفت - بایدم اکنون نگاشت هدا | از بهرِ نورِ دیدهٔ زهرا گریستن
بارانِ رحمتے!! که باید از شست و شو (یعنی بقصدِ شست و شوئے) | دارد به روسیاهی اعدا گریستن
خود را ندیده‌اند لبِ نوشین بکامِ خویش | زیبد به شور بختی دریا گریستن
فردِ شفاعت وصلهٔ صبر و خون بها | هیچ از کسے نخواسته الّا گریستن
چون زرقِ عیب در ترا عام کرده‌اند | سر میزند ز مومن و ترسا گریستن

ای فلک شرم! از ستم بر خاندانِ مصطفیٰ | داشتی زین پیش سر بر آستانِ مصطفیٰ
ای بمهر و ماه نازان هیچ میدانی چه رفت؟ | از تو بر چشم و چراغِ دودمانِ مصطفیٰ
سایه از سروِ روانِ مصطفیٰ نفتد بخاک | هان چه بر خاک افگنی سروِ روانِ مصطفیٰ
گرمیِ بازارِ امکان خود طفیلِ مصطفیٰ است | هین چه آتش میزنی اندر دکانِ مصطفیٰ
کینه خواهی بین!! که با اولادِ امجادش کنی (انتقام کشی) | آنچه با مه کرده اعجازِ بنانِ مصطفیٰ
نیک نبود کز تو بر فرزندِ دلبندش رود | آنچه رفت از مرتضیٰ بر دشمنانِ مصطفیٰ
یا تو دانی مصطفیٰ را فارغ از رنجِ حسینؑ؟ | یا تو خواهی زین مصیبت امتحانِ مصطفیٰ؟
یا مگر گاهے ندیدی مصطفیٰ را با حسینؑ؟ | یا مگر هرگز نبودی در زمانِ مصطفیٰ؟
از حسینؑ است این که گفتے مصطفیٰ روحی فداک | چون گذشتے نامِ پاکش بر زبانِ مصطفیٰ

گل چو یاند و یہ گرد و پرورشش بازار سرد | بہر تجدید طرب طرح خزاں انداختہ
آتشے از روئے گلہائے بہار افروختہ | شعلۂ در جان مرغ صبح خواں انداختہ
دجلۂ در ساغر معنی طراز اں ریختہ | رشحۂ در کاسۂ دریا و کاں انداختہ
جز بدیں آب آتش نمرود شتناں کرد | کعبہ را جوئے بہشت از ناوداں انداختہ
جز بدیں الماس تمغہ ال انچنیں در وانہ | رخنہ از اسلام در کیش مغاں انداختہ

یعنی آتشِ زردشت ہر ایک پانی سے نہیں بجھ سکتی تھی اس لئے میزابِ کعبہ سے بہشت کی نہر جاری کر دی اور کیش مغاں ایک ایسا موتی تھا کہ اسلام جیسے الماس کے سوا اسکا بیدھنا یعنی اسمیں رخنہ ڈالنا ناممکن تھا۔

چشم را بخشیدہ چوناں گردشے کار بانجوش | بر زمیں مانند طرح آسماں انداختہ
یعنی چشم اختر شماراں را
دادہ ابرو را بد انساں جنبشے کاہلِ قیاس | در تنِ شمشیر پندار ند جاں انداختہ
اے ز شرمِ خاکساران تو از شہپرِ ہما | چوں گلیمِ کہنہ ظل را بگراں انداختہ
ذوقِ تمکینِ گدایانِ تو گنجِ شاہ را | از دلِ گنجور و چشمِ پاسباں انداختہ
تا دریں صورت بچشمِ دشمناں پنہاں بود | دوست را اندر طلسمِ امتحاں انداختہ
تا علاجِ خستگی آسائشِ دیگر دہد | خارہا در رہگذارِ میہماں انداختہ

مرثیہ و نوحہ

کفر ست کفر در پئے روزی شتافتن | ننگ ست ننگ در غمِ دنیا گریستن
گاہے بہ داغِ شاہد و ساقی گداختن | گاہے بمرگِ مامک و بابا گریستن

از قصیدہ در منقبت

نظیری کے ترکیب بند کے ساتھ اِس غرض سے نقل کرینگے تاکہ اصحاب ذوق صحیح کو دونوں کے کلام میں موازنہ اور اِس بات کا اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ مرزا نے اکبری طبقہ کے چیدہ اور برگزیدہ شعرا کے تتبع کو کس حد اور کس درجے تک پہنچایا تھا۔

تمہید از قصیدۂ توحید الٰہی

توحید

اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ — گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ

دیدہ بیروں و دروں از خویشتن پرداختہ — پردۂ رسم پرستش در میاں انداختہ

نقش بر خاتم ز حرفِ بے صدا انگیختہ — شور در عالم ز حسنِ بے نشاں انداختہ

چرخ را در قالبِ ابداع در ہوا ریختہ (معلق) — خاک را بر نطعِ پیدائی ستاں انداختہ (فرش، چت)

عاشقاں در موقفِ دار و رسن وا داشتہ — غازیاں در معرضِ تیغ و سناں انداختہ

رنگہا در طبعِ ارباب قیاس آمیختہ — نکتہ ہا در خاطرِ اہلِ بیاں انداختہ

با چنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی — مُردہ را از خویش دریا بر کراں انداختہ

دوئی کو مُردے سے اور وحدت کو دریا سے تشبیہ دی ہے یعنی جسطرح دریا مردے کو باہر پھینکدیتا ہے اِسی طرح باوجود ہنگامۂ کثرت کے وحدت میں دوئی نہیں سما سکتی۔ بالکل نئی اور نہایت بلیغ تشبیہ دی ہے۔

نردبانے بستہ با دیوار کاخے در نظر — انتعاشے (چاؤ) در نہادِ این و آں انداختہ

رفتہ ہر کس تا قدمگاہے فراخورِ خویش را — پایہ پایہ از فرازِ نردباں انداختہ

غم چو گیرد سخت نتواں شکوہ از دلدار کرد — بہرِ آسائی اساسِ آسماں انداختہ

تشبیب کی غزل سے کم درجہ نہیں ہے۔ بلکہ اکثر غزل پر ہر ایک لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے۔ غزلیات میں سب سے آخر غزلیات کا ایک دوسرا حصہ ایسا بھی ہے جس میں تغزل کی شان یعنی عاشقانہ اور ناصحانہ پہلو بہت کم پایا جاتا ہے۔ بخلاف قصیدے کے کہ اس میں قصیدے کی شان کہیں نہیں جاتی ہے اول سے آخر تک یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔

قصائد میں مرزا نے کہیں قاآنی کا تتبع کیا ہے کہیں سلمان و ظہیر کا اور کہیں عرفی و نظیری کا۔ اور ہر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی ہے۔ مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے۔ اور اسی سے قصیدے کی پستی و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً اور ایران کی شاعری میں خصوصاً کوئی مضمون مدح و ستائش سے زیادہ پھیکا سیٹھا ٹھنڈا اور بے لطف نہیں ہوتا۔ بالخصوص متاخرین نے مبالغہ کی نے بڑھاتے بڑھاتے مدح کو ہجو کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ اور اس کلیہ سے مرزا کی مدح بھی مستثنیٰ نہیں۔ البتہ عرفی نے مدحیہ مبالغوں میں ایک قسم کا بانکپن پیدا کیا ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس طرح قدما کے قصائد میں وہ آن نہیں پائی جاتی اسی طرح مرزا کے قصائد بھی اس سے معرا ہیں۔ لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیبوں سے سبقت لے گئی ہیں۔

چونکہ مرزا کے تمام قصائد اور ان کے ملحقات کے انتخاب کی اس مختصر میں گنجائش نہیں ہے اس لئے ہم ایک آدھ پورا قصیدہ اور باقی صرف چند تشبیبیں، اور ایک آدھ مدح اور کچھ قطعے اور نوحے بطور نمونے کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور آخر میں مرزا کا ایک ترکیب بند

بلکہ جس طرح سونے کو آگ میں تپانے سے اسکی کھوٹ نکالنی منظور ہوتی ہے اسی طرح آتش جہنم سے نفوسِ انسانی کو مہذب کرنا مقصود ہے۔

۳۵ یارب تو کجائی کہ بہ ما زر ندہی
بیدرد خدائی کہ بما زر ندہی
نے نے۔ تو نہ غایبی، و نے بیرحمی
بے مایہ چو مائی کہ بما زر ندہی

اِس رباعی میں مرزا کی شوخی و گستاخی حد سے زیادہ گذر گئی ہے۔ دارالافتا میں تو یقیناً اُس پر کفر کا فتوے دیا جائیگا، لیکن ہمارے نزدیک ایسے کلام سے بجاے کفر کے زیادہ تر قائل کے ایمان اور یقین پر استدلال ہوتا ہے۔ صاف پایا جاتا ہے کہ سائل معاش کی تنگی و فراخی و خوشحالی و بدحالی کو محض خدا کی طرف سے جانتا ہے، اور تدبیر و عقل و دانش کو اُس میں بالکل عاجز و درماندہ سمجھتا ہے؛ یہاں تک کہ جب معاش سے بہت تنگ ہوتا ہے تو یہ نہیں خیال کرتا کہ ہمنے تدبیر نہیں کی، یا تدبیر میں مجھسے غلطی ہوگئی، یا ہماری کاہلی و سستی سے یہ تنگدستی ہمکو نصیب ہوئی؛ بلکہ نہایت تعجب کے ساتھ خدا کی جناب میں عرض کرتا ہے کہ کیا تیرا خزانہ خالی ہوگیا ہے۔ جو ہم کو کچھ نہیں ملتا؟ ہاں اِس قسم کے خطابات آداب شریعت کے بالکل خلاف ہیں، اور ایسے ہی خطابات کی نسبت کہا گیا ہے۔

"مایروں را ننگریم و قال را
مادروں را بنگریم و حال را"

قصائد مرزا کے قصائد۔ جن میں قطعات، قوسحے، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس وغیرہ بھی شامل ہیں۔ کیا باعتبار کمیّت اور کیا بلحاظ کیفیت کے اُنکے اصناف نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنف ہے؛ اگرچہ مرزا کی غزل کا ایک معتدبہ حصہ متاخرین کے طبقے میں کسی بڑے سے بڑے نامور اور مسلم الثبوت

تھوڑے تھوڑے فرق سے رودکی اور فرخی نے بھی باندھا ہے؛ مگر مرزا کے ہاں سب سے عمدہ طور پر بندھا ہے۔ رودکی کہتا ہے۔ "جہا تا چہ بینی تو از بچگاں ۞ کہ مادر گہے گاہ ماندری"

اور فرخی کہتا ہے۔ "مہر فرزندی بر خواجہ فگندہ ست جہاں ۞ ایں جہاں مادر اونیست کہ مادندر او ست"

۳۳ آنرا کہ ز دست بے زری پامال ست ۔ رسوائی نیز لازم احوال ست

ما خشک لبیم و خرقہ آلودہ بہ مے ۔ ساقی مگرش پیالہ از غربال ست

کہتا ہے۔ کہ مفلس آدمی کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ رسوا اور بدنام ہو۔ چنانچہ ہمکو دیکھو! کہ ہمارے ہونٹ تو خشک ہیں، اور کپڑے شراب میں آلودہ ہیں؛ گویا ساقی کا جام چھلنی کا بنا ہوا ہے کہ منہہ تک آتے آتے ساری شراب کپڑوں پر ٹپک جاتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ مفلس آدمی جو شراب پینے لگتا ہے وہ بہت جلد بدنام اور رسوا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کبھی کلال کی دوکان پر جا کر ہاتھ پسارتا ہے، اور جو تھوڑی بہت مل جاتی ہے تو بدمست ہو کر اُسکی دوکان ہی پر یا راہ میں گر پڑتا ہے، اور آنے جانے والے سب اُسکو دیکھتے ہیں؛ کبھی کلال کے دام چڑھ جاتے ہیں تو اُس سے بازار میں تکرار ہوتی ہے اور سب لوگ دیکھتے ہیں۔ حالانکہ کبھی اُسکو اطمینان سے سیر ہو کر شراب پینی میسر نہیں ہوتی۔ اِس حالت کو اِس تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ گویا ساقی تقدیر ہمکو چھلنی کے پیالے میں شراب دیتا ہے کہ ہونٹ تک تو نہیں ہوتے اور کپڑے سارے شور بور ہو جاتے ہیں۔ ایسی بلیغ تمثیلیں بہت کم دیکھی گئی ہیں۔

۳۴ اے دادہ بباد عمر در لہو و فسوس ۔ زنہار مشو ز رحمت حق مایوس

ہشدار! کز آتش جہنم حق را ۔ تہذیب غرض بود نہ تعذیب نفوس

فسوس۔ ہزل و استہزا۔ کہتا ہے کہ جہنم میں ڈالنے سے بندوں کو تکلیف دینی مقصود نہیں ہے؛

ایں سیم و زر است خواجہ! ایں سیم و زر است   غم نیست کہ ہر چند خوری کم نشود

دست خوش۔ مغلوب و زبردست۔ کہتا ہے کہ اے دولتمند! چاہیئے کہ روپے کے کم ہو جانے سے تیرا دل پریشان اور غم میں دبا ہوا رہے۔ اے حضرت یہ سیم و زر ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ سیم و زر ہے! یہ غم نہیں ہے کہ جس قدر کھائے جائیے کم نہیں ہوتا۔

گرانی گوش

۳۰ دارم دلِ شاد و دیدہ بینائے   و ز کرّیِ گوشم ہنوز پروائے

خوب است کہ نشنوم ز ہر خود رائے   گلبانگ اَنَا رَبُّکُم الاعلائے

کہتا ہے کہ مجھکو کری گوش یعنی ثقلِ سماعت کی کچھ پروا نہیں! بلکہ اسکو بہتر سمجھتا ہوں کیونکہ مغرور اور خود پسندوں کی زبان سے انا ربکم الاعلیٰ (جو کہ فرعون کا مقولہ ہے) نہیں سنتا۔

توحید وجودی

۳۱ اے کردہ بآرائشِ گفتار بسیچ   در زلفِ سخن کشودہ راہِ خم و پیچ

عالم کہ تو چیز دیگرش میدانی   ذاتے ست بسیط منبسط دیگر ہیچ

بسیچ۔ قصد۔ زلف سخن میں خم و پیچ کی راہ کھولنے سے مراد بیان میں پیچیدگی پیدا کرنی۔ کہتا ہے کہ عالم جسکو تونے کچھ اور چیز سمجھ رکھا ہے۔ وہ صرف ذات واحد ہے جو بسیط ہے۔ یعنی مرکب نہیں۔ اور منبسط ہے یعنی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ بس اسکے سوا کچھ نہیں۔

شکایت

۳۲ اے تیرہ زمیں کہ بودہ بسترِ من   ہر خاک کہ با تست ہمہ بر سرِ من

زر بہرِ کسان و بہرِ من دانہ و دام!!   اے مادرِ دیگران و مادندرِ من

مادندر سوتیلی ماں کو کہتے ہیں۔ زمین سے خطاب کرتا ہے کہ اوروں کے لئے تو تجھپر سونا بچھا ہوا ہے؛ اور میرے لیئے دانہ و دام کے سوا کچھ نہیں، گویا تو اوروں کی ماں ہے اور میری میندر ہے۔ یہ مضمون

۲۵ گر گرد ز گنج گہرے بر خیزد — مپسند کہ دود از جگرے بر خیزد
بنشست نتواں نہاد بر گدیہ گراں — بنشیں کہ بخدمت دگرے بر خیزد

گنجِ گہر سے گرد اٹھنے کے معنی اُسکے خالی ہوجانے کے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر جواہرات کا خزانہ خالی ہوجائے تو بلا سے، مگر یہ گوارا مت کر کہ کسی کے جگر سے دُھواں اُٹھے۔ بھیک مانگنے والوں پر احسان نہیں رکھا جا سکتا؛ خدا نے اُنکی خدمت پر تجھکو کھڑا کیا ہے؛ اگر تجھسے یہ خدمت پوری نہیں ہو سکتی تو بیٹھ جا، تاکہ دوسرا اس خدمت کے لیے اُٹھے۔

۲۶ اے دوست بسوی این فرو ماندہ بیا — از کوچۂ غیر راہ گرداندہ بیا
گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگ توام — بر گفتۂ خویش باش و ناخواندہ بیا

اوپر کے دونو مصرعے صاف ہیں اُسکے بعد کہتا ہے کہ اے دوست تو نے مجھسے کہا تھا کہ مجھے مت بُلانا میں تیری موت ہوں اچھا اب تو اپنے کہنے پر قائم رہ اور جس طرح کہ موت بن بلائے آتی ہے تو بھی بن بلائے چلا آ۔

اے آنکہ ہما اسیرِ دامت باشد — صافِ مئے خسروی بجامت باشد
۲۷ تسبیح بہر اسمِ الٰہی کہ بود — آغاز ز ابتدائے نامت باشد

یہ رباعی سبحان علیخاں مرحوم کو جو مرزا نے خط لکھا تھا اُسکے اول میں لکھی تھی معنی ظاہر ہیں

۲۸ بازی خورِ روزگار بودم ہمہ عمر — از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر
بے مایہ بفکرِ سود ماندم ہمہ جا — بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر
۲۹ باید کہ دلت ز غصہ برہم نشود — از رفتنِ زر دست خوشت غم نشود

۲۱ ہر چند زمانہ مجمعِ جہال ست — در جہل نہ حالِ شاں بیک منوال ست
کودن ہمہ۔ لیک از یکے تا دگرے — فرقِ خرِ عیسیٰ و خرِ دجال ست

کہتا ہے کہ اگرچہ زمانے میں جھڑاں جاہل بھرے ہوئے ہیں، مگر جہل میں انکا حال متفاوت و مختلف ہے۔ کودن تو سب ہیں۔ مگر ایک دوسرے میں ایسا فرق ہے جیسا خرِ عیسیٰ اور خرِ دجال میں۔

۲۲ تا تمکیں و جوہر دو سخنور داریم — شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ تمکیں از ماست — در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

یہ رباعی منشی جواہر سنگھ جوہر اور میر احمد حسین تمکیں کے حق میں۔ کہ دونو مرزا کے عزیز شاگردوں میں سے تھے لکھی ہے۔ در میکدہ پیریم یعنی پیر مغانیم۔ باقی رباعی کے معنی ظاہر ہیں۔

۲۳ دستم بہ کلیدِ مخزنے می بایست — در بود تہی۔ بداننے می بایست
یا ہیچ گہم بہ کس نیفتادے کار — یا خود بہ زمانہ چوں منے می بایست

کہتا ہے کہ یا تو میرے ہاتھ میں کسی خزانے کی کنجی چاہئے تھی، اور اگر ہاتھ خالی ملا تھا تو کسیکا دامن ہونا چاہئے تھا۔ جسکے توسّل سے زندگی بسر ہوتی؛ یا مجھکو کبھی کسی سے کام نہ پڑتا، اور یا زمانے میں خود مجھ جیسا صاحبِ کمال ہوتا۔ جو میری قدر کرتا۔

۲۴ ہستم زمے امید سرمست و بس ست — دارم سرِ ایں کلاوہ در دست۔ و بس ست
گر از تو بمن لطف و کرمے نیست مباش! — استحقاقِ ترحّمے ہست و بس ست

سرِ ایں کلاوہ۔ یعنی سرِ ایں رشتہ۔ باقی معنی ظاہر ہیں۔

چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ　　　ماند بہ بہائم و غلفت زار فراخ

یعنی زاہدوں کا بہشت میں بیباک پھرنا، اور جا بجا ٹہنیوں پر پھلوں کے لئے ہاتھ مارنا، اگر غور کرکے دیکھو تو اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک وسیع چراگاہ ہے اور اسمیں ڈھور ڈانگر چرتے پھرتے ہیں۔

۱۹　آں را کہ بود درستئے در فرجام　　　ہم محرم خاص آید و ہم مرجع عام
آساں نبود کشاکش پاس قبول　　　زنہار نہ گردی بہ نکوئی بدنام

فرجام - انجام اور نکوئی انجام اور رنگ و رونق کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں رنگ و رونق یعنی شہرت و ناموری مراد ہے۔ کہتا ہے کہ جسکی شہرت صحیح اور سچی ہوتی ہے وہ ضرور ہے کہ خواص کا محرم اور عوام کا مرجع واقع ہو۔ مگر پاس قبول کی کشاکش یعنی ہر موقع پر اس بات کا خیال رکھنا کہ قبولیت میں فرق نہ آئے - نہایت سخت چیز ہے۔ پس ہرگز نیکی کے ساتھ بدنام یعنی مشہور - ہونا نہیں چاہیئے۔ اس موقع پر بجائے مشہور کے بدنام کا لفظ نہایت بلیغ واقع ہوا ہے جس سے ساری رباعی میں جان پڑگئی ہے۔

۲۰　در عالم بے زری کہ تلخ است حیات　　　طاعت نتواں کرد بامید نجات
اے کاش ز حق اشارت صوم و صلوٰۃ　　　بودے بوجود مال چوں حج و زکوٰۃ

کہتا ہے کہ بے مقدوری کی حالت میں جبکہ زندگی تلخ ہوتی ہے نجات کی اُمید پر طاعت نہیں ہو سکتی کاش ایسا ہوتا کہ جس طرح حج اور زکوٰۃ میں استطاعت اور تموّل شرط ہے روزہ اور نماز میں بھی یہی شرط ہوتی۔

چون عاقبتِ یگانہ بینان دار است — دریاب کہ انجام دوبینان چہ بود

کہتا ہے کہ اگر منصور کو لوگ کہیں کہ سولی پر چڑھایا گیا اور ذلت سے مارا گیا تو منصور کو اسکی کچھ پروا نہیں مگر تم دیکھو کہ جب منصور جیسے یگانہ بیں لوگوں کا انجام دار ہے تو دوبینوں کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

۱۶ ہر کس ز حقیقت خبرے داشتہ است — بر خاکِ رہِ عجز سرے داشتہ است
زاہد ز خدا ارم بدعوے طلبید — شداد ہمانا پسرے داشتہ است

کہتا ہے کہ جو شخص اپنی یا انسان کی حقیقت سے واقف ہوتا ہے اسکو عاجزی کرنے کے سوا کچھ بن نہیں آتی۔ پس زاہد جو خدا سے ارم دعوے کے ساتھ طلب کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ شداد نے بیٹا اپنا وارث چھوڑا تھا۔ کیونکہ اول تو ارم جو کہ متروکہ شداد ہے اسکا دعوے کرنا، اور پھر خدا کے سامنے اسکے مانگنے میں ہیکڑی کرنی، یہ دونو باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شداد نے اپنا وارث حقیقی چھوڑا تھا۔

۱۷ غالب بہ سخن گرچہ کسے ہمسر نیست — از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و نغز وانگہ بسیار!!! — ایں بادہ فروش ساقیِ کوثر نیست

کہتا ہے کہ اے غالب اگرچہ شاعری میں کوئی تیرا ہمسر نہیں، مگر عقل کا نشہ تیرے دماغ میں بالکل نہیں، شراب چاہتا ہے، وہ بھی مفت، اور وہ بھی عمدہ، اور پھر کثرت سے!!! یہ بادہ فروش ہے، ساقی کوثر نہیں کہ تیری سب خواہشیں پوری کر دیگا۔

۱۸ گر دیدنِ زاہدان بجنت گستاخ — ویں دست درازی بہ ثمر شاخ بشاخ

طبیب کی طرف خطاب ہے کہ مجھے بیماری میں شراب سے کیوں منع کرتا ہے؟ اگر میں گیا تو غضب ہو جائیگا، کہ یہ اکھٹے دو تین مٹکے میرے کام تو نہ آئینگے، میرے وارثوں کو پہنچ جائینگے۔

۱۱ آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقیِ دہر | ریزد ہمہ دُردِ دَرد و تلخ آبۂ زہر
بگذر ز سعادت و نحوست۔ کہ مرا | ناہید بہ غمزہ کُشت، و مریخ بقہر

ناہید یعنی زہرہ کو سعد اور مریخ کو نحس قرار دیا گیا ہے۔ کہتا ہے کہ سعادت و نحوست کے خیال کو جانے دو، میرے حق میں تو سعد و نحس دونوں قسم کے ستارے نحس ہو گئے، کہ زہرہ نے مجھے غمزے سے قتل کیا اور مریخ نے قہر سے۔

۱۲ شرطست کہ روی دل خراشم ہمہ عمر | خونابہ برُخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگِ مومن | چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

۱۳ غالب روشِ مردمِ آزاد جداست | زنقیا رِاسیرانِ رہ و زاد جداست
ما ترکِ مراد را ارم می دانیم | واں باغچۂ ضبطیِ شدّاد جداست

یعنی آزاد لوگوں کی اَور روش ہے، اور جو لوگ توشہ اور رسم و راہ کے گرفتار ہیں اُنکا اَور ڈھنگ ہے۔ ہم کہ آزاد لوگ ہیں ہمارے نزدیک ترکِ مراد کا نام ارم ہے، اور وہ ارم جس سے شدّاد محروم رکھا گیا وہ ہمارے ارم سے الگ ہے۔

۱۴ این نامہ کہ راحتِ دلِ ریش آورد | سرمایۂ آبروے درویش آورد
در ہر سُخن مژدہ سید جانے۔ یعنی | سامانِ نثارِ خویش با خویش آورد

۱۵ منصور بغمش ز نکتہ چینیاں چہ بود | در راست خطر ز ہمنشیناں چہ بود

٦ اے آنکہ براہِ کعبہ روئے داری — نازم کہ گزیدہ آرزوئے داری

ایں گونہ کہ تند مے خرامی - دانم — در خانہ زنِ ستیزہ خوئے داری

کعبہ جانے والے سے کہتا ہے کہ تیرا ارادہ تو بہت عمدہ ہے، مگر تو جو ایسا بھاگا جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ تیرے گھر میں بدمزاج عورت ہے جسکے سبب سے کعبہ جانے میں اسقدر جلدی ہے۔

٧ شاہا ہر چند وا یہ جو آمدہ ام — دانی کہ چہ مایہ نغز گو آمدہ ام

رنگم کہ بہار را بہ رو آمدہ ام — آنم کہ محیط را بجو آمدہ ام

٨ زانجا کہ دلم بوہم در بند نبود — باہیچ علاقہ سخت پیوند نبود

مقصودِ من از کعبہ و آہنگِ سفر — جز ترکِ دیارِ زن و فرزند نبود

یعنی چونکہ میں وہم میں - جو نیست کو ہست کی صورت میں دکھاتا ہے - گرفتار نہ تھا، اسی لئے کعبہ کے عزمِ سفر سے میرا مقصد زن و فرزند کا ملک چھوڑ دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

٩ اے جامِ شرابِ شادکامی زدہٗ — در جور دم از بلند نامی زدہٗ

یاد آر زمن چو بینی اندر راہے — تنہا روِ خستۂ حرامی زدہٗ

حرامی = قزاق، حرامی زدہ قزاقوں کا لوٹا ہوا۔ اس شعر میں معشوق کی طرف خطاب کیا ہے اور اپنی حالت کو اُس مسافر کے مشابہ بتایا ہے جو تنہا ہو، مجروح ہو، اور قزاقوں نے اُسے لوٹ لیا ہو، گویا معشوق کو قزاق ٹھیرایا ہے۔

١٠ اے آنکہ ترا سعی بدرمانِ من ست — منعم مکن از بادہ کہ نقصانِ من ست

حیف ست کہ بعدِ من بمیراث رود — ایں یک دو سہ خم کہ در شبستانِ من ست

تَوحی

تزیہ

تعلّی

استقامت

تَوحی

نا اجماع چہ گوئی بہ علی باز گر اے | مہ جائے نشین مہر باشد۔ نہ نجوم

یہ رباعی مرزا کے تفضیلی ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ تشیّع پر؛ کیونکہ خلفائے ثلثہ پر نجوم کا اطلاق حضرات شیعہ نہیں کر سکتے۔

۳ راہیست ز عبد تا حضورِ اللہ | خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبےٰ کہ نشانہا دارد | سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

کہتا ہے کہ بندے سے خدا کی حضور تک ایک راہ ہے؛ خواہ اسکو دراز سمجھو خواہ کوتاہ سمجھو۔ اور یہ جو کوثر و طوبےٰ ہیں جنمیں اُسکی راہ کے کچھ کچھ نشاں پائے جاتے ہیں۔ یہ ایسے ہیں جیسے اثنار راہ میں چشمہ اور سایہ آجاتا ہے۔

۴ آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود | از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بجہاں خانۂ و زن نیست درو | نازم بخدا چرا توانا نبود

تیسرے مصرع میں دارد کا فاعل خدا ہے جسکا نام چوتھے مصرع میں لیا ہے خانہ سے مراد خانہ کعبہ ہے باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

۵ با دستِ غم۔ آں باد کہ حاصل ببرد | آب رخِ ہوشمند و غافل ببرد
بگذاشتہ ام خمے ز صہبا بہ پسر | کش اندہِ مرگِ پدر از دل ببرد

کہتا ہے کہ غم ایک ہوا ہے۔ ایسی ہوا کہ تمام خرمن کو اڑا لیجائے؛ اور دانا اور ناداں کی آبرو کو بہالے جائے؛ اسی لئے میں بیٹے کے لئے ایک شراب کا مٹکا چھوڑ چلا ہوں؛ تاکہ باپ کے مرنے کا غم اُسکے دل سے دھو دے۔

ہمنے دونو شاعروں کی غزلوں کی شرح بخوبی کردی ہے، مگر زیادہ نکتہ چینی کرنا غیر ضروری سمجھا ہے اور دونو غزلوں میں محاکمہ کرنا بھی ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ خود بشرطیکہ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہونگے، اس بات کا اندازہ کر لینگے کہ دونو غزلوں میں کیا نسبت ہے۔

رباعیات

مرزا کی رباعیاں تعداد میں قریب سوا سو کے ہیں جنمیں سے اکثر شوخی و بیباکی، بادہ خواری، فخر و مباہات، اور شکایت و زار نالی کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ اور کسی قدر متصوفانہ، اور چند خاص خاص مضامین پر ہیں۔ خمریات میں ظاہرا عمر خیام کا تتبع معلوم ہوتا ہے۔ مرزا کی رباعی میں بہ نسبت عام غزلیات کے زیادہ صفائی و شگفتگی اور گرمی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ان میں سے کسی قدر رباعیاں بطور نمونے کے یہاں نقل کیجاتی ہیں۔ اور جہاں ضرورت ہوگی رباعی کے ساتھ اسکی شرح بھی کردیجائیگی۔

۱ غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم
زاں رو بصفای دم تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی۔ زدم چنگ بشعر
شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

گہر و گوہر۔ اصل۔ دودہ۔ نسل و خاندان۔ زادشم پشنگ کے باپ اور تورابن فریدوں کے بیٹے کا نام ہے۔ جسکی نسل میں مرزا اپنے تئیں بتاتے ہیں۔ دم تیغ۔ تلوار کی دھار۔ دمم یعنی میرا کلام سپہبدی۔ سلطنت و سپہ سالاری۔ نیا۔ دادا۔ نیاگاں جمع۔ کہتا ہے کہ جب سپہبدی ہماری قوم سے رخصت ہوگئی تو میں نے شعر کہنا اختیار کرلیا، گویا بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بنگیا۔

۲ شرطست کہ بہر ضبط آداب و رسوم
خیزد بعد از نبی امام معصوم

کہ یا شکستہ آدمی کو جو چلنے پھرنے نہیں دیتے، اور جب تک ہڈی جُڑ نہ جائے مقید رکھتے ہیں۔ اس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ آخر کار اُسکو راحت حاصل ہو۔ ظہوری کے شعر میں کسی قدر جدت ہے مگر شعر کی بندش سست اور ڈھیلی ہے مرزا کے ہاں مضمون میں کچھ ایسی جدت نہیں ہے مگر بیان نہایت چست اور ٹھیک ٹھاک ہے۔

غالب	ظہوری
اگر نہ بہرِ من - از بہرِ خود عزیزم دار	نہ بندگاں نسزد آرزو - خدا نکند
کہ بندہ - خوبیِ اُو خوبیِ خداوند ست	ہمیں بس ست کہ با بندہ او خداوند ست

ظہوری کے شعر میں "خدا نکند" یا تو محض حشو ہے، اور یا اُسکے بعد کچھ عبارت مقدر ہے یعنی "خدا نکند کہ ما آرزو بکنیم" باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

مرزا کا شعر اُن کی غزل میں بیت الغزل ہے؛ اور معنیً اور لفظاً دونو طرح سے ظہوری کے شعر پر ترجیح رکھتا ہے۔

غالب	ظہوری
نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب	اسیرِ عشق - ظہوری نشانہ دارد
بدیں کہ پرسد و گویند ہست خرسند ست	نشانہ اینکہ بہ بیدادِ دوست خرسند ست

ظہوری کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اسیرِ عشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ دوست کے ظلم سے خوش رہتا ہے۔ مرزا کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ میرا مقصود وفا کی تلاش سے یہ نہیں ہے کہ میں اہلِ دنیا سے وفا کا طالب ہوں؛ بلکہ میں اسی میں خوش ہوں کہ میں پوچھوں کہ دنیا میں وفا ہے؟ اور لوگ اُسکے جواب میں کہیں کہ ہاں ہے۔ دونو مقطع ہموار ہیں مگر باوجود اِسکے مرزا کا بیان بانکپن سے خالی نہیں۔

اِسکے سوا لفظی مناسبتیں جیسے حسن و عشق، وجود و ہستی، دشمن و دوست، اور بخت و اقبال یا تمام شعر کا متناسب اجزا میں تقسیم ہونا۔ اسنے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔

ظہوری	غالب
ز رہروانِ تو منزل شمار را کہ شمرد	شمار کجروی دوست در نظر دارم
غم از کسے کہ نمیداند اندہش چند ست	دریں نورد ندانم کہ آسماں چند ست

ظہوری کہتا ہے کہ تیری راہ میں جو شخص منزلیں گنتا ہے، اور یہ خیال رکھتا ہے کہ کتنا رستہ طے ہوا اور کتنا باقی ہے۔ اُسکو تیرے رہرووں میں کون شمار کرتا ہے؟ پھر کہتا ہے کہ "غم از کسی ست"، یعنی غم معشوق اُس شخص کا حصہ ہے جسکو اپنے غم کی کمی یا زیادتی کا مطلق شعور نہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ میرے خیال میں دوست کی کجروی کا تصور ایسا جما ہوا ہے کہ مجھے یہ خبر نہیں کہ اِس نورد (یعنی کجروی) میں آسمان کی کس قدر شرکت ہے۔ مرزا کا بیان کسی قدر ظہوری کے بیان سے صاف ہے مگر مضمون کے لحاظ سے دونو شعروں میں کچھ لطافت یا خوبی معلوم نہیں ہوتی۔

ظہوری	غالب
شود گسستہ بایام گرچہ زنجیر ست	برنج از پے راحت نگاہ داشتہ اند
اسیر آنکہ تبارِ نگاہ دربند ست	زحکمت است کہ پای شکستہ دربند ست

ظہوری کہتا ہے کہ ایک مدت کے بعد لوہے کی بیڑی بھی کٹ جاتی ہے اور قیدی رہا ہو جاتا ہے۔ پس درحقیقت قیدی وہی ہے جو تارِ نگاہ معشوق میں اُلجھا ہوا ہے۔ جسکو اِس قید سے کبھی رہائی نہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ یہاں تکلیف میں اِس لئے رکھا جاتا ہے کہ راحت حاصل ہو۔ اور اِسکی مثال یہ ہے

بگو حدیث وفا از تو باور است بگو
شوم فدائے دروغی کہ راست مانند است

زبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی
نہ گویدار چہ بمرگ من آرزومند ست

مرزانے مانند کا قافیہ مطلع کے سوا پھر کسی شعر میں نہیں باندھا۔ اور ظہوری کے ہاں آرزومند کا قافیہ کہیں نہیں بندھا۔ اس لیئے یہ دونو مختلف القوافی بیتیں ایک جگہ لکھدیگئی ہیں معنی دونو کے ظاہر ہیں۔ ظہوری کا شعر بہت صاف اور لطیف اور مرزا کے شعر سے زیادہ نیچرل ہے۔ مرزانے مضمون میں جدت تو پیدا کی ہے مگر یہ سنکر کہ معشوق ہمارے مرنے کا آرزومند ہے خوشی سے مرجانا۔ واقع کے بالکل خلاف ہے۔

ظہوری

زاہل مہر و محبت نشان نمی آرم کس
بہ مہر خویش و بہ بیمہری تو سوگند ست

غالب

وجود او ہمہ حسنست و ہستیم ہمہ عشق
بہ بخت دشمن و اقبال دوست سوگند ست

ظہوری کا شعر صاف ہے۔ اول دعوے کرتا ہے کہ مہر و محبت کا دنیا میں کہیں وجود نہیں؛ اور اس دعوے پر اپنی محبت اور معشوق کی بے مہری کی قسم کھاتا ہے جسکی خوبی اور لطافت ظاہر ہے۔ مرزا کا دعوے یہ ہے کہ معشوق کا وجود سراپا حسن و جمال ہے؛ اور میری ہستی سراسر عشق و محبت ہے۔ اور اس دعوے پر رقیب کے نصیب کی اور معشوق کے اقبال کی قسم کھاتا ہے جسمیں ظہوری کی قسم سے زیادہ لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ رقیب کے نصیب کی قسم اسلئے کھائی ہے کہ جو وجود سراپا حسن و جمال ہے وہ بالکل اسی کے حصے میں آگیا ہے۔ اور معشوق کے اقبال کی قسم اس لئے کھائی ہے کہ مجھ جیسا شخص اسکے سودائیں عشق و محبت کا پتلا بنگیا ہے۔

جیسا کہ ظاہر ہے۔ مرزا کے ہاں بہ نسبت ظہوری کے زیادہ گرم بندھا ہے۔

ظہوری	غالب
چہ غم کہ عہد گسل وارِدت کشاکشِ ناز	درازدستیِ من چاکی ار فگند، چہ عیب؟
کہ ہر گسیختنی صد ہزار پیوند ست	زپیش، دلقِ ورع باہزار پیوند ست

ظہوری کہتا ہے کہ اگر ناز و غمزے کی کشاکش تجھسے عہد شکنی کراتی رہتی ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں؛ کیونکہ ہر گسیختنی (یعنی ہر عہد شکنی) لاکھ پیوند کا حکم رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس قدر تو عہد توڑتا ہے اسی قدر پیوندِ عشق زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ اگر میری درازدستی اور بے باکی و رندمشربی نے دلقِ وَرَع و تقوے کو کسی قدر پھاڑ ڈالا ہے تو میرا چنداں قصور نہیں ہے؛ کیونکہ اُسیں تو پہلے ہی سے ہزاروں پیوند لگے چلے آتے ہیں، یعنی خود اہلِ ورع و تقویٰ ہی اُسکی دھجیاں اُڑا چکے ہیں؛ مگر ریاکاری سے پیوند لگا لگا کر اُسکا عیب ڈھانکتے رہتے ہیں۔ ظہوری کے شعر میں عشق و محبت کے ایک دقیق معاملے کی طرف اشارہ ہے۔ جو عشاق پر ہمیشہ گذرتا ہے۔ اور صنعتِ تضاد کا التزام بھی نہیں چھوڑا، کہ گسیختن پر اُسکے ضدِّ حقیقی یعنی پیوند کا اطلاق کیا ہے۔ باوجودیکہ ظہوری کے ہاں یہ قافیہ نہایت عمدگی سے بندھا تھا۔ مرزا نے بھی اِس قافیے کے باندھنے میں کچھ کم دادِ بلاغت نہیں دی؛ یہاں تک کہ ظہوری کے شعر کو مشکل سے اُسپر ترجیح دیجا سکتی ہے۔

ظہوری	غالب

معشوق کے شکر خند کو طراوت دیتا ہے (یعنی ہمارے رونے پر اُسکو بے اختیار ہنسی آتی ہے)
گویا ہمارے آنسو خندۂ معشوق کی جڑ کو تر و تازہ رکھتے ہیں۔ مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق
گو بظاہر ہم سے ہنسی خوشی کے ساتھ ملتا ہے مگر کوئی دلی محبت کی بات اب تک ظہور میں نہیں آئی
جس سے ہمارا دل باغ باغ ہو جائے۔ اِس مطلب کو اِس طرح ادا کیا ہے کہ ابھی تک اُسکی
نگاہِ مہر و محبت نے لذت و حلاوت کی سُوت ہمارے دل میں جاری نہیں کی، بلکہ ہم صرف
اُسکے ظاہری شکر خند پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔

ظہوری کے ہاں وہی لفظی مناسبتیں جیسے دیدۂ تر اور تر زبانی یا زہر گریہ اور شکر خند
بہ نسبت مرزا کے زیادہ ہیں مگر مرزا کا شعر اُس سے زیادہ بلیغ بیخزل اور عاشقانہ ہے۔

غالب	ظہوری
نہ گفتۂ کہ بہ تلخی لب از و پند پذیر	مگر کہ رخصتِ بے طاقتی شود مرہم
برو۔ کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند ست	کہ گوشِ دل شدگاں ریش گشتۂ پند ست

ظہوری کہتا ہے کہ دل شدگاں (یعنی ہم عاشقوں) کے کان ناصح کی نصیحتوں سے زخمی ہو گئے
ہیں، اُن کے اِس زخم کا مرہم یہی ہو سکتا ہے کہ اُنکو بے طاقتی (یعنی بے حوصلگی اور عدم تحمل)
کی اجازت دی جائے، تاکہ وہ ناصح سے گلخپ ہو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔
مرزا ناصح سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے ناصح! تو نے یہی نہیں کہا؛ کہ تلخی (یعنی ہماری نصیحت)
سے موافقت کر لے؛ اور رہمارا کہنا مان لے۔ جا! اپنا رستہ لے؛ ہماری شراب اِس نصیحت سے
زیادہ تلخ ہے؛ پس ہمکو تیری نصیحت کی تلخی سے آشتی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ قافیہ بھی

یعنی دس دس بیت کی ہیں۔

ظہوری

بعشق قابل دیوانگی خردمندست
بُبر ز جملہ کہ آزاد مرد ایں بندست

غالب

چو صبح من ز سیاہی بشام ماندست
چگونیم کہ ز شب چند رفت یا چند است

ظہوری کہتا ہے کہ عشق میں جو شخص دیوانگی کی قابلیت رکھتا ہے اسی کو خردمند سمجھنا چاہیئے بس چاہیئے کہ تو سب سے قطع تعلق کر دے، کیونکہ جو شخص تعلقات سے آزاد ہے وہی بندۂ عشق کا مرد (یعنی اُسکے لائق) ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ جبکہ میری صبح تاریکی کے سبب شام سے مشابہ ہے تو مجھسے یہ کیا پوچھتے ہو کہ رات کتنی گذری یا کتنی باقی ہے؟ مطلب یہ کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میرے دن اور رات پر تاریکی ہی تاریکی چھائی رہتی ہے، پس مجھے کیا خبر ہے کہ کتنی رات گذری اور کتنی باقی ہے؟ ظہوری کے شعر میں اسکے سوا کچھ جدت نہیں ہے کہ اُسنے اپنی عادت کے موافق اُسمیں بھی صنعت تضاد کا التزام کیا ہے (یعنی دیوانگی پر خردمندی کا اطلاق کیا ہے اور آزاد پر مقیّد کا) مرزا نے ایک معمولی خیال میں جدت پیدا کی ہے اور نہایت صفائی سے مطلب ادا کیا ہے۔

ظہوری

بشکر دیدۂ تر۔ تر زبانیٔ وام
کہ زہر گریہ۔ طراوت دہ نشکر خندست

غالب

نگاہ مہر بدل سرنداده چشمہ نوش
ہنوز عیش باندازۂ شکر خندست

ظہوری کہتا ہے کہ میں دیدۂ تر کے شکر میں تر زبان اور رطب اللسان ہوں، کیونکہ گریہ کا زہر

اور جس قدر غزلیں مرزا نے نظیری کی غزلوں پر لکھی ہیں ان میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہوگی جس میں نظیری کی غزل کا پلہ مرزا کی غزل سے غالب نہو۔ کیونکہ اکثر پچھلے شعرا اگلوں کی انھیں غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں جو انکے سارے دیوان میں چیدہ و برگزیدہ اور منتخب ہوتی ہیں۔ پس ایسی میدان میں اگلوں سے پچھلوں کا سبقت لیجانا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔

اب ہم مرزا کی ایک غزل کا موازنہ ظہوری کی غزل کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ دونو غزلیں شیخ سعدی کی اس غزل پر لکھی گئی ہیں:

"شب فراق چہ داند کہ تا سحر چندست   مگر کسیکہ بزندانِ عشق دربندست"

اگرچہ مرزا نے ظہوری کی غزلوں پر بہت کم غزلیں لکھی ہیں۔ مگر چونکہ وہ اپنے تئیں ظہوری کا متتبع ظاہر کرتے ہیں اس لئے اسکی ایک غزل کے ساتھ بھی مرزا کی غزل کا موازنہ کرنا ضرور تھا۔ ظہوری کا دیوان جو ہمارے پاس موجود ہے اسمیں۔ یا تو کاتبوں کی تصحیف سے، اور یا خود ظہوری کی پیچیدہ بیانی کے سبب۔ اکثر اشعار کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ بہت مشکل سے صرف ایک غزل ایسی نکلی ہے جسکے ہر ایک شعر کے کچھ نہ کچھ معنی اپنی سمجھ کے موافق لگا لئے گئے ہیں، اور اسکے تمام اشعار کا مقابلہ بعض اصحاب کی معرفت دوسرے صحیح نسخہ سے بھی کر لیا گیا ہے۔ اس لئے وہی غزل موازنے کے لئے انتخاب کی گئی ہے۔ اور چونکہ وہ شیخ کی غزل پر لکھی گئی ہے اس واسطے یہ خیال کیا گیا ہے کہ ظہوری نے اسمیں اپنی پوری طاقت صرف کی ہوگی۔ ایک اور وجہ اس غزل کی تخصیص کی یہ ہے کہ مرزا نے اپنی تمام غزل میں ایک شعر کے سوا تمام اشعار میں وہی قافیے باندھے ہیں جو ظہوری کے ہاں بندھے ہوئے تھے۔ اور نیز دونو غزلیں ابیات کی تعداد کے لحاظ سے بھی برابر یعنی

دلم بسبحہ و سجادہ و ردا لرزد — کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتست

براہ حقتش من ہر کہ بنگرد داند — کہ میر قافلہ در کارواں سرا خفتست

پہلا شعر محض رندانہ ہے۔ اور زبان کی گرمی اور شوخی کے سوا اور کوئی معنوی لطافت نہیں رکھتا اُسکے بعد کے تینوں شعر ہم ستے کی ردیف کے انتخابی اشعار میں مع ہر ایک کی شرح کے لکھ آئے ہیں۔ اُنمیں سے پہلا شعر ہمارے نزدیک مرزا کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے۔ اور پچھلے دو تو شعر بھی نظیری کے غزل کے عام اشعار سے کسی طرح رتبے میں کم نہیں ہیں۔ پس اگر نظیری کا بہت ادب کیا جائے تو ہم اِس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ دونو غزلوں کو مساوی درجے میں رکھیں۔ ورنہ انصاف یہ ہے کہ ہیأتِ مجموعی کے لحاظ سے مرزا کی غزل نظیری کی غزل سے یقیناً بڑھ گئی ہے۔ لیکن ایک آدھ غزل میں نظیری سے سبقت لیجانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کی غزل کو مطلقاً نظیری کی غزل پر ترجیح دیجائے۔ نظیری وہ شخص ہے جسکی نسبت مرزا صائب کہتے ہیں۔

"صائب چہ مجال ست شوی ہمچو نظیری — عرفی بہ نظیری نرسانید سخن را"

اور مرزا جلال اسیر کہتے ہیں۔

ہمچشمی نظیری حد بشر نباشد

اور شیخ ابوالفضل آئین اکبری میں اُسکی نسبت لکھتے ہیں "دورے از نزہتگاہِ معنی بروی کشودہ اند"

پس ہماری غرض مذکورہ بالا غزلوں کے مقابلہ کرنے سے صرف اِس قدر تھی کہ مرزا نے غزل میں نظیری کے تتبع کو جس درجے تک پہنچایا تھا اُس سے لوگ اچھی طرح مطلع ہوجائیں۔ ورنہ اِس غرض کے سوا

کام تھا تشبیہ نہایت بلیغ اور دل نشین واقع ہوئی ہے۔ یعنی مجھ جیسے ادنیٰ درجے کے آدمی کو، جو تیری جناب میں نیاز ہے اُسپر مجھکو ایسا ہی ناز ہے جیسا اُس فقیر کو ہونا چاہیئے جو بادشاہی محل کی دیوار کے سائے میں پڑا ہو۔

غالب	نظیری
بخواب چون خودم آسودہ دل مدان غالب	فسانہ صرف نظیری مکن کہ خواب کند
کہ خستہ غرقہ بخون خفتہ است تا خفتست	شکستہ، کہ بصد درد مبتلا خفتست

نظیری کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ نظیری کو فسانہ اِس لیئے سُنانا فضول ہے کہ ایک شکستہ دل خفتہ آدمی (نظیری) جو طرح طرح کی تکلیف میں مُبتلا ہو کر پڑ رہا ہے۔ وہ سو رہے گا۔

مرزا کے شعر کا ماحصل یہ ہے کہ اگر میں سو بھی جاؤں تو اے غالب! مجھکو اپنی طرح آسودہ اور خوشحال نہ سمجھنا، کیونکہ بیمار (یعنی میں) جب سویا ہوں تو خون میں ڈوبا ہوا سویا ہوں۔ پس ایسے شخص کو جاگتے یا سوتے کیا راحت نصیب ہو سکتی ہے۔

یہاں تک دونو غزلوں میں سے صرف آٹھ آٹھ شعر ہم نے نقل کیئے ہیں اور مرزا کے آٹھ شعر وہ لکھے ہیں جو کسی نہ کسی قدر نظیری کے اشعار سے لفظی یا معنوی مناسبت رکھتے تھے۔ اب مرزا کے باقی اشعار، جو نظیری کی غزل سے تعداد میں زیادہ ہیں۔ لکھتے ہیں۔

کہ سر بزانوے زاہد بہ بوریا خفتست	خروش حلقۂ رندان ز نازنین پسریست
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست	ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز

کہ چند شب بہ ہم آغوشِ خود جدا خفتست　　زبختِ من خبر آرید تا کجا خفتست

نظیری کا شعر صاف ہے۔ کس۔ آں کس کی جگہ لایا ہے۔ معانقہ روزِ وصل۔ وہ معانقہ جو وصل کے دن عاشق و معشوق میں واقع ہو۔ شعر کا مضمون معمولی ہے؛ مگر الفاظ نے جان ڈال دی ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ شب ہجر کی درازی اور میری بیداری کا کیا خیال کرتے ہو؛ یہ تو کچھ بھی بات نہیں۔ ہاں یہ تلاش کرو کہ میرا نصیب کہاں پڑا سوتا ہے؛ کیونکہ رات کی درازی، اور میری بیداری، اور ایسی ایسی اور سیکڑوں مصیبتیں۔ سب اسی کے سو جانے سے پیدا ہوئی ہیں۔ محاکمہ دونو میں یہ ہے کہ نظیری کا شعر زیادہ نیچرل اور عالی ہے۔ اور مرزا کے شعر میں شاعرانہ لطافت اور خوبی نظیری کے شعر سے زیادہ ہے اور کوئی بات اس میں اَن نیچرل بھی نہیں ہے۔

نظیری　　　　غالب

شب امید بہ از روزِ عید مے گذرد　　بدیں نیاز کہ باتست ناز می رسدم

کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتست　　گدا بہ سایۂ دیوار پادشا خفتست

نظیری کا شعر اسکی تمام غزل میں بیت الغزل ہے بلکہ اسکے سارے دیوان کے ان ۴۲ نشتروں میں سے ایک نشتر ہے جو اساتذہ نے اسکی غزلیات میں سے انتخاب کیئے ہیں۔

مرزا کا شعر گو نظیری کے شعر کی برابری نہیں کرسکتا۔ مگر ایسے بلند شعر پر یہ شعر کا لانا مرزا ہی کا

اِس تقریر سے ظاہر ہے کہ مآل دونو کا یہ ہے کہ معرفتِ ذات محالات سے ہے۔ مگر ہمارے نزدیک مرزا کا بیان نظیری کے بیان سے زیادہ بلیغ اور زیادہ دلکش واقع ہوا ہے۔

نظیری	غالب
طبیبِ عشق بُبیرد طمع ز بیمارے	بصبحِ حشر چنیں خستہ روسیہ خیزد
کہ شب براحت ازیں دردِ بیدوا خفتست	کہ در شکایتِ دردِ غمِ دوا خفتست

نظیری کہتا ہے کہ مرضِ عشق کا طبیب اُس بیمار کے علاج سے مایوس ہو جاتا ہے جو کسی رات کو اس دردِ بے دوا یعنی عشق کی بیچینی سے آرام کے ساتھ سوگیا ہو؛ گویا مریضِ عشق کی علامتِ محمودیہی ہے کہ اُسکو کبھی راحت نصیب نہو۔ مگر شعراے متصوفین کے اصول کے موافق نظیری کے بیان میں یہ خلل تھا کہ وہ راحت کو ردی علامت بتاتا ہے؛ حالانکہ عاشقِ صادق کی علامت یہی ہے کہ اُسکو دوست کی راہ میں درد اور تکلیف کبھی محسوس ہی نہو؛ بلکہ ہر ایک درد اور تکلیف عینِ راحت معلوم ہو۔ پس نظیری کے بیان سے گویا یہ لازم آتا تھا کہ عاشقِ صادق وہی ہے جو ہمیشہ بیچینی اور بیقراری میں بسر کرے؛ اور جب ایسا ہوگا تو کبھی نہ کبھی شکایت بھی اُسکی زبان سے نکلے گی۔

مرزا نے اسی لئے اس مضمون کو اُلٹ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بیمار حشر کے دن روسیاہ اُٹھے جو دردِ دل کی شکایت اور دوا کی تلاش کرتا ہوا سویا ہے۔

نظیری	غالب
کس از معانقہ روزِ وصل یابد ذوق	درازیِ شبِ بیداریِ من از نیمہ نیست

آرام بالکل برباد کر دیتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ تیرا غم شہر میں لوگوں کے گھروں پر شبخون مار رہا ہے اور کوتوال اپنے گھر میں اور بادشاہ محلسرا میں چین سے پڑے سوتے ہیں یہ سچ ہے کہ مرزا کے دل میں یہ خیال نظیری کے شعر سے پیدا ہوا ہے مگر مرزا کی غیر معمولی اُپچ اور بلند پروازی کے ثبوت کے لیئے صرف یہی اقتباس کافی ہے کہ تھوڑے سے تصرف سے نظیری کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ نیز مرزا کے بیان میں حقیقت و مجاز دونو پہلو موجود ہیں اور نظیری کا بیان صرف مجازی معنی میں محدود ہے۔

غالب	نظیری
ببیں زدور ومجو قرب شہ کہ منظر را	شمیم مہر ز باغ وفا نمے آید
دریچہ باز و بدروازہ اژدہا خفتست	بہر چمن کہ تو نشگفتۂ صبا خفتست

اگرچہ مآل دونو شعروں کا واحد ہے، مگر دونوں کے بیان کا عالم الگ الگ ہے۔ نظیری اس طرح بیان کرتا ہے کہ وفائے حقیقی کے باغ سے مہر و التفات کی خوشبو نہیں آتی، گویا جس چمن میں وہ پھول (یعنی معشوقِ حقیقی) کھلا ہوا ہے وہاں کی صبا پڑی سوتی ہے (یعنی اُسکو اہتزاز مطلق نہیں ہے) جس سے اُس چمن کی خوشبو عالم میں پھیلے۔

مرزا یوں کہتے ہیں کہ آثار و افعال کے ذریعے سے اُسکو دُور ہی سے دیکھ لو، اور قربِ شاہ یعنی ذاتِ بحت کی تلاش مت کرو، کیونکہ اگرچہ جھروکے کے پٹ کھلے ہوئے ہیں (یعنی اُسکے آثار و افعال سب پر ظاہر ہیں) مگر اندر کوئی نہیں جانے پاتا، کیونکہ عین دروازے پر اژدھا سوتا ہے۔

نظیری معشوق کی اس حالت کو جب کہ وہ سوتے سے اٹھا ہو، اور آنکھیں کچھ کھلی اور
کچھ مندی ہوں اور اپنا جی اسکے سامنے سے پرے ہٹنے کو چاہتا ہو، اس طرح ادا کرتا ہے
کہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے، اور ہمارا پانوں سو گیا ہے؛ پس اسکی چشم نیم باز کے عشوے سے
کیونکر رہائی ہوگی۔

مرزا مسافر کی اس حسرت ناک حالت کو جب کہ راہ بے خطر اور منزل مقصود قریب ہو مگر نہ مسافر
میں نہ اسکی سواری میں آگے قدم اٹھانے کی طاقت ہو اس طرح بیان کرتے ہیں دگر ازمنی
راہ الخ ان دونو شعروں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر مطلقاً ترجیح نہیں دی جا سکتی جو عاشقانہ
مضامین کو پسند کرتے ہیں وہ ضرور نظیری کے شعر کو پسند کرینگے مگر اس لحاظ سے کہ مرزا کا بیان
عاشق اور غیر عاشق سب کے حالات پر حاوی ہے اور ہر شخص جسپر ایسی حالت گذرے اسکا
مصداق ہو سکتا ہے یقیناً نظیری کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے۔

نظیری	غالب
کسے بہ قلب شبم ترکتاز مے آید	غمت بشہر شبیخون زنان بہ بنگہ خلق
کہ بر فراش قصب پای در حنا خفتست	عسس بخانہ و شہ در حرم سرا خفتست

نظیری کا شعر محض عاشقانہ ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ مضمون اول اسکو سوجھا ہے مرزا
کے شعر پر ترجیح دینے کے قابل ہے کہتا ہے کہ میرے گھر پر آدھی رات گئے وہ شخص آکر ڈاکا
ڈالتا ہے جو ریشمی بچھونوں میں پانوں کو مہندی لگائے پڑا سوتا ہے مطلب یہ کہ اسکا تصور
اور اسکا خیال بغیر اسکے کہ اسکو اطلاع ہو رات کو آکر چھاتی پر سوار ہو جاتا ہے اور راحت،

اجل رسیدہ چہ داند بلا کجا خفتست — بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

نظیری نے اس بات کو کہ عشق ایسے طور پر فتنہ پیدا ہو جاتا ہے جسکا سان گمان تک نہیں ہوتا - ایک معمولی حالت کے پیرائے میں جو ہمیشہ صید اور صیاد کے باہم گذرتی رہتی ہے - بیان کیا ہے ۔ نظیری کا بیان - جیسا کہ ظاہر ہے - بہت صاف اور نیچرل ہے ۔ اور گو یہ مطلع اُسکے اعلےٰ درجے کے اشعار میں محسوب نہیں ہو سکتا لیکن مرزا کے مطلع سے بہر حال بہتر ہے ۔

مرزا نے گویا اپنی ناگوار زندگی کا دشوار گذار مرحلہ خوشی خوشی طے کرنے کو اِس تمثیل میں بیان کیا ہے کہ جس خطرناک وادی میں حضرت خضر بھی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں میں وہاں سینے کے بل چلتا ہوں ۔ مرزا کے اس مطلع پر اُن کی زندگی میں "عصا خفتست" کے لفظ پر اعتراض ہوا تھا ؛ مرزا نے جواب دیا کہ سعدی نے بھی تو کہا ہے "دو سے بجاے اول عصاے پیر بخفت" ۔ مگر اس جواب کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا ؛ کیونکہ شیخ کے ہاں اس قدر قرائن موجود ہیں کہ "عصا خفتن" سے جو معنی اُسنے بطور استعارے کے مراد رکھے ہیں اُن کے سوا دوسرے معنی کی طرف خیال ہی نہیں جاتا ۔ بخلاف مرزا کے شعر کے ۔ کہ جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ سعدی نے عصا خفتن کے یہ معنی لئے ہیں ۔ تب تک اُس سے یہ معنی مفہوم نہیں ہو سکتے ۔

غالب	نظیری
دگر ز ایمنی راہ و قرب کعبہ چہ حظ	کجا ز عشوۂ آں چشم نیم باز رہیم
مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست	کہ فتنہ خاستہ از خواب و پای ما خفتست

مرزا کی غزلیات - جو مقدار میں چار ہزار بیت سے کچھ زیادہ ہیں، اور جن میں منتخب اور برگزیدہ شعار
ایک چوتھائی سے کم نہونگے - انہیں سے کسی قدر اشعار - جو سرسری نظر میں صاف اور عمدہ معلوم ہوئے
بطور نمونے کے یہاں نقل کردئے گئے ہیں تاکہ جو لوگ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں - مگر اتنا دماغ
نہیں رکھتے کہ مرزا کے کلام کو اول سے آخر تک بنظر غور دیکھیں - وہ مرزا کی غزل کا نمونہ دیکھکر اس بات کا
اندازہ کرسکیں کہ مرزا کی غزل شعرائے ایران کے کون سے طبقے کی غزل سے مناسبت رکھتی ہے؟ اور
انکی اور مرزا کی غزل میں کیا نسبت پائی جاتی ہے؟ اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی
چند غزلوں کا موازنہ اُن سب لوگوں کی غزل کے ساتھ کیا جاتا جنکی غزل پر مرزا نے اپنی غزل بلکہ اپنی
تمام شاعری کی بنیاد رکھی ہے؛ یعنی نظیری، عرفی، ظہوری، طالب، اسیر وغیرہ مگر چونکہ اس مختصر
میں زیادہ گنجائش نہیں، اور نیز عام طبائع کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلبستگی بھی نہیں معلوم ہوتی
اس لئے یہاں مرزا کی صرف دو غزلوں کا مقابلہ نظیری اور ظہوری کی غزلوں سے - کہ اسوقت ان
دونوں کے دیوان ہمارے پاس موجود ہیں - کیا جاتا ہے ۔

نظیری کی جو مشہور غزل "با خفتست" اور "بلا خفتست" ہے مرزا صاحب نے بھی اسپر غزل
لکھی ہے - نظیری کی غزل نو بیت کی ہے جسمیں سے ایک شعر پڑھا نہیں گیا اور مرزا کی غزل بارہ بیت
کی ہے - اس لئے مرزا کی غزل میں سے بھی اول صرف آٹھ بیتیں یہاں لیجائینگی تاکہ ٹھیک ٹھیک موازنہ
ہوسکے اور بعد موازنے کے مرزا کے باقی اشعار بھی نقل کردئے جائینگے ۔

نظیری	غالب
نظر بفا ہر و صیاد در خفا خفتست	بوادئے کہ دراں خضر را عصا خفتست

ہر کو دلست در برش - داغِ تو رویدش زدل　　　تا چو بدیگرے دہد - باز بری بداوری

کہتا ہے کہ جسکے پہلو میں دل ہے اُسکے دل سے تیرا داغ رویدگی کی طرح اُگتا ہے؛ اور یہ اس لئے کہ اگر وہ دل کسی اور سے لگالے تو تو اِس محبت سے - کہ تیری نشانی اُسپر موجود ہے - وہاں سے اپنی چیز یعنی دل واپس لے لے۔ داوری جھگڑا انتا۔ اور محبت۔

رشکِ ملک چہ و چرا؟ چوں بتو رہ نمی برد　　　بیہدہ در ہوائے تو می پَرَد از سکسری

یعنی ہم ملائکہ پر کیوں رشک کریں جبکہ وہ بھی بے فائدہ تیری تلاش میں پرواز کرتے پھرتے ہیں اور تجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔

حیف کہ من بخوں تپم - وز تو سخن رود کہ تو　　　اشک بدیدہ بشمری، نالہ بسینہ بنگری

یعنی افسوس ہے کہ میں تو خون میں پڑا ہوا لوٹوں اور تیری نسبت یہ کہا جاے کہ تو آنسو آنکھ کے اندر گن لیتا ہے اور فریاد کو سینے کے اندر دیکھ لیتا ہے۔

کوثر اگر بمن رسد خاک خورم زبے نمی　　　طوبیٰ اگر زمن شود ہیمہ کشم زبے بری

یعنی میری شومی بخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوثر مجھکو ملجاے تو اُسمیں نمی باقی نرہے اور مجھے اُس خاک کے سوا کچھ حاصل نہو اور اگر طوبیٰ میری مِلک ہوجائے تو وہ ایسا بے بر ہوجائے کہ اُسکی لکڑی ایندھن کے کام آئے۔

بینیم از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل　　　غالب اگر دمِ سخن رہ بضمیرِ من بری

کہتا ہے کہ اگر فکرِ شعر کے وقت تو میری حالتِ درونی کو ٹٹولے تو دل کی گداز سے ایک آگ کی رو بہتی ہوئی تجھکو نظر آئے۔ یہ اُس جوش اور اُس آگ کا بیان ہے جو اصلی شاعروں کے دلمیں شعر کہتے وقت بھڑکتی رہتی ہے۔

یعنی اگر اس کہنے میں تیری کسر شان نہ ہو تو اے غالب تیری مثال ابر بہاری کی سی ہے کہ موتی برساتا ہے اور انکی گنتی نہیں بتاتا یعنی بے شمار موتی برساتا ہے۔

دریاز حباب آبلہ پاے طلبست   نور نظر اے گوہر نایاب کجائی

شوریست نواریزی تار نفسم را   پیدا نہ اے جنبش مضراب کجائی

یعنی میرے تار نفس سے جو نغمے نکل رہے ہیں انھوں نے ایک شور برپا کر رکھا ہے۔ مگر اے جنبش مضراب کہ جس سے یہ تار بج رہا ہے تو کہاں ہے؟ تیرا کہیں پتا نہیں۔

بنماے بہ گوسالہ پرستاں ید بیضا   غالب بہ سخن صاحب فرتاب کجائی

فرتاب کرامت اور معجزے کو کہتے ہیں۔ گوسالہ پرستوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو [illegible] اشیاء کو مانتے ہیں۔

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمار دلبری   در دل سنگ بنگرد رقص بتان آزری

دیدہ ور یعنی صاحب نظر وہ شخص ہے کہ جب اسکو یہ خیال پیدا ہو کہ دنیا میں کون سی چیزیں دلکش و دلربا ہیں تو وہ انگھڑ پتھر کے اندر بتان آزری کو رقص کرتے ہوئے دیکھ لے یعنی مادے میں جو قابلیت اور استعداد خدا نے ودیعت کی ہے وہ پہلے اس سے کہ قوت سے فعل میں آئے اسپر ظاہر ہو جائے۔

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہ تو روی نیست   در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

یہ خطاب ہے جناب احدیت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جس ذرے کو دیکھئے اسکا منہ تیرے ہی رستے کی طرف پھرا ہوا ہے اور اس لئے تیری راہ طلب میں خود بادیہ یعنی صحرا کو اپنا رہبر بنایا جا سکتا ہے کیونکہ اسکا ہر ذرہ تیری طرف رہنمائی کرتا ہے۔

غزل مسلسل

ایکہ گفتم نہ بہی داد دل - آرے نہ ہی | تا چو من دل بہ مغان شیوہ نگارے ندہی
چشمۂ نوش ہمانا نہ تراود ز دلے | کش نگیری و در اندیشہ فشارے ندہی

کہتا ہے کہ اُس دل سے یقیناً چشمۂ نوش نہیں ٹپک سکتا جسکو کہ تو بھینچکر تصور میں فشار نہ دیوے۔ یعنی جب تک کہ دل عشقِ مجازی کے صدمے نہیں جھیلتا اور طرح طرح کی کوفت اسمیں نہیں اُٹھاتا اُسمیں صفائی اور لطافت اور گھلاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

ماہ و خورشید دریں دائرہ بیکار نیند | تو کہ باشی؟ کہ بجز زحمتِ کارے ندہی

اور وہ کام یہی ہے کہ عشق کے شکنجے میں دل کو فشار دیا جاوے۔

سر براہِ دمِ شمشیر جوانی نہ نہی | تن بہ بندِ غمِ فتراکِ سوارے ندہی
خوں بذوقِ غمِ یزداں نشناسے نخوری | دیں بمہرِ حقِ الفت نگذارے ندہی

یزداں نشناس اور حقِ الفت نگذار، دونوں مرکب صفتیں ہیں - باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

آخرِ کار نہ پیداست؟ کہ در تن فسرد | کفِ خونے کہ بداں زینتِ دارے ندہی

فسرد فسردن کا مضارع ہے - فسردن ٹھٹھر جانا خشک ہو جانا - یعنی کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے؟ کہ وہ خون جس سے تو کسی صلیب کو رنگین نکریگا مرنے کے بعد بدن میں خشک ہو کر رہجائیگا۔

حیف گر تن بسگانِ سرِ کوئے نرسد | واے گر جاں بسرِ رہگذارے ندہی
رہزنانِ اجل از دستِ تو ناگاہ برند | نقدِ ہوشے کہ بسوداے بہارے ندہی
بخمِ طرۂ حورانِ بہشت آویزند | ناز پروردہ دلے را کہ بیارے ندہی
گر تنزل ننمود - ابرِ بہاری غالب | کہ در افشانی و در افشاندہ شمارے ندہی

کہتا ہے کہ تو سینے میں دل کی طرح اور دل میں جان کی طرح بیٹھ چکا ہے؛ پھر بھی تیری نگاہِ مہر فزا کا وہی حال ہے جو پہلے تھا؛ کہ محبت کی آگ بھڑکائے چلی جاتی ہے۔

عتاب و مہر تو از ہم شناختن نتواں — خرد فریب ادائے کہ داشتی داری
جہانیاں ز تو برگشتہ اند گر غالب — ترا چہ باک؟ خدائے کہ داشتی داری

بیہودہ نیست سعیِ صبا در دیارِ ما — اے بوئے گل پیامِ تمنائے کیستی
یادش بخیر تا چہ قدر سبز بودۂ — اے طرفِ جوئبارِ چمن جائے کیستی

جائے کسے سبز بودن۔ اُسکی جگہ کا خالی رہنا۔ اور سبز ہونے کے معنی سرسبز و شاداب ہونے کے بھی ہیں۔ طرفِ جوئبار۔ کنارۂ جوئبار۔ چمن کی پٹڑی پر سبزہ دیکھکر کہتا ہے کہ اے کنارۂ جوئبارِ چمن! تو جو اِس قدر سرسبز و شاداب ہے تو کس کی جگہ ہے۔ چونکہ وہاں معشوق کو نہیں پایا اِس لئے بطورِ شگون نیک کے اول یادش بخیر کہکر پھر سوال کرتا ہے۔

نشنیدہ لذتِ تو فرو میرد و بدل — اے حرف! محوِ لعلِ شکرخائے کیستی
از ہیچ نقشِ غیر نکوئی ندیدۂ — اے دیدہ محوِ چہرۂ زیبائے کیستی
یا ہیچ کافر ایں ہمہ سختی نمیرود — اے شب بمرگِ من کہ تو فردائے کیستی

بمرگِ من یعنی اے شب تجھکو میری موت کی قسم۔ چونکہ اُس وقت اپنی موت سے زیادہ کسی چیز کو عزیز نہیں سمجھتا اِس لئے رات کو اپنی موت کی قسم دے کر پوچھتا ہے کہ تو کسکی فردائے قیامت ہے؛ یعنی جو سختی کہ تجھ میں میرے اوپر گذر رہی ہے کسی کافر کے ساتھ نہ گذرتی ہوگی۔ پھر تو کافر سے بھی بڑھکر کونسے گنہگار کی قیامت کا دن ہے؟ بتا تو سہی!

زرد شت کیشے آتش پرستے | برسم گزارے زمزم سرائے

برسم - جھاؤ یا انار وغیرہ کی بالشت بالشت بھر کی لکڑیاں کاٹ کر آتش پرست رکھ لیتے ہیں، اور عبادت، یا نہانے، یا کھانے کے وقت ان کو ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں۔ برسم گزار اور زمزم سرائے آتش پرست کو کہتے ہیں۔ زمزم اور زمزمہ وہ دعا ہے جو آتش پرست برسم ہاتھ میں لیکر پڑھتے ہیں۔

در کینہ ورزی تفسیدہ دشتے | در مہربانی بستاں سرائے

تفسیدہ دشت تپتا ہوا صحرا - باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

از زلف پرخم مشکیں نقابے | از تابش تن زریں ردائے

یعنی زلف پرخم اسکے چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سیاہ نقاب منھ پر پڑی ہوئی ہو۔ اور جو کپڑا وہ بدن پر ڈالتا ہے وہ بدن کی چمک دمک سے سنہری معلوم ہوتا ہے۔

در عرض دعوے لیلے نکوہے | بر رغم غالب مجنوں ستائے

یعنی جب دعوی حسن و جمال کرتا ہے تو لیلی کی ہجو کرتا ہے؛ اور غالب کے چڑانے کو مجنوں کی تعریف کرتا ہے کہ وہ بڑا عاشق صادق تھا۔

تو کے ز جور پشیماں شدی - چہ می گوئی | دروغ راست نمائے کہ داشتی داری

یعنی تو جو یہ کہتا ہے کہ "میں ظلم سے پشیماں ہو گیا ہوں"، تو کب پشیماں ہوا ہے؟ کیونکہ وہ جھوٹ جو سچ معلوم ہو۔ جیسا تو پہلے بولتا تھا اب بھی بولتا ہے۔ بس تیرا یہ کہنا کہ میں ظلم سے پشیماں ہوں یہ بھی اسی ظلم میں داخل ہے۔

بسینہ چوں دل و در دل چو جاں خزیدی و باز | نگاہ مہر فزائے کہ داشتی داری

تو نے گنہگار کے ساتھ مدارا یعنی رعایت کی اور اُسکو بخش دیا تو یہ عین انتقام ہے ؛ وہ اِس شرمندگی سے - کہ باوجود اِس قدر گناہوں کے ہمکو کچھ سزا نہیں دی - گویا سات دوزخوں میں جھونک دیا گیا ۔

صد کشاد آنرا کہ ہم امروز رنج بنمودہ ۔۔۔ مژدہ باد آں را کہ محو ذوق فردا کردہ

خستگاں را دل بہ پرسشہای پنہاں بردہ ۔۔۔ با درستاں گر نوازشہاے پیدا کردہ

خستگاں - زخمی اور شکستہ دل لوگ یعنی جنکی حالت زار بظاہر ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا اُنپر خدا کا غصہ ہے ۔ درست - صحیح و سالم کو کہتے ہیں ؛ درستاں اُسکی جمع ہے یعنی وہ لوگ جنکی حالت درست اور ہر ایک خستگی اور شکستگی سے محفوظ ہے - گویا اُنپر خدا کی عنایت و مہربانی سب سے زیادہ ہے ۔ کہتا ہے کہ اگر تو نے درستوں پر ظاہری عنایتیں مبذول فرمائی ہیں تو زخمی دلوں کو پوشیدہ مہربانیوں سے مفتوں کیا ہے ۔

چشمۂ نوش است از زہر عتابت کام جاں ۔۔۔ تلخی مے در مذاق ما گوارا کردہ

خدا تعالے کے غصّے اور عتاب کو چشمۂ نوش قرار دیتا ہے ؛ اور اُسکو شراب سے تشبیہ دی ہے - کہ جس طرح شراب کا ذائقہ ہر شخص کو تلخ معلوم ہوتا ہے ، مگر شرابیوں کے مذاق میں اُس سے زیادہ کوئی شے خوشگوار نہیں - اسی طرح تیرا عتاب گو بظاہر تلخ معلوم ہو مگر تیرے عشاق اُسکو چشمۂ نوش سمجھتے ہیں ۔

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است ۔۔۔ خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردہ

کہتا ہے کہ تو نے مخلوقات کو پیدا کر کے اُنمیں اپنے حسن کا آپ تماشا دیکھا ہے ؛ تو گویا جلوۂ حسن اور نظارۂ عشق درحقیقت ایک ہی جنس سے ہیں یعنی ناظر اور منظور ایک چیز ہیں ۔

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود ۔۔۔ پیش ازاں کیں در رسد آنرا مہیا کردہ

دم سے مراد بات ہے دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ اسکے غم میں آدم کو گندم جیسی عزیز چیز فراموش ہو جاتی ہے۔

گہے ملعنہ بر لحنِ مطرب سرودہ | گہے خندہ بر نطق ہمدم گرفتہ

بہ بیداد صد کشتہ برہم نہادہ | بہ بازیچہ صد گونہ ماتم گرفتہ

یعنی آپ ہی مارتا ہے اور آپ ہی بطور کھیل کے ماتم کرتا ہے۔

بروئیش زگرمی نگہ تاب خوردہ | بگویش بہ رفتن صبا دم گرفتہ

نیارد زمن ہیچ گہ یاد ہرگز | مگر خوے خاقانِ اعظم گرفتہ

ظفر کز دم اوست در نکتہ سنجی | کہ غالب بآوازہ عالم گرفتہ

یہاں دم کے معنی افسون اور کرامت کے ہیں تقدیر عبارت یوں ہے کہ غالب در نکتہ سنجی بہ آوازہ عالم گرفتہ۔

چوں زبانہا لال و جانہا پر ز غوغا کردہ | با بدت از خویش پرسید انچہ با ما کردہ

یہ تمام غزل توحید میں ہے۔ کہتا ہے جبکہ تونے ہماری زبانیں گونگی کر دی ہیں اور باوجود اسکے جانوں کے اندر شورش بھر دی ہے۔ اب تو اپنے ہی سے پوچھ لے کہ تونے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

گر نہ مشتاقِ عرض دستگاہِ حسن خویش | (جاں فدایت) دیدہ از بہر چہ بینا کردہ

ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمر است | انتقام ست ایں کہ با مجرم مدارا کردہ

کہتا ہے کہ شرمندگی وہ عذاب ہے جسکی نہاد یعنی ذات میں ساتوں دوزخ چھپی ہوئی ہیں۔ پس اگر

تاکہ مجھسے ضبط نہو سکے، اور کھل کھیلوں، اور اس جگر خواری کے عذاب سے نجات پاؤں۔

سرمایہ کرامت کن وانگاہ بغارت بر　　　بر خرمنِ ما برقے بر مزرعہ باران شو

اگرچہ ہوتا ہمیشہ یہی ہے کہ اول سرمایہ دیتے ہیں پھر جب چاہتے ہیں اُسکو تباہ کر دیتے ہیں مگر شاعر بطور مبالغہ کے یہ جتاتا ہے کہ ہماری کھیتی پر مینہ تو کبھی نہیں برساتا مگر خرمن پر بجلی گراتا رہتا ہے یہ انسان کی ایک قدرتی خاصیت ہے کہ مصیبتوں کے وقت نعمتوں کو بالکل فراموش کر دیتا ہے اسی خاصیت پر شاعر نے شعر کی بنیاد رکھی ہے۔

ذیل کی غزل مسلسل اور محض عاشقانہ ہے جس میں معشوق کی خصلتیں بیان کی ہیں، اور اُسکو بہادر شاہ کی تعریف اور شکایتِ ظریفانہ پر ختم کیا ہے۔ اِس غزل میں صرف حسنِ بیان کا لطف ہے، خیالات بلند نہیں ہیں۔

بتے دارم از اہلِ دل رم گرفتہ　　　بشوخی دل از خویشتن ہم گرفتہ

دل گرفتن اُکتا جانا یعنی اِس قدر شوخ اور نازک مزاج ہے کہ اپنے آپ سے بھی بگڑ جاتا ہے۔

ز سفاک گفتن چو گل بر شگفتہ　　　دریں شیوہ خود را مُسلّم گرفتہ

یعنی اگر کوئی اُسے سفاک کہتا ہے تو بُرا نہیں مانتا بلکہ خوش ہوتا ہے گویا اپنی سفاکی کو مسلّم الثبوت مانے ہوئے ہے۔

فسوں خواندہ و کارِ عیسےٰ نمودہ　　　پری بودہ و خاتم از جم گرفتہ

یعنی افسوں سے معجزے کا کام لیتا ہے اور پری ہوکر جمشید کی انگوٹھی چھین لیتا ہے۔

ومش از خست در زہد یوسف فگندہ　　　غمش گندم از دستِ آدم گرفتہ

کسی کے ذہن نشین کرنے نہایت مشکل تھے ؛ مگر الحمد للہ کہ خود ہماری قوم میں حسنِ اتفاق سے اسوقت
ایک شخص موجود ہے جسکی حالت پر نظر کرنے کے بعد اس شعر کے کوئی دوسرے معنی ان معنوں سے
زیادہ چسپاں نہیں معلوم ہوتے یعنی ڈاکٹر سر سید احمد خاں جسنے کافر، ملحد، نیچری، دجال، سب کچھ
کہلوانا منظور کیا مگر قوم کی خیرخواہی سے دست بردار نہوا۔

از ہرزہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن — جوئی ! بہ خیاباں رو سیلی ! بہ بیاباں شو

ہرزہ یعنی برائے نام جاری ہو جانے سے قلزم نہیں ہوا جا سکتا۔ اے مخاطب تو ایک نالی ہے باغ
کی کیاریوں میں جا ؛ اور ایک رَو ہے جنگل کی راہ لے۔ یہ اُن ناقص العیار لوگوں کی طرف خطاب ہے
جو کسی فن میں تھوڑی سی شُد بُد حاصل کر کے اپنے تئیں کاملین میں شمار کرنے لگتے ہیں۔

گر چرخِ فلک گردی سر بر خطِ فرماں نہ — ور گوئے زمیں باشی وقفِ خمِ چوگاں شو

یعنی تو کیسا ہی عالی رتبہ اور گرانمایہ ہو جائے اطاعت و فرمانبرداری کرنی ضرور ہے چاہو اطاعت
کو عام لو اور چاہو خاص خدا کی فرمانبرداری مراد رکھو کیونکہ جس طرح دین میں بغیر خدا اور رسول کی
فرمانبرداری کے کام نہیں چلتا اسی طرح دنیا میں سلاطین و ملوک، اور ماں اور باپ اور افسر اور
آقا وغیرہ کی اطاعت کے بغیر کچھ بن نہیں آتی۔

در بندِ شکیبائی مُردم ز جگر خائی — اے حوصلہ تنگی کن۔ اے غصہ فراواں شو

کہتا ہے کہ صبر کے شکنجے میں میں کلیجہ مسوستا مسوستا مرگیا یعنی تھک گیا۔ اب سوا اسکے اور کسی طرح
اِس بلا سے چھٹکارا نہیں کہ حوصلہ تنگی کرنے لگے اور غم حد سے بڑھ جائے۔ پس کہتا ہے کہ اے حوصلے!
تو جیسا کہ اب تک فراخ اور وسیع رہا ہے اب برخلاف اُسکے تنگ ہو جا ! اور اے غم ! تو زیادہ ہو جا !

کہتا ہے کہ ہستی کے دھوکے کا غبار جو راہ میں اُٹھا ہوا نظر آتا ہے یہ سب بیٹھ جائیگا یعنی سب فنا ہو جائیں گے اور توحید عیانی کا دریا موجزن ہوگا یعنی ذاتِ واحد کے سوا کچھ باقی نہ رہیگا۔

دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو ، کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

کہتا ہے کہ دولت یعنی سعادت کبھی غلطی نہیں کرتی ؛ وہ اُسی کے پاس جاتی ہے جو اُسکے لائق ہوتا ہے۔ پس تو اے مخاطب اپنی سعی سے پشیماں ہو۔ اور وہ دولت کیا ہے ؟ کافر ہونا۔ کہتا ہے کہ تو کافر تو نہیں ہو سکتا لاچار مسلمانی پر قناعت کر۔ غالباً مرزا نے کفر سے وہ کفر مراد لیا ہے جو صوفیہ کرام کی اصطلاح کے موافق ایک بڑا مرتبہ مراتب فقر و درویشی میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن قطع نظر ان معنوں کے اِس شعر کے ایک اور معنی نہایت لطیف و پاکیزہ زمانے کے حسبِ حال بھی ہو سکتے ہیں۔ جو شاید شعر کہتے وقت مرزا کے خیال میں نگذرے ہوں ؛ مگر ضرور ہے کہ اُنھیں کے نتائج افکار میں شمار کئے جائیں۔ کیونکہ بلغا اکثر کلام کی بنیاد ایسے جامع اور حاوی الفاظ پر رکھتے ہیں کہ گو قائل کا مقصود ایک خاص معنی سے زیادہ نہو مگر کلام اپنی عمومیت کے سبب بہت سے محل رکھتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا مسلمان ہونا جسکو سارا زمانہ مسلمان کہے اور مسلمان سمجھے۔ یہ تو بہت آسان ہے ؛ مگر قوم کی بھلائی کی وہ تدبیریں کرنی۔ کہ اُسکی بھلائی اُنکے بغیر دشوار معلوم ہو۔ اور اُن تدبیروں کے اختیار کرنے میں لوگوں کے طعن و تشنیع سے نہ ڈرنا۔ یہاں تک کہ بدمذہب اور کافر مشہور ہونا مگر قوم کی خیر اندیشی سے دست کش نہونا۔ نہایت دشوار بلکہ بعض حالتوں میں قریب ناممکن کے ہے ؛ کہ ہزاروں اور لاکھوں میں نہیں بلکہ کروروں میں ایسا ایک فرد دنیا کی عجائبات میں سمجھا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا کافر بننا تو بہت مشکل ہے ؛ ناچار مسلمانی پر اکتفا کر۔ یہ معنی

تم ہو کافر نہ مسلماں

ہے چہ می گویم؟ اگر اینست وضع روزگار		دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن

اِس سے پہلے بطور فخر کے کہا تھا کہ یوں ہوگا اور وُوں ہوگا؛ پھر کہتا ہے کہ ہے ہے میں کیا کہتا ہوں؟ اگر زمانے کا حال ایسا ہی رہا تو دفترِ شعر بابِ سوختن یعنی جلا دینے کے لائق ہو جائیگا۔

چشم کور آئینۂ دعوی بکف خواہد گرفت		دستِ شل مشاطۂ زلفِ سخن خواہد شدن

شاہدِ مضموں کہ اینک شہری جان و دلست		روستا آوارۂ کام و دہن خواہد شدن

یعنی آیندہ یہ حال ہو گا کہ شاہدِ مضموں جو اب جان و دل کے شہر میں مقام رکھتا ہے وہ کام و دہن کے دیہات میں آوارہ ہو جائیگا۔ یعنی جن اشعار اور خیالات میں اب نہایت دقیق اور گہری نگاہ سے غور کیجاتی ہے وہ صرف لوگوں کی زبانوں پر رہجائینگے اور انکی تہ کو کوئی نہ پہونچیگا۔

زاغ راغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زناں		ہم نوائے پردہ سنجانِ چمن خواہد شدن

جنگلی کوّے (یعنی تُک بندی کرنے والے شاعر) نغمہ سنجی کی ہوا میں پنکھ پسارے ہوئے چمن کے نغمہ سنجوں (یعنی عالی درجہ شاعروں) کی برابری کرینگے۔

شاد باش ایدل درین محفل کہ ہر جا نغمہ ایست		شیونِ رنجِ فراقِ جان و تن خواہد شدن

آب کہتا ہے کہ دنیا میں اِن باتوں کا فکر کرنا بے سود ہے؛ یہ سب نغمے موزوں ہوں یا ناموزوں ایک دن موت کے نوحے بنجائیں گے۔

ہم فروغِ شمعِ ہستی تیرگی خواہد گزید		ہم بساطِ بزمِ مستی پر شکن خواہد شدن

گردِ پندارِ وجود از رہگذر خواہد نشست		بحرِ توحیدِ عیانی موجزن خواہد شدن

مومن - یعنی حکیم مومن خاں - جنکے دیوان اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہیں۔ نیّر - یعنی نواب ضیاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو - جنکا کلام دونوں زبانوں میں بقدر معتدبہ موجود ہے مگر کوئی دیوان مرتب نہیں ہوا۔ **صہبائی** - یعنی مولانا امام بخش - جنکی نظم و نثر فارسی اور دیگر رسائل اور شروح تین ۳ جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ **علوی** مولانا عبداللہ خاں علوی اُستادِ مولانا صہبائی - جنکی نظم و نثرِ فارسی چھپ چکی ہے؛ اور عربی میں بھی اُنکے قصائد موجود ہیں۔ **حسرتی** - نواب محمد مصطفٰے خاں رئیس جہانگیر آباد - جنکے دیوان اردو و فارسی دونوں زبانوں میں چھپ چکے ہیں؛ اور اِسکے سوا سفرنامہ حج، تذکرہ گلشن بیخار اور رقعات فارسی بھی اُنکی تصانیف سے شائع ہو چکی ہیں۔ **آزردہ** مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں جنکا کلام اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں موجود تھا مگر افسوس ہے کہ اُسمیں سے بہت کچھ ضائع ہو گیا ہے۔ لیکن بعض مذہبی رسالے جو اُن سے یادگار رہگئے ہیں شائع ہو چکے ہیں۔

تازہ دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن — ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است — شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

مطرب از شعرم بہر بزمے کہ خواہد زد نوا — چاک ہا اینا بجیبِ پیرہن خواہد شدن

حرف حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت — دستگاہِ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

کہتا ہے کہ میرا ایک ایک حرف مذاقِ فتنہ میں جگہ پائیگا - یعنی فتنہ کو پسند آئیگا - جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ برہمن اُسکو اپنے موافق سمجھے گا اور شیخ اپنے موافق خیال کریگا؛ اور دونوں اپنی اپنی جگہ اُسپر فخر کرینگے، اور ایک دوسرے کو جھٹلائینگے؛ اور آپس میں گل خپ ہونگے۔

یعنی وہ اس طرح مناجبت روائی کرتا ہے کہ اکثر مجھکو شعور نہیں ہوتا کہ کیونکر یہ کام بنگیا۔

ذیل کی غزل نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اُسمیں پڑھی گئی تھی۔ چونکہ دلی کے تمام نامور شعرا کا۔ جو وہاں فارسی غزلیں لکھکر لیجاتے تھے۔ مرزا نے اس غزل میں ذکر کیا ہے اور غزل بھی نہایت فصیح ہے اس لئے بطور یادگار کے ساری غزل یہاں نقل کیجاتی ہے۔

ذرّہ یی جیرہ تر از لالۂ مرہم زیشاں	دل بِ مردم بخم طرۂ خم در خم شاں
کافر نشد تبہاں چہرے۔ کہ ہرگز نبود	طرۂ حور دلاویز تر از پرچم شاں
آشنگا رکشش، و بدنام نکو نامی چو	آہ ازیں طائفہ۔ وانکس کہ بود محرم شاں
رشک بر تشنۂ تنہا رو بِ وادی دارم	نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزم شاں
بگذر از خستہ دلانے کہ ندانی۔ ہش دار	خستگانند کہ دانی و نداری غم شاں

یعنی اُن مصیبت زدوں کو جانے دے جنکو تو نہیں جانتا؛ مگر خبردار رہ کہ بہت سے ایسے آفت زدہ ہیں جنکو تو جانتا ہے مگر اُن کا کچھ غم تجھکو نہیں۔

داغِ خوں گرمی ایں چارہ گرانم گوئی	آتش است آتش اگر سینہ و گر مرہم شاں
ایکہ رانی سخن از نکتہ سرایانِ عجم	چہ با منتِ بسیار نہی از کمِ شاں
ہندرا خوش نفسانند سخنور۔ کہ بود	بادِ در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی۔ وانگاہ	حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں
غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار	ہست در بزمِ سخن ہمنفس و ہمدمِ شاں

دانش و گنجینہ پنداری یکے ست　　　حق نہاں داد آں چہ پیدا خواستیم

پنداری اور گوئی اور گویا کے ایک معنی ہیں۔ کہتا ہے کہ علم اور خزانہ گویا ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ جو چیز ہمنے علانیہ مانگی - یعنی دولت - وہ خدانے ہمکو پوشیدہ طور پر دی یعنی علم و ہنر

رفت و باز آمد ہما در دام ما　　　باز سر دادیم و عنقا خواستیم

کہتا ہے کہ ہما ہمارے دام میں پھنس کر نکل گیا تھا پھر آن پھنسا، اب چاہیے تھا کہ اُسکی زیادہ نگرانی کرتے اور اُسکو نکلنے نہ دیتے، مگر ہمنے اُسکو خود چھوڑ دیا اور عنقا کی خواہش کی۔ ہما سے مراد دولت دنیا، اور عنقا سے مراد احدیت ذات۔

رخشے در سفر از برگ سفر داشتہ ایم　　　توشہ راہ - دلے بود کہ بر داشتہ ایم

داغ احسان قبولی لیمانش نیست　　　ناز بر خرمی بخت ہنر داشتہ ایم

قبولی اور قبول ایک معنی میں آتا ہے۔ خرمی بخت ہنر یعنی سرسبزی بخت ہنر - کہتا ہے کہ ہمکو اپنے ہنر کی خوش نصیبی پر ناز ہے کیونکہ اُسپر کمینوں کی قبولیت کے احسان کا داغ نہیں ہے۔ یہاں خرمی بخت کا لفظ استہزائً ناسازی بخت پر بولا گیا ہے۔

زخم جگرم بخیہ و مرہم نپسندم　　　موج گہرم جنبش و رفتار ندارم

یعنی جس طرح زخم جگر تک بخیہ و مرہم کی رسائی نہیں ہے اور آب گوہر کی موج میں جنبش و رفتار نہیں ہے، ایسا ہی میرا حال ہے - یعنی نہ کسی کو میرے درد کی خبر ہے، نہ میرے کمال کی اطلاع ہے

نقد ہنرم سکہ سلطاں نپذیریم　　　جنس ہنرم گرمی بازار ندارم

غالب نبود کوتہی از دوست ہمانا　　　زاں ساں دہدم کام کہ بسیار ندارم

بوہم شب ہمہ را در غلط بیندازیم　　　ز نیمہ رہ رمہ را باشباں بگردانیم

یعنی سب کو راستہ کے دھوکے میں ڈال دیں۔ یہاں تک کہ چرواہے کو ریوڑ سمیت آدھے رستے سے شہر کی طرف اُلٹا پھیر دیں۔

بجنگ باج ستانانِ شاخساری را　　　تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم

یعنی جو لوگ درختوں سے میوہ اور فواکہ کی ڈالی لینے کو آئیں انکو ڈر کر باغ کے باہر ہی سے خالی چھال کے ساتھ پھیر دیں۔

بصلح بال فشانانِ صبحگاہی را　　　ز شاخسار سوے آشیاں بگردانیم

یعنی جو پرندے صبح کو گھونسلوں سے درختوں پر آکر کلیل کرتے ہیں اُن کو نرمی اور چمکار کے ساتھ گھونسلوں کی طرف لوٹا دیں۔

ز حیدریم من و تو۔ ز ما عجب نبود　　　گر آفتاب سوے خاوراں بگردانیم

کہتا ہے کہ ہم تم حیدری ہیں۔ ہمسے تعجب نہیں کہ جس طرح بقولِ بعض حیدر کرار سے معجزہ ردالشمس ظاہر ہوا تھا۔ ہم بھی آفتاب کو مشرق کی طرف واپس پھیر دیں۔

رفت بر ما انچہ خود ما خواستیم　　　وایہ از سلطاں بغوغا خواستیم

قاعدہ ہے کہ جب فقیر بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور و غل کرتا ہے تو اُسکو مار کر ہٹا دیتے ہیں اور کچھ نہیں دیتے۔ کہتا ہے کہ ہم پر جو سختی گذری وہ خود ہمنے ہی چاہی تھی۔ کیونکہ بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت غل شور بہت کیا۔ اِس لئے وہاں سے دھتکارے گئے اور کچھ نہ ملا۔ سلطان سے مراد خدا تعالےٰ ہے۔

چھین لیا ہے۔ مرزا کے مقطع کا مطلب اب یہ ہوگیا کہ نظیری کی غزل پر غزل لکھنی بھی تو
خطا۔ مگر میں نے اُس پر ایسی غزل لکھی ہے کہ اپنی اِس خطا پر آفریں کا امیدوار ہوں۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم　　قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

معشوق سے کہتا ہے کہ تو آ، تاکہ آسماں کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا
ہم تم دونوں ملکر پلٹ دیں، اور حکم قضا کو رطل گراں یعنی جام شراب کی گردش سے پھیر دیں

بگوشہ بنشینیم و در فراز کنیم　　بکوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم

در فراز کنیم یعنی دروازہ بند کردیں اور چوکیدار کو حکم دیں کہ کوچے میں پھرتا رہے اور کسیکو آنے نہ دے

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم　　وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم

اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم　　وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
(یعنی نیندیشیم)

گل افگنیم و گلابے برہگذر پاشیم　　مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

ندیم و مطربے ساقی ز انجمن رانیم　　بکار و بارِ زنے کارواں بگردانیم
(خادمہ)

گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم　　گہے ببوسہ زباں در دہاں بگردانیم

لابہ تملق و خوشامد سخن کو ادا کے ساتھ ملانا رازِ چاؤ اور راز و نیاز کی باتیں کرنا۔

نہیم شرم بیک سو و باہم آویزیم　　بشوخیئے کہ رخ اختراں بگردانیم

ز جوش سینہ سحر را نفس فرو بندیم　　بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم

یعنی اختلاط کے موقع پر ہم دو تو ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کردیں، اور اسکو
طلوع نہونے دیں، اور دن کی گرمی کی بلا جہاں سے ٹالدیں۔

غزل سلسل عاشقانہ

اس شعر کے مصداق وہ مکار اور ریاکار لوگ ہیں جو بظاہر متشرع اور مقدس سمجھکر انکے آگے کوئی بات ہنسی یا ایسے تہذیبی یا رندمشربی کی کہتے ہوئے شرم آتی ہے، مگر انکو ذرا ٹٹول کر دیکھئے تو وہ بڑی کی اوجھل شکار کھیلنے والے نکلتے ہیں۔ اس میں خطاب معشوق کی طرف ہے۔ جو نو عمر ہونے کے سبب مقدس آدمیوں کی صحبت سے بھاگتا ہے۔

نشستہ ام بگدائی بشاہراہ وہنوز ہزار دزد بہر گوشہ درکمین دارم

ہنوز کا لفظ یہاں ایسا ہے جیسا اردو میں "تاہم" یا "باوجود اسکے" بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ میں امیروں کی مدح سرائی کے لحاظ سے تو ایسا ہوں جیسے شاہراہ میں ایک گدا بیٹھا ہو مگر اس لحاظ سے کہ لوگ میرے مضمون چراتے ہیں۔ میرا یہ حال ہے کہ ہزاروں چور میری گھات میں لگے ہوئے ہیں۔

ز وعدہ دوزخیاں را فزوں نیازارند توقعے عجب از آہ آتشیں دارم

کہتا ہے کہ اہل دوزخ کو ظاہر ہے کہ میعاد معین سے زیادہ دوزخ میں نہ رکھینگے؛ پس اس خیال سے میں اپنی آہ آتشیں سے ایک عجیب توقع رکھتا ہوں؛ یعنی یہ کہ آہ آتشیں بھی ہمیشہ نہ رہے گی؛ اس توقع کو عجیب اس لئے کہا ہے کہ اسکو بھی دوزخ پر قیاس کرکے اس سے آخرکار نجات کا امیدوار ہے۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

دوسرا مصرع نظیری کا ہے۔ جس کا پہلا اصل مصرع یہ ہے "دو حرف سادہ و لیہائے من تواں بخشید" نظیری اگلا یہ شعر بڑے رتبہ کا ہے؛ مگر حق یہ ہے کہ مرزا نے یہ مصرع تضمین کیا گیا ہے گویا اسکو

یاد باد آں روزگاراں کاعتبارے داشتم — آہِ آتش ناک و چشمِ اشکبارے داشتم

جوانی کے زمانے کو یاد کرتا ہے۔ جبکہ بوالہوسی یا عشق و محبت زور شور پر تھا، آہ آتشناک تھی اور آنکھ اشکبار۔

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلف برطرف — ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

ایں چہ شورست کہ از شوقِ تو در سر دارم — دل پروانہ و تمکینِ سمندر دارم

آں چہ اوراطرب و ایں چہ بود در تعب — خندہ بر غفلتِ درویش و توانگر دارم

کہتا ہے کہ میں درویش اور توانگر دونوں کی غفلت پر ہنستا ہوں جبکہ دنیا کا طرب اور تعب دونوں ہیچ ہیں تو ایک خوش کیوں ہے؟ اور دوسرا رنجیدہ کس لئے ہے؟

راز دارِ تو و بدنام کنِ گردشِ چرخ — ہم سپاس از تو و ہم شکوہ ز اختر دارم

خدا سے کہتا ہے کہ جو مجھے تکلیف پہنچتی ہے اُسکی مصلحت کو خوب سمجھتا ہوں، اگر آسمان کو بدنام کرتا ہوں۔ میں درحقیقت تیرا احسانمند ہوں مگر بظاہر ستارے کا شکوہ گزار۔

خوشنودم از تو و ز پئے دورباشِ خلق — آوازۂ جفائے تو در عالم افگنم

کہتا ہے کہ میں نے تجھکو جفاکار اس لئے مشہور کر رکھا ہے کہ اور کوئی تیری طرف رغبت نکرے ورنہ میں درحقیقت تجھسے ہر طرح راضی اور خوشنود ہوں۔

دوزند گر بفرض زمین را بہ آسماں — حاشا کزیں فشار در ابروخم افگنم

ہم بعالم ز اہلِ عالم برکنار افتادہ ام — چوں امام سجہ بیروں از شمار افتادہ ام

زمن حذر نکنی گر لباسِ دیں دارم — نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

روا نہ کردہ ایم یعنی جاری کردہ ایم۔ کہتا ہے کہ چونکہ لب پر یاعلی جاری ہے اِس لحاظ سے
تو ہمنے مذہب حق اختیار کیا ہے ، اور چونکہ اُسپر شراب جاری ہے اِس لحاظ سے مغوں یعنی
آتش پرستوں کا سا عیش کرتے ہیں یعنی دنیا اور دین دونو ہمکو حاصل ہیں۔

بادہ بوام خوردہ و زر بقمار باختہ ۔۔۔ وہ کہ زہر چہ ناسزاست ہم بسزا نکردہ ایم

یعنی شراب پینا اور روپیہ ضائع کرنا تو برا تھا ہی ہمنے ان برائیوں کو بھی خوبی کے ساتھ نہ کیا
شراب پی تو قرض کی ، اور روپیہ کھویا تو جوے میں۔

نالہ بلب شکستہ ایم۔ داغ بدل نہفتہ ایم ۔۔۔ دولتیان ممسکیم ز ربخزانہ کردہ ایم

نالہ بلب شکستہ ایم یعنی اُسکو منہہ سے نہیں نکلنے دیتے ، اور ضبط کرتے ہیں ، اور داغ کو دل میں
چھپائے رکھتے ہیں ؛ ہم دولتمند تو ہیں مگر خسیس ہیں اپنی دولت کو خزانے میں رکھتے ہیں۔

گر فرامشی بفریادم رسد وقت خوشست ۔۔۔ رفتہ ام از خویشتن چندانکہ در یادِ خودم

کہتا ہے کہ میں اپنے آپ سے تو گذر گیا ہوں مگر ابھی آپنے کو بھولا نہیں ہوں اگر فراموشی
اسوقت میری فریاد کو پہنچے اور آپنے کو بھلا بھی دے تو بہت مناسب ہے۔

ہر قدم لختے ز خود رفتن بود در بارِ من ۔۔۔ ہمچو شمع بزم در راہ فنا زادِ خودم

کہتا ہے کہ راہ فنا میں جو کچھ کہ میرے بار یعنی خورجی یا زنبیل میں ہے وہ صرف یہی ہے
کہ ہر قدم پر تھوڑا تھوڑا اپنے آپ سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ گویا جس طرح کہ شمع راہ فنا
میں آپ ہی اپنا زادِ راہ ہے۔ کہ برابر پگھلتی جاتی ہے اور زاد راہ کی طرح گھٹتی جاتی ہے۔ اسی
طرح میں بھی آپ اپنا زادِ راہ ہوں۔

نابلد ہیں، یا یوں کہو کہ اِس رستے میں گمراہ ہیں یا وہ معرفتِ الٰہی کو اِس قدر دشوار نہیں سمجھتے جس قدر کہ عُرفا اور کُمّلِ اولیا سمجھتے ہیں۔ اِس مطلب کو یوں بیان کرتا ہے کہ میری گمراہی کی شامت سے راہ اپنے اوپر اِس طرح بل کھاتی ہے جس طرح رُسّی یا ڈورا زیادہ بل کھانے سے چھوٹا ہو جاتا ہے پس وہ یعنی راہِ معرفت باوجودیکہ بہت دور و دراز ہے مجھکو کوتاہی کا عشوہ یعنی فریب دیتی ہے۔

شعلہ چاکِ عنم کرا۔ گُل شگفتہ فردکو؟   شمعِ شبستانیم۔ بادِ سحرگاہیم

اپنی مصیبت اور اپنی فیض رسانی اور اُسپر لوگوں کی بیدردی اور ناقدردانی ظاہر کرتا ہے کہتا ہے کہ مَیں گویا شمعِ شبستانی ہوں کہ اُسمیں سے شعلے جھڑتے ہیں مگر کسی کو اُسکے ساتھ ہمدردی نہیں۔ اور گویا میں بادِ سحرگاہی ہوں جو پھول کھلاتی ہے مگر اُسکی اُجرت کوئی نہیں ادا کرتا۔

از صفِ طفلان و سنگ رہ شدہ بر خلق تنگ   زود ز کو نگذرد کوکبۂ شاہیم

یعنی میری شاہانہ سواری کوچے سے جلد نہیں گذرتی کیونکہ لڑکوں کے ہجوم اور پتھروں کے پتھراؤ سے راہ تنگ ہو جاتی ہے۔

جذبِ تو باید قوی کاں برد۔ باک نیست   گر نتواند رسید بخت بہمراہیم

کہتا ہے کہ تیرا جذبہ قوی چاہئے جو مجھکو منزل تک لیجائے۔ بس نصیب اگر میرے ساتھ نہ چل سکے تو کچھ حرج نہیں۔

غالبِ نام آورم نام و نشانم مپرس   ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

برلب دُعا علیؑ سرائے۔ بادہ روانہ کردہ ایم   مشربِ حق گزیدہ ایم عیش منانہ کردہ ایم

فخریہ

شوخی

تصوف

مراجعت

انتظام

خطرہ ہوتا ہے اور اسکی کمک کے لئے کوئی سوار آتا ہے تو اول گرد نظر آتی ہے بعد سوار نمودار ہوتا ہے مگر اس دشت میں گرد یعنی آثار و علامات تو سب موجود ہیں مگر سوار کا کہیں پتہ نہیں۔

چنیں کہ نخل بلند است و سنگ نا پیدا | ز میوہ تا نہ فتد خود ز شاخسار چہ حظ

یعنی جبکہ نخل اس قدر بلند ہے اور پھل جھاڑنے کے لئے پتھر ناپید ہیں تو جب تک میوہ خود درخت سے نہ گرے۔ یعنی جب تک جاذبۂ عنایت ہمکو خود اپنی طرف نہ کھینچے اور شاہد حقیقی خود اپنی تجلی نہ دکھائے۔ ہمکو کیا فائدہ؟

نہ مرا دولت دنیا۔ نہ مرا اجر جمیل | نہ چو نمرود توانا۔ نہ شکیبا چو خلیل

بنہ و بار بہ شبگیر در افگندہ براہ | آنکہ دانست سراسیمگی صبح رحیل

بنہ و بار۔ ساز و سامان۔ شبگیر پچھلی رات۔ یعنی جو شخص یہ جانتا ہے کہ کوچ کی صبح کو کیسی گھبراہٹ اور کھلبلی پڑتی ہے وہ رات ہی سے تمام ساز و سامان باندھ جوڑ کر رستے کے سرے پر ڈال دیتا ہے۔

نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را | اے بہ ترسا بچگاں کردہ مے ناب سبیل

یہ خطاب ہے خدا کی طرف۔ معنی ظاہر ہیں۔

غالب سوختہ جاں را چہ بگفتار آری | بدیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

ندانند نظیری را ز قتیل یعنی نظیری اور قتیل میں فرق نہیں کرتے۔

بسکہ بہ تجربۂ خویش جادہ ز گمراہیم | رہ چو درازی دہر عشوۂ کوتاہیم

ایک معقول بات کو محسوسات کی تمثیل میں ظاہر کیا ہے مطلب یہ ہے کہ جو لوگ طریق معرفت سے

جان کہ اٹھا یعنی جو جان کے جانے سے کیفیت ہوتی ہے وہی اُسکے جانے سے ہوئی۔

عاشقانہ

دل زبان را رازدان آشنائیہا نخواست | گاہ ہماں گفتمش گاہے فلان نامیدمش
در سلوک از ہر چہ پیش آمد گذشتن داشتم | کعبہ دیدم نقش پائے رہروان نامیدمش
دل ورغمش بسوزا کہ جان میدہد عوض | ور جان دہی بغمے بہ ازاں میدہد عوض
بے ہودہ سخن سرائی مارائگاں کہ دوست | دل می برد زما و زبان میدہد عوض

کہتا ہے کہ یہ سخن سرائی ہمکو مفت نہیں ملی ہے، بلکہ دوست جب دل لے لیتا ہے تو اُسکے عوض زبان عنایت کرتا ہے۔ زبان کو دل کا عوض قرار دینے میں شاعر نے لطافت یہ رکھی ہے کہ فی الحقیقۃ جب تک انسان کہیں دل نہیں دیتا اور عاشق نہیں ہوتا تب تک زبان میں گرمی اور شعلہ بیانی پیدا نہیں ہو سکتی، خواہ عشق مجازی ہو اور خواہ عشق حقیقی۔

رندانہ

رندانہ

تصوف

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ | ترا کہ ہست و نیا شامی از بہار چہ حظ
خوش ست کوثر و پاکست بادہ کہ درو نیست | ازاں رحیق مقدس درین خمار چہ حظ
چمن پُر از گل و نسرین و دلربائی نیست | بدشت فتنہ ازیں گرد بے سوار چہ حظ

چمن پُر از گل و نسرین سے مراد دنیا ہے، اور دلربا سے مراد وہ ذات بے نشان ہے جو دید و دریافت سے باہر ہے۔ کہتا ہے کہ اِس فتنہ خیز دشت یعنی دنیا میں۔ جہاں قدم قدم پر راہزن اور قزاق گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ اِس گرد بے سوار سے کیا مدد پہنچ سکتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب راہ میں مسافر کو

---

* ہماں اور فلاں دونو مرادف یکدگر ہیں۔ جب کسی کا نام صراحۃً نہیں لینا ہوتا تو وہاں یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اردو میں ایسے موقع پر وہ یا وہ شخص یا اُمکا ڈھمکا بولتے ہیں ۱۲

اور جب امر پہ آتا ہے تو ضرور کے معنی دیتا ہے۔

دود سودائے تتق بست، آسماں نامیدمش — دیدہ بر خواب پریشاں زد، جہاں نامیدمش

دنیا و مافیہا کا ہیچ ہونا بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ایک خیالی دھواں اُٹھکر شامیانہ سا بنگیا ہمنے اسکا نام آسمان رکھدیا۔ اور آنکھ کو ایک پریشان خواب نظر آیا اسکو جہان سمجھ گئے۔ اسی طرح اسکے بعد کے کئی شعروں میں اسی مضمون کی تفصیل ہے۔ مثلاً

وہم خاکے ریخت در چشمم بیاباں دیدمش — قطرۂ بگداخت بحر بیکراں نامیدمش

باد دامن زد بر آتش نوبہاراں خواندمش — داغ گشت آں شعلہ از مستی خزاں نامیدمش

چونکہ نوبہار میں تمام جذبات نفسانی جوش میں آتے ہیں، اور عشق و ہوس کی تحریک ہوتی ہے اس لئے بہار کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوانے آگ کو دامن سے سُلگایا میں نے اسکو بہار قرار دیدیا۔ اور جب وہ شعلہ جل بجھا تو میں نے اسکا خزاں نام رکھدیا۔

غربتم ناسازگار آمد وطن فہمیدمش — کرد تنگی حلقۂ دام آشیاں نامیدمش

کہتا ہے کہ جب پردیس میں مجھے تکلیفیں پہنچنے لگیں تو میں اسکو وطن سمجھا؛ گویا جب دام کے حلقہ نے تنگی کی تو میں اسکو اپنا آشیانہ سمجھ گیا۔ مطلب یہ کہ وطن میں اس قدر بے مہری اور مغائرت لوگوں سے دیکھی تھی کہ جب پردیس مجھکو راس نہ آیا تو میں نے اسکو بھی وطن ہی تصور کرلیا۔

بود در پہلو بہ تمکینے کہ دل مے گفتمش — رفت از شوخی بہ آئینے کہ جاں نامیدمش

یہاں بود کی ضمیر معشوق کی طرف راجع ہے۔ کہتا ہے کہ وہ میرے پہلو میں ایسی تمکین کے ساتھ بیٹھا تھا جس طرح پہلو میں دل رہتا ہے۔ اور وہ شوخی سے اُٹھکر اس طرح چلا گیا کہ میں اسکو

زبانہ شعلہ وہ تجلی جو سنگ و گیاہ یعنی کوہ طور اور نخل ایمن پر ظاہر ہوئی تھی اُسکی طرف خطاب کرتا ہے کہ اے شعلہ طور! پتھر اور درخت سے جو کہ تیرے قابل نہیں ہیں کیوں لپٹتا ہے؟ ہماری آنکھ کی راہ سے دل میں اُترا اور جان سے بھڑک اُٹھ۔

عاشقانہ

عیادت است نہ پرخاش تند خوئی چیست؟ — بیا و غمزہ دہ بنشین و لب گزاں برخیز

معشوق عیادت کو آیا ہے اور عاشق کا حال نہایت سقیم دیکھکر بے لطف ہوا ہے اُس سے کہتا ہے کہ تو عیادت کے لیئے آیا ہے، لڑائی کے لیئے نہیں آیا! پھر یہ تند خوئی اور بد مزاجی کیسی ہے؟ یہاں آکر بے لطفی کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ پس آ۔ اور مغموم بیٹھ۔ اور ہونٹ کاٹتا ہوا اُٹھ۔

اخلاق

نفس چو رام بود گو دو دیو را بفرماں گیر — محرم سلیمانم نقش خاتم از من پرس

کہتا ہے کہ جب نفس مغلوب ہو گیا پھر جن کو محکوم کر لینا آسان ہے۔ میں سلیمان کا محرم راز ہوں، اُسکی انگوٹھی پر یہی نگیں کندہ تھا جس سے تمام جن اُسکے محکوم تھے۔

مدح امام / منقبت

بوسہ از لبانم دہ، عمر خضر از من خواہ — جام مے بہ پیشم نہ، عشرت جم از من پرس

ورد من بود غالب، یا علی بو طالب — نیست بخل با طالب، اسم اعظم از من پرس

کہتا ہے کہ میرا وظیفہ یا علی ابن ابی طالب ہے! مجھکو طالب صادق سے کچھ بخل نہیں ہے؛ اسم اعظم مجھسے پوچھ کہ یہی "یا علی" اسم اعظم ہے۔

عاشقانہ

لطف بحت ہر نگہ خشمگیں شناس — آرایش جبین ستمگراں زچیں شناس

اخلاق

بے غم نہاد مرد گرامی سمے شود — زنہار قدر خاطر اندوہگیں شناس

زنہار کے معنی یہاں ضرور بالضرور کے ہیں۔ یہ لفظ جب نہی پر آتا ہے تو ہرگز کے معنی ہوتے ہیں

کہتا ہے کہ میں جس وادی میں ہوں یہاں کا پانی تو تلخ ہے اے ہمدم فرزانہ اگر تو فیاض ہے تو شہر سے میرے لیئے سرچشمۂ نوش یعنی شراب لا۔

دانم کہ زرے داری۔ ہر جا گذرے داری | مے گر ندہد سلطاں از بادہ فروش آور

گر مغ بہ کدو ریزد برکف نہ و راہی شو | ور شہ بسبو بخشد بر دار و بدوش آور

کہتا ہے کہ تیرے پاس دام بھی ہیں، اور تو سب جگہ آتا جاتا بھی ہے؛ اگر بادشاہ عطا کرے تو فبہا۔ ورنہ بادہ فروش سے لا۔ اگر مغ (آتش پرست) یعنی بادہ فروش تو نبے میں ڈالدے تو تونبا ہاتھ پر رکھ اور چلدے۔ اور جو بادشاہ گھڑا بھر کر عنایت کرے تو کندھے پر اُٹھا اور لے آ۔

ریحاں و مد از مینا رامش چکد از قلقل | آں در رہ چشم افگن ایں از پے گوش آور

رامش۔ راگ۔ آں سے مراد ریحاں اور ایں سے مراد قلقل۔

گاہے بسبکدستی از بادہ ز خویشم بر | گاہے بسیہ مستی از نغمہ بہوش آور

گاہے بسبکدستی یعنی کبھی جلدی سے مجھکو شراب پلا کر مدہوش کردے اور پھر جب میں بدمست ہوجاؤں تو مجھکو گانا سُنا کر ہوشیار کر۔

غالب۔ کہ بقایش باد۔ ہمپائے تو گر نایذ | بارے غزلے، فردے، ازاں موینہ پوش آور

ہمپائے تو یعنی ہمراہِ تو۔ موئنہ پوش اونی کپڑے پہننے والا۔ مرزا جاڑے میں روئی دار کپڑا نہیں پہنتے تھے، اکثر اونی یا پشمینے کا چغہ کوٹ، اور ٹوپی وغیرہ پہنتے تھے۔

یقین عشق کن و از سرِ گمان برخیز | بآشتی بنشیں یا بہ امتحاں برخیز

چرا بہ سنگ و گیا ہیچی اے زبانۂ طور | ز راہِ دیدہ بدل در رو و ز جاں برخیز

سونے میں، جاگنے میں، غرضکہ ہر کام اور ہر چیز میں تجربے کی ہدایت کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔

زاہد از حورِ بہشتی بجز ایں نشناسد | کہ شود دست زدِ شوق بکارت نرود

دست زدِ شوق ہونا یعنی شوق کے زیرِ مشق ہونا - خلاصۂ مطلب یہ کہ زاہد شریعت کے تمام الفاظ سے انکے حقیقی معنی مراد لیتا ہے اور کسی بات کو تمثیل و استعارہ و کنایہ پر محمول نہیں کرتا۔

بیا و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر | چو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر

کہتا ہے کہ آ - اور دیدار کی تمنا جو میرے دل میں جوش مار رہی ہے اُسکو دیکھ - اور پلکوں کے رستے سے آنسو کی طرح میرا ٹپکنا ملاحظہ کر۔ جوشِ تمنائے دیدار کی تصویر اس سے بہتر غالباً کسی نے نہ کھینچی ہوگی کہ "میں آنسو کی طرح پلکوں کے رستے سے ٹپکا جاتا ہوں"

زمن بجرمِ طپیدن کنارہ می کردی | بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد | در انتظارِ ہما دام چیدنم بنگر

کہتا ہے کہ ہما کے انتظار میں میرا جال بچھانا تو دیکھو۔ جو دانہ جال کے نیچے ہما کے پھنسانے کیلئے ڈالا تھا وہ اُگا اور بڑھا، اور یہاں تک بڑھا کہ اسمیں گھونسلے بنگئے، مگر ہما ہی دام میں نہ آیا۔

اے ذوقِ نواسنجی بازم بخروش آور | غوغائے شبیخونے بر بُنگہِ ہوش آور

گر خود بجہد از سر - از دیدہ فرو بارم | دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور

ہاں ہمدمِ فرزانہ دانی رہِ ویرانہ | شمعے کہ نخواہد شد از بادِ خموش - آور۔

ویرانہ یعنی غریب خانہ - جو شمع کہ ہوا سے نہ بجھے گی یعنی شراب۔

شورابۂ ایں وادی تلخ ست اگر رادی | از شہر بسوئے من سرچشمۂ نوش آور

یعنی اگرچہ تیرے عشق میں دوسرے کی شرکت گوارا نہیں مگر چونکہ کئی آدمیوں کے ملکر نالہ و فریاد کرنے میں عجب لطف ہے اِس لئے میں رشک سے قطع نظر کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ در خارِ بیت بپاسے عزیزاں قلیدہ باد،،

در تیغ زدن منت بسیار نہادند ۔ بردند سر از دوش و سبکدوش نکردند

یعنی تلوار سے سر اتار کر بھی معشوق نے سبکدوش نہ کیا پہلے سر کا بوجھ تھا اب اِس احسان کا بوجھ ہے کہ اپنی تلوار سے یہ بے قدر سر اتارا ہے۔

روزیکہ بمے زور و بہ نے شور نہفتند ۔ اندیشہ بکارِ خرد و ہوش نکردند

یعنی شراب کا نشہ اور نے کی آواز کا درد - دونو عقل و ہوش کے دشمن ہیں۔ پس جب کارکنانِ قضا و قدر نے شراب میں زور اور نے میں شور ودیعت کیا تھا اُس وقت عقل و ہوش کے انجام کا کچھ خیال نہیں کیا۔

تاجرِ شوق بداں رہ بتجارت نرود ۔ کہ رہ انجامد و سرمایہ بغارت نرود

یعنی شوقِ الٰہی کا تاجر اُس رستے نہیں چلتا کہ جو رستہ چلتے چلتے ختم ہوجائے اور اُس رستے میں سرمایہ لوٹا نہ جائے۔

رمزشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد ۔ محرم آنست کہ رہ جز باشارت نرود

کہتا ہے کہ ہر نکتہ یعنی کائنات کی ادنےٰ سے ادنےٰ چیز میں ایک ادا - یعنی ایک معنی یا راز چھپا ہوا ہے۔ پس ہر چیز کی رمز کو سمجھنا چاہئے کیونکہ محرمِ راز وہی شخص ہے جو بغیر اُدھر کے اشارے کے ایک قدم نہیں اُٹھاتا - یعنی جو کچھ نیچر سکھاتی ہے اُسکے موافق عمل کرتا ہے۔ کھانے میں، پینے میں

معشوق کا آدھا لب شہد تھا کہ بین اسمیں پھنس کر رہ گیا، اور آدھا مصری تھا کہ زیب آنسیر آ لیا۔

عاشقانہ

دعوے اور ابود دلیل بدیہی ‏ ‏ ‏ ‏ خندۂ دنداں نما بحسن گہر زد

کتنے بڑے خیال کو کن مختصر لفظوں میں اور پھر کس صفائی اور خوبی سے ادا کیا ہے۔ کہتا ہے کہ معشوق موتی پر اس طرح ہنسا کہ اسکے دانت نظر آنے لگے پس اسکا خندہ گویا اس بات کا دعوے ہے کہ موتی کی کچھ حقیقت میرے دانتوں کے سامنے نہیں، اور اس دعوے کی دلیل اسکا خندۂ دنداں نما ہے، کیونکہ اسکے دانتوں کا سب پر ظاہر ہوجانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ موتی اسکے دانتوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے ہیں اسکے دعوے کی دلیل نہایت بدیہی اور ظاہر ہے۔

شکوہ

نہم جبیں بدرش آستاں بگرداند ‏ ‏ ‏ ‏ نشیمش بسرِ رہ عناں بگرداند

آستاں بگرداند یعنی چوکھٹ کے پتھر کو الٹ کر اوپر کا رخ نیچے اور نیچے کا رخ اوپر کر دیتا ہے۔

پیچ در پیچ

امتحانِ عشق

قطعہ

تو نالی از خلشِ خار و نشتری که سپہر ‏ ‏ ‏ ‏ سرِ حسینِ علیؑ بر سناں بگرداند

نوک

۱ برو بشادی و اندوه دل منہ۔ که قضا ‏ ‏ ‏ ‏ چو قرعہ بر نمطِ امتحاں بگرداند

۲ یزید را به بساطِ خلیفہ بنشاند ‏ ‏ ‏ ‏ کلیم را به لباسِ شباں بگرداند

تصوف

تیغت ز فرق تا بہ گلویم رسیدہ باد ‏ ‏ ‏ ‏ شوخی ز حد گذشت زبانم بریدہ باد

اوّل یہ آرزو کرتا ہے کہ تیری تلوار میرے سر پر پڑے اور حلق تک اتر جائے۔ پھر یہ سمجھکر کہ یہ مرتبہ ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ کہتا ہے کہ گستاخی حد سے گذر گئی میری زبان قلم ہوجیو۔

عاشقانہ

گر رفتہ ام ز کوے تو آساں نرفتہ ام ‏ ‏ ‏ ‏ ایں قصہ از زبانِ عزیزاں شنیدہ باد

تصوف

ذوقیست ہمدمی لفقاں۔ بگذرم ز تیغ ‏ ‏ ‏ ‏ خارِ رہت بپاے عزیزاں خلیدہ باد

بہرِ خواری بسکہ سرگرمِ تلاشم کردہ اند — پارۂ نزدیک در ہر دورباشم کردہ اند

دورباش۔ ہٹو بچو کی آواز کو کہتے ہیں۔ جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے نقیب پکارتے چلتے ہیں:
کہتا ہے کہ مجھکو جو قضا و قدر نے سرگرمِ تلاش کیا ہے اُس سے مقصود میرا خوار و ذلیل کرنا ہے۔ پس
راہِ تلاش میں جو دھتکار مجھپر پڑتی ہے اُس سے ظاہر ہے کہ میری ذلت و خواری زیادہ ہوتی ہے؛
اور اس طرح جو امر میرے سرگرمِ تلاش کرنے سے مقصود ہے وہ حاصل ہوتا ہے۔ پس گویا ہر دورباش پر
مَیں کسی قدر مقصود کے نزدیک ہوتا جاتا ہوں۔

پیچ ہر روزم غمِ فردا بجز خوردن میدہد — تا قیامت فارغ از فکرِ معاشم کردہ اند

از چہ غالب خواجگیہای جہان ننگِ منست — گر نہ با سلمان و بوذر خواجہ تاشم کردہ اند

بخشم ناسزا میگوید و از لطفِ گفتارش — گماں دارم کہ حرفِ دلنشینی بعد ازیں گوید

لطفِ گفتار کی تعریف اس سے بہتر کسی پیرائے میں نہیں ہوسکتی۔ کہتا ہے کہ معشوق غصّے میں برابر
مجھکو بُرا بھلا کہتا ہے؛ مگر اُسکے لطفِ کلام سے مَیں ہمیشہ اِسی امید میں رہتا ہوں کہ اب کوئی اچھی بات
کہتا ہے، اب کوئی مہربانی کا کلمہ اُسکی زبان سے نکلتا ہے۔

دل از پہلو بروں آرم جمش جامِ خود انگارد — وگر لختے برافشانم سلیماں نقشِ نگیں گوید

اپنے دل پر فخر کرتا ہے کہ اگر اُسکو پہلو سے نکالکر دکھاؤں تو جمشید اُسکو اپنا جامِ جہاں بیں سمجھے؛ اور اگر
اُسکا ایک لختہ نکالکر ڈالدوں تو سلیمان اُسکو خاتمِ سلیمانی کا نگیں بتائے۔

من بہ وفا مردم و رقیب بدر زد — نیمہ لبش انگبین و نیمہ تبرزد

بدر زد یعنی نکل بھاگا۔ تبرزد۔ مصری۔ کہتا ہے کہ مَیں تو نباہ کرتا کرتا مرگیا اور رقیب نکل بھاگا۔ گویا

مباداوہ اپنی دردانگیز داستان بیان کرے اور داستان کے ساتھ ہی اُسکی جان بھی نکل جائے۔

گویند صنعاں توبہ کرد از کفر۔ ناداں بندۂ
کز خود فروشیہای دیں بخشش زیزداں خوش نکرد

صنعاں کا قصہ مشہور ہے جو پہلے عابد تھا پھر فسق و فجور میں مبتلا ہوگیا یہاں تک کہ کفر تک نوبت پہنچ گئی پھر متنبہ ہوا اور کفر سے توبہ کی۔ کہتا ہے کہ صنعاں کا کفر سے توبہ کرنا مشہور ہے۔ وہ عجیب ناداں بندہ ہے جسنے دین کی خود فروشی کے سبب خدا کی بخشش کو پسند نہ کیا یعنی خدا کی خالص بخشش تو وہ تھی کہ وہ توبہ نکرتا، اور کفر ہی پر مرتا، اور پھر خدا اُسکو بخش دیتا، اور اب جو وہ بخشا جائیگا تو یہ بخشش دین کی قیمت ہوگی پس گویا اُسنے دین کی خود فروشی کے بھروسے پر خدا کی خالص بخشش کو پسند نہ کیا۔ خوش کردن کے معنی ہیں پسند کرنا۔

عاشقانہ شوخی

آں خود بہ بازی سے برد۔ دیں را زخود می شمرد
بنمودش دیں خندہ زد۔ آوردمش جاں خوش نکرد

با من میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

میاویز یعنی مجھسے جھگڑا مت کر۔ فرزند آزر ابراہیم علیہ السلام۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔ یہ نرا مضموں ہی نہیں ہے بلکہ مرزا کے حسب حال بھی ہے، کیونکہ جہاں تک ہمکو معلوم ہے۔ مرزا کے والد سُنّی المذہب اور خود مرزا اثنا عشری تھے۔

شوخی

در ستم حق ناشناسش گفتن از انصاف نیست
آں کہ چندیں تکیہ بر حلم خداوندش بود

کہتا ہے کہ اُس ظالم کو حق ناشناس کہنا انصاف نہیں ہے جسکو خدا کے حلم پر اسقدر بھروسا ہے کہ اُسکے بھروسے پر ظلم کئے چلا جاتا ہے، اور اُسکے مواخذے سے نہیں ڈرتا۔

اخلاق

با خرد گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گوے
گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

زمانے نے جب مجھکو دیکھا کہ خستگی اور تکلیف میں بھی خوش ہے تو مجھے ذلیل و خوار کردیا کہ اب تو خوش نہ رہیگا۔

در دل ہمی ز بینش من کینہ داشت چرخ　　چوں دیدکاں نماند نہاں۔ آشکار کرد

یعنی میری دانش و بینش کے سبب مجھسے آسمان پوشیدہ کینہ تو رکھتا ہی تھا، اب جو دیکھا کہ وہ کینہ لوگوں پر ظاہر ہوگیا ہے تو آسمان کھل کھیلا اور علانیہ دشمنی کرنے لگا۔

لنگر گسست سر سر و کشتی شکست موج　　دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد

یعنی جو کچھ ہوا وہ میری نادانی سے نہیں بلکہ قضا و قدر کے حکم سے ہوا۔

شوخی

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر　　نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

اصل شعر کا یہ ہے کہ در حقیقت میں ہوں تو نا امید مگر چونکہ تجھسے نا امید ہونا کفر ہے اور تو کفر سے راضی نہیں اس لئے مجبوراً اپنے تئیں امیدوار بنایا ہے۔

تصوف

بشرع آویز و حق میجو، ز مجنوں کم نۂ بارے　　دلش با محمل است۔ اما زباں با سارباں دارد

یعنی شرع سے بھی تعلق رکھ اور خدا کو بھی ڈھونڈھ، آخر تو مجنوں سے تو کم نہیں ہے کہ اسکا دل تو محمل میں اٹکا ہوا ہے، مگر زبان کو ساربان سے سروکار ہے۔ یعنی ساربان سے باتیں کر رہا ہے اور دل لیلی سے لگا ہوا ہے۔ شرع کو ساربان سے اور حق کو محمل سے تمثیل دی ہے اور یہ نہایت بلیغ تمثیل ہے اور شعر نوادر افکار سے ہے۔

تصوف

خدا را وقت پرسش نیست گفتم۔ بگذر از غالب　　کہ ہم جان بر لب و ہم داستاں بر زباں دارد

گفتم یعنی میں نے کہدیا ہے، یا میں کہے دیتا ہوں۔ کہ یہ پرسش کا وقت نہیں ہے، تو غالب کے حال سے درگذر اور پرسش کا خیال چھوڑ دے۔ کیونکہ اسکی جان لبوں پر ہے اور داستان زبان پر۔

حد سے زیادہ بلیغ شعر ہے۔ اگرچہ مضمون عام ہے مگر خود شاعر کے حال پر خوب چسپاں ہوتا ہے۔
اور اُسنے یقیناً اپنی ہی نسبت کہا ہے۔ جب کوئی غیر ملک کا مسافر شہر میں وارد ہوتا ہے اور اُسکی
زبان کوئی نہیں سمجھتا تو ترجماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر۔ کچھ تو اس لئے کہ کسی کو اپنا قدردان
اور پایہ شناس نہیں پاتا، اور کچھ اس لئے کہ اپنے نازک اور باریک خیالات کا سمجھنے والا کسی کو
نہیں دیکھتا۔ اپنے تئیں غریب شہر یعنی شہر میں بالکل اجنبی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی ترجمان کو
بلاؤ کہ اجنبی مسافر کچھ باتیں۔ جو کہنے ہی کے لائق ہیں۔ کہنی چاہتا ہے۔

عاشقانہ

پیشم ازاں بپرس کہ پرسی ز اہلِ کوے — گویند خستہ زحمتِ خود زیں دیار بُرد

نازم فریبِ صلح کہ غالب زکوے تو — ناکام رفت و خاطرِ امیدوار بُرد

رندانہ

ہر کرا رخت نمازے بنود ازنم مے — جاے در حلقۂ رندانِ قدح نوش مباد

جامہ یا رخت کا نمازی ہونا اُسکے آلودہ ہونے کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

رندانہ

مُفتیاں! بادہ عزیزیست۔ مریزید بخاک — جوشد از پردہ دگر خونِ سیاوُش مباد

دوسرے مصرع کی تقدیر عبارت یوں ہے "مباد اخونِ سیاوش۔ دیگر از پردہ بجوشد۔ سیاوُش کا قصہ
مشہور ہے کہ وہ بیگناہ اپنے سُسرے افراسیاب کے ہاتھ سے مارا گیا تھا؛ اور اُسکے خون کے وبال
میں تمام ملک کشت و خون میں مبتلا رہا۔ کہتا ہے کہ اے مفتیو! شراب بھی بڑی عزیز چیز ہے اسکو
زمین پر مت گراؤ؛ ایسا نہو کہ خونِ سیاوُش پھر جوش مارے۔

بیان واقعہ

انز رشک کرد آنچہ بمن روزگار کرد — درخستگی نشاطِ مرا دیدہ خوار کرد

یہ غزل غالباً اُس زمانے میں لکھی گئی ہے جب مرزا عدالت کے مواخذے میں پھنس گئے تھے۔ یعنی

بلبل بچمن بسنگر و پروانہ بہ محفل — شوق ہست کہ در وصل ہم آرام ندارد

یعنی شوق کو وصل میں بھی آرام نصیب نہیں۔ اسی لئے نہ بلبل کو چمن میں آرام ہے۔ اور نہ پروانے کو شمع کی موجودگی میں قرار ہے۔

چہ خیزد از سخنے کز درونِ جاں نبود — بریدہ باد زبانے کہ خونچکاں نبود

کہتا ہے کہ جو بات دل سے نہیں نکلتی وہ کچھ اثر نہیں کرتی۔ پس کٹیو وہ زبان جو خونچکاں یعنی دردِ دل سے بھری ہوئی نہو۔

حکیم ساقی و مے تند۔ و من زبدخوئی — ز رطلِ بادہ بخشم آیم ار گراں نبود

حکیم سے مراد خدا ہے کہتا ہے کہ ساقی تو اندازے سے زیادہ نہیں دیتا اور شراب یعنی دولتِ دنیا نہایت تند ہے مگر میں اپنی بدخوئی اور زیادہ طلبی سے اگر شراب کا پیالہ ہلکا پاتا ہوں تو غصے ہوتا ہوں۔

ز خویش رفتہ ام و فرصتے طمع دارم — کہ باز گردم و جز دوست ارمغاں نبود

قاعدہ ہے کہ جب آدمی کہیں سفر کو جاتا ہے تو وہاں سے کچھ سوغات و ہدیہ و ارمغاں لیکر وطن میں واپس آتا ہے کہتا ہے کہ میں اپنے آپے سے تو جا چکا ہوں اب یہ چاہتا ہوں کہ واپس پھر کر اپنے آپے میں آؤں تو دوست یعنی حق کے سوا کوئی سوغات لیکر نہ آؤں۔

زمامِ ناقہ بدستِ تصرفِ شوق است — بسوے قیس گرایش ز سارباں نبود

یعنی لیلی کا ناقہ جو قیس کی طرف چلا ہے یہ ساربان کی طرف سے نہیں ہے بلکہ اسوقت اسکی باگ تصرف شوق قیس کے ہاتھ میں ہے وہ جدھر چاہتا ہے لیجاتا ہے۔

بتانِ شہر ستم پیشہ شہر یار انند — کہ در ستم روشِ آموزِ روزگار انند

خواجہ فردوس بہ میراث تمنا دارد	وائے گر در روش نسل بہ آدم نرسد

خواجہ کا لفظ فارسی میں اکثر ایسے مقام پر بولتے ہیں جیسے طنز کے موقع پر اُردو میں تیسرے شخص کے لئے آپ یا حضرت بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ آپ آدم کی میراث میں فردوس کے طلبگار ہیں۔ بڑا مزا ہو اگر آپ کا سلسلہ نسب آدم تک نہ پہنچے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا کو یہ احتمال ڈارون کی تھیوری کے موافق سوجھا ہوگا، شاید انکا یہ مطلب ہے کہ آپکے اخلاق و عادات انسانیت سے اس قدر بعید ہیں کہ ممکن ہے آدم کی نسل سے نہوں۔

جاں در غمت فشاندن مرگ از عنا ندارد	تن در بلا فگندن بیم بلا ندارد
چوں لعل تست غنچہ اما سخن نداند	چوں چشم تست نرگس اما حیا ندارد
فارغ کسیکہ دل را با درد واگزارد	کشت جہاں سراسر دارو گیا ندارد
بادیدہ زمے ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند	آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند
کو فنا تا ہمہ آلایش پندار برد	از صور جلوہ دا از آئینہ زنگار برد
عشوۂ مرحمت چرخ مخر کایں عیار	یوسف از چاہ برآرد کہ ببازار برد

عشوہ خریدن دھوکا کھانا اور فریب میں آجانا یعنی آسمان کی مہربانی کے دھوکے میں نہ آنا کہ یہ عیار یوسف کو چاہ سے اس لئے نکالتا ہے کہ بازار میں لیجا کر بکوائے۔

ہر شمیمے را مشامے در خور است	بوے پیراہن بہ کنعاں می رود
جوہر طبعم درخشانست لیک	روزم اندر ابر پنہاں می رود
نومیدی ما گردش ایام ندارد	روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

کہ جب معشوق مہربان ہوکر عاشق کی پرسشِ حال کرتا ہے تو اُسوقت عاشق مہجور کا دل بھر آتا ہے، اور وہ شکایت کرنی شروع کرتا ہے. پس کہتا ہے کہ تو میری پرسشِ حال کے وقت شکایت سے مجھکو منع نہ کر، کیونکہ تو جو پرسش حال کرتا ہے تو گویا میرے زخم میں ٹانکے لگاتا ہے، اور ٹانکے لگاتے وقت کسی قدر خون کا ٹپکنا ضروری ہے. پس یہ شکایت وہ خون ہے جو زخم کے سیتے وقت ٹپکا کرتا ہے.

سفر

اگر بدل نہ خلد ہر چہ از نظر گذرد　　　زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد

یعنی عمر کا سفر میں گذرنا نہایت عمدہ ہے بشرطیکہ سفر میں جو کچھ نظر سے گذرے اُسپر انسان فریفتہ نہ ہوجایا کرے.

عاشقانہ

بوصل لطف باندازۂ تحمل کن　　　کہ مرگ تشنہ بود آب چوں ز سر گذرد

کہتا ہے کہ وصل کی حالت میں مہربانی اِس قدر زیادہ نہ کر کہ میں اُسکی خوشی کا تحمل نہ کرسکوں اور خوشی کے مارے مرجاؤں، کیونکہ پیاسے کے لئے وہ پانی موت ہے جو سر سے گذر جاے.

شوقیہ

ہر کجا دشنۂ شوقِ تو جراحت بارد　　　جز خراشے بہ جگر گوشۂ ادہم نرسد
طوبیِ فیضِ تو ہر جا گل و بار افشاند　　　جز نسیمے بہ پرستش گہِ مریم نرسد

جگر گوشۂ ادہم یعنی ابراہیم بن ادہم۔ کو اُن زخموں میں سے جو تیرے شوق کی چھری برساتی ہے ایک خراش سے زیادہ نہیں پہنچی. اور جو پھول اور پھل تیرے فیض کے طوبیٰ سے جھڑتے ہیں اُنمیں سے صرف ایک ہوا کا جھونکا محرابِ مریم تک پہنچتا ہے.

شوخی

مے بتہنا دمکن عرض کہ این جرعہ ہر آب　　　پیشِ این قوم بہ شورا بہ زمزم نرسد

بستند رہِ تر تہ آبے بسکندر   دریوزہ گرِ میکدہ صہبا بکدو برد

یعنی سکندر کو ایک بے حقیقت پانی کے گھونٹ سے محروم رکھا اور میکدے کا فقیر شراب جیسی نایاب چیز کا تونبا بھر کرلے گیا مطلب یہ کہ بادشاہوں کو وہ دولت نصیب نہیں جو میکدے یعنی خانقاہ کے ادنےٰ گداؤں کو نصیب ہے۔

یک گریہ پس از ضبطِ دو صد گریہ رضا دہ   تا تلخی آں زہر تو انم بہ گلو برد

یعنی جب دو سو دفعہ رونے کو ضبط کروں تو ایک دفعہ تو رونے کی اجازت دے تاکہ اُس ضبط کے زہر کی کڑواہٹ ایک دفعہ روکر حلق سے دور کروں۔

ز جوشِ شکوۂ بیداد دوست می ترسم   مباد مُہرِ سکوت از دہن فرو ریزد

ایک معقول بات کو محسوسات کے لباس میں ظاہر کرتا ہے مطلب تو یہ ہے کہ اُسکے شکوے سے اس قدر بھرا ہوا ہوں کہ شاید اُسکو ضبط نہ کرسکوں مگر اُسکو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اُسکی بیداد کا شکوہ دل سے اس جوش کے ساتھ اُبلا ہے کہ مُنہ پر جو مُہرِ سکوت لگی ہوئی ہے کہیں اُسکے ریلے میں بہہ نہ جائے۔

بُریدہ ام رہِ دورے کہ گر بیفشانم   بجائے گرد رواں از بدن فرو ریزد

یعنی میں نے ایسی راہ دراز طے کی ہے کہ اگر بدن کو جھاڑوں تو گرد کی جگہ جان بدن سے جھڑ جائے۔ یہ تمثیل ہے اُس محنت و مشقت کی جو فکرِ شعر اور تکمیلِ فنِ سخن میں قائل نے کی ہے۔

مکن بہ پیر شم از شکوہ منع کایں خونیست   کہ خود ز زخمِ دمِ دوختن فرو ریزد

عجیب غریب تشبیہ اور نہایت عمدہ خیال ہے اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے۔ قاعدہ ہے

تصوف

کفر و دین چیست جز آلایشِ پندار وجود ۔۔۔ پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

عاشقانہ

رفتہ بودی دگر از جا بہ سخن سازیِ غیر ۔۔۔ منت از بخت کہ خاموشیِ ما یاد آمد

یعنی تونے رقیب کی سخن سازی سے کچھ دھوکا کھایا تھا، مگر شکر ہے کہ اُسکی سخن سازی دیکھکر ہماری خاموشی تجھکو یاد آگئی۔ جس سے تجھکو یہ خیال ہوا ہوگا کہ سچے عاشق مُنہ سے کچھ نہیں کہا کرتے۔

عاشقانہ

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روی تو بود ۔۔۔ چشم سوی فلک و روی سخن سوی تو بود

یعنی نصیب کی گردش کا شکوہ کرتے وقت آنکھ آسمان کی طرف تھی اور باتیں تجھسے کر رہا تھا ایک خاص حالت کی تصویر بہت عمدہ لفظوں میں کھینچی ہے۔

عاشقانہ

دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند ۔۔۔ کاین ہمانست کہ پیوستہ در ابروی تو بود

تصوف

گر چنین ناز تو آمادۂ یغما ماند ۔۔۔ بہ سکندر نرسد ہر چہ ز دارا ماند

معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے۔ سکندر سے مراد بادشاہ فاتح، اور دارا سے بادشاہِ مفتوح۔

تصوف

ہم بسودای تو خورشید پرستم آری ۔۔۔ دل ز مجنوں بَرَد آہو کہ بہ لیلا ماند۔

یعنی اگر میں آفتاب کی پرستش کروں تو وہ بھی درحقیقت تیری ہی پرستش ہے، جیسے مجنوں ہرنوں پر اس لئے فریفتہ تھا کہ اُنکی آنکھیں لیلےٰ سے مشابہ تھیں۔

عاشقانہ

شکوۂ دوست ز دشمن نتوانم پوشید ۔۔۔ گر غمِ ہجر چنین حوصلہ فرسا ماند

یعنی اگر جدائی کا غم اسی طرح بے صبر کرنے والا رہا تو دوست کا شکوہ ضبط نہ کیا جا سکیگا یہانتک کہ اسکو دشمنوں سے بھی نہ چھپا سکونگا۔

تعبیر

در قتیل دشنہ نہان ساختہ غالب امروز ۔۔۔ مگذارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

ان کشتی بشکستہ ز موجم کہ تباہی	افگند در آتش گر از آبم بدر آورد

تب کشتی موج کے تھپیڑوں سے ٹوٹ جاتی ہے تو اسکے تختوں کو پانی سے نکال کر آگ میں ایندھن کی جگہ جلاتے ہیں۔ اپنے تئیں کہتا ہے کہ میری مثال بھی اُسی کشتی کی سی ہے کہ ڈوبنے سے بچا تو آگ میں جھونکا گیا۔

گر تلوّن زرخ تو بہ ساعت بندیدہ ایم	چندیں بذوق بادہ دل از جا چہ میتپد
ہفت آسیا بگردش و ما درمیان او	غالب دگر مپرس کہ برما چہ میرود
محو آسودگی مرد رہی کاندریں وادی	چو خار از پا برآمد۔ پا ز داماں برنمی آید

یعنی کسی حالت میں آدمی دنیا کے جھگڑوں سے نجات نہیں پاسکتا اگر کانٹا پاؤں سے نکل گیا تو پاؤں دامن میں اُلجھے گا۔

برآ از بزم بحث اے جذبۂ توفیق غالب را	کہ ترک سادۂ ما با فقیہاں برنمے آید

ترک سادۂ ما یعنی غالب جو کہ ایک بھولا بھالا تُرک ہے۔ یہ ایسی ترکیب ہے جیسے موسائے من اور فرہاد من یعنی خود میں۔ با فقیہاں برنمی آید یعنی مولویوں کی دلیلوں اور حجتوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ باکسے برنیامدن کے معنی ہیں اُس سے سربراہ رعہدہ برآ نہوتا۔

چشم و دل باختہ ام۔ داد ہنر خواہد داد	آنکہ چوں من ہمہ داں ہمہ بیں تو شود

یعنی چونکہ میرے دل نے تجھکو جانا ہے جیسا کہ تو ہے اور میری آنکھ نے تجھکو دیکھا ہے جیسا کہ تو ہے اِس لئے دل اور آنکھ دونوں کو کھو بیٹھا ہوں۔ پس میرے اِس کام کی داد وہی دیگا جو میری طرح تیرا ہمہ داں اور ہمہ بیں ہوگا۔

بہرے آدمی کے کان تک پہنچکر گم ہوجاتی ہے کس قدر بلیغ تشبیہ ہے۔

اعزازِ نفس

در دام بہرِ دانہ نیفتم مگر قفس — چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

اپنے اعزازِ نفس کا اظہار ہے۔ یعنی اگر عزت کے ساتھ قید کرو تو مجھے قید ہونے سے کچھ انکار نہیں ہے۔ پس یہ امید نہ رکھو کہیں دانے کے لالچ سے جال میں آپھنسونگا۔ نہیں۔ بلکہ قفس کو اتنا اونچا کرو کہ میرے گھونسلے تک پہونچ جائے۔ میں قفس میں فوراً چلا آؤنگا۔

عاشقانہ

تیرِ بخت را غلط انداز گفتہ ام — اے واے گر نہ تیرِ دگر بر نشاں رسد

غلط انداز اُس تیر کو کہتے ہیں جو خطا کرکے غیر مقصود جگہ جالگے چونکہ عشاق معشوق کے تیر کے مشتاق ہوتے ہیں اس لئے کہتا ہے کہ ایک تیر تو اُسکا آکر لگا ہے مگر میں اُسکو اپنی نحوستِ طالع کے خیال سے غلط انداز سمجھتا ہوں۔ اب اگر دوسرا تیر بھی اُسی جگہ آکر لگا تو میں سمجھونگا کہ پہلا بھی ارادے سے لگایا گیا تھا ورنہ تیرا خیال جو پہلے تیر کی نسبت تھا صحیح ہوجائیگا اور امید بالکل باقی نہ رہے گی۔

رندانہ

امیدِ غلبہ نیست بکیشِ مغاں درآے — مے گر بہ جزیہ دست ندا دار مغاں رسد

یعنی اگر پارسیوں پر غلبہ اور حکومت حاصل ہونے کی اُمید نہیں ہے تو انکا مذہب اختیار کرلے کیونکہ اس صورت میں اگر شراب جزیہ میں نہ آویگی تو ہدیہ اور سوغات میں ضرور آویگی۔ اس شعر میں گویا یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آتش پرستوں پر غلبہ و استیلا حاصل کرنے کی علت غائی یہی ہے کہ جزیے میں شراب آیا کرے۔ پس جب غلبہ کی اُمید نہو تو لاچار کیشِ مغاں اختیار کرنا چاہیئے تاکہ اگر جزیے میں نہیں تو ہدیہ وارمغاں ہی میں شراب وصول ہوا کرے۔

عاشقانہ

جاں بر سرِ مکتوب بتو از شوق فشاندن — از عہدۂ تحریر جوابم بدر آورد

پانے کا باعث ہے مجھے اسمیں مزا آنے لگا ہے اور اے درد تیری بن آئی ہے کیونکہ مجھے دوا سے ننگ آنے لگا ہے۔

ہمچو رازے کہ بہ مستی ز دل آید بیروں　　　در بہاراں ہمہ بوئیت ز صبا مے آید

اس شعر میں معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے اور اس حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ اِنَّ لِلّٰہِ فِیْ اَیَّامِ دَہْرِکُمْ نَفَحَاتٍ اَلَا فَتَعَرَّضُوْا لَہَا۔

خوش است آنکہ با خویش جز غم ندارد　　　ولے خوشتر ست آنکہ ایں ہم ندارد

سرابے کہ رخشد بویرانہ خوشتر　　　ز چشمیکہ پیرایۂ نم دارد

یعنی وہ سراب جو صحرا میں چمکے اُس آنکھ سے بہتر ہے جو تر نہیں ہے۔

سخن نیست در لطفِ ایں قطعہ غالب　　　بہشتے بود ہند کا دم ندارد

قطعہ سے مراد قطعۂ زمین ہے۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند　　　شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

رخ کشودند و لب ہرزہ سرائم بستند　　　دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

سوخت آتشکدہ ز آتش نفسم بخشیدند　　　ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند

گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند　　　بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بردند　　　بہ سخن ناصیۂ فرکیانم دادند

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند　　　ہر چہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

ہر چہ در جزیہ ز گبران مئ ناب آوردند　　　بشبِ جمعۂ ماہِ رمضانم دادند

تصوف

اس تمام غزل میں معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے۔

بجام و آئنہ حرفِ جم و سکندر چیست
کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانہ تست

تصوف

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جامِ جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں کیونکہ جو کچھ جس زمانے میں گذرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔

ہم از احاطہ تست اینکہ در جہاں مارا
قدم بہ بتکدہ و سر بہ آستانہ تست

تصوف

یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم ہیں تو بتکدہ میں۔ مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر ہے

سپہر را تو بتاراج ما گماشتہ
نہ ہر چہ دزد زما برد در خزانہ تست؟

تصوف

یعنی کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ تیرا ہم سے لوٹ کرلے گیا ہے وہ تیرے خزانے میں موجود ہے؟

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسماں پیماست
نہ تیزگامیِ توسن ز تازیانہ تست؟

تصوف

اس شعر میں ضمناً اپنے خیال کی بلند پروازی کا اظہار ہے اور اصل مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ تیری ہی طرف سے ہے۔ یعنی اگر میرا خیال اپنی حد سے تجاوز کرکے عالمِ بالا کے اسرار و غوامض میں دخل دیتا ہے تو میرا کیا قصور ہے؟ تیرے تازیانے نے گھوڑے کو تیز رفتار کردیا ہے

شباب تا بہ کہ! چہ ناقدر دانیِ ہستی ست
بلا بجانِ جوانانِ پارسا ریزد

تصوفی

آخرِ منزلِ نخست خوئی تو رہ میزند
اول منزل دگر بوی تو زاد میدہد

تصوف

یعنی سالک جب تیری راہ میں قدم رکھتا ہے اور پہلی منزل قریب ختم ہونے کے ہوتی ہے تو سخت سخت مشکلات اور امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے اور دوسری منزل شروع ہوتی ہے تو لذتِ قرب حاصل ہونے لگتی ہے جو مثل زادِ راہ کے آگے بڑھنے کی

یہ ایک شاعرانہ شوخی معلوم ہوتی ہے، مگر درحقیقت یہ ایک نکتہ ہے جو ہوا و ہوس کے کوچے میں ہمیشہ گذرتا رہتا ہے۔ ہوا و ہوس لوگ سب ذلتیں گوارا کرتے ہیں، جدائی کے صدمے، رشک کی جلن، ذلت و بے آبروئی، معاشیق کی بے التفاتی و بے اعتنائی وغیرہ سب کچھ سہتے ہیں مگر ہوا و ہوس سے باز نہیں آتے، اور پارسائی و عفت کا طریقہ جو باعث خوشنودی خدا ہے اسکو اختیار نہیں کر سکتے۔

رضوان چو شہد و شیر بغالب اگر دہ

سبے چارہ باز داد و مے مشکبو گرفت

رمز دین شناسم ورنہ معذورم

نہاد من عجمی و طریق من عربی ست

یعنی میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے پس اگر اصولِ مذہب سے واقف نہوں تو مجھکو معذور سمجھنا چاہئے۔

نشاطِ جم طلب از آسمان نہ شوکت جم

قدح مباش ز یاقوت بادہ گر عنبی ست

دوسرا مصرع مثال ہے پہلے مصرع کے مضمون کی۔ یعنی انگوری شراب چاہئے جس سے جمشید کا سا عیش حاصل ہو یاقوت کا پیالہ جس سے جمشید کی سی شاہانہ شوکت ظاہر ہو اگر نہ میسر ہو تو نہ سہی۔

ہر آنچہ در نگری جز بجنس مائل نیست

عیار بیکسی من شرافتِ نسبی ست

یعنی جسکو دیکھئے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافتِ نسب میں کوئی میری مثل نہیں ہے اسلئے میری طرف کوئی مائل نہیں ہے، اور یہی میری بیکسی کی وجہ ہے۔

نشاط معنویان از شرابخانۂ تست

فسونِ بابلیان فصلے از فسانۂ تست

جو مناسک حج کے ختم ہونے تک حاجی پہنے رہتے ہیں۔

عاشقانہ

نہ بر جستہ شرار و نہ بجا ماندہ رماد	سوختم۔ لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

رماد۔ راکھ۔ پہلا سوختم لازمی۔ دوسرا سوختم متعدی۔ کہتا ہے میں جل تو ضرور گیا مگر معلوم نہیں اسنے کس طرح مجھے جلادیا، نہ کوئی پتنگا اُڑا اور نہ راکھ باقی رہی۔

عاشقانہ

با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام	داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست

دوست کو حور سے۔ بادہ کو کوثر سے۔ اور خلوت کو دار السلام یعنی جنت سے تشبیہ دی ہے۔

الزام

دلخستہ غمیم و بود مے دوائے ما	با خستگاں حدیث حلال و حرام چیست
یعنی بیماراں و معذوراں

شوخی

از کاسۂ کرام نصیب است خاک را	تا از فلک نصیبۂ کاس کرام چیست

نیکی ز تست از تو نخواہیم مزد کار	ور خود بدیم کار تو ایم انتقام چیست

یعنی اگر ہمنے نیکی کی ہے تو وہ تیری ہی طرف سے ہے اُسکی اُجرت ہم نہیں چاہتے اور اگر ہم بد ہیں تو تیرا فعل یعنی تیرے بنائے ہوئے ہیں پھر سزا کس لئے ہے۔

شوخی

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت	پرسد چرا کہ نرخ مے لعل فام چیست

یعنی غالب کے گھر میں صرف ایک پرانا خرقہ اور ایک مصحف تھا اور کچھ نہ تھا پس اُسنے انکو اگر بیچ نہیں دیا تو شراب کا بھاؤ کیوں پوچھتا پھرتا ہے بہم فروخت کے لفظ میں یہ شوخی رکھی ہے کہ اگر دونو کو ایک ساتھ نہ فروخت کیا ہوگا تو شراب کی قیمت نہ ادا ہو سکیگی۔

عاشقانہ

لطف خدا ے۔ ذوق نشاطش نمیدہد	کافر دلے کہ با ستم دوست خو گرفت

یعنی وہ کافر دل جو معشوق کے ظلم سہنے کا عادی ہو اُسکو خدا کی مہربانی میں بھی مزا نہیں آتا۔ نیاز

انسان

اور جو موافق ہیں اُن کی جدائی تلخ ہے:

بُرد آدم از امانت ہر چہ گردوں بر نتافت
ریخت مے بر خاک چوں در جام گنجیدن نداشت

یعنی بارِ امانت میں سے جو کچھ آسمان سے نہ اُٹھ سکا وہ انسان نے اُٹھالیا گویا جب شراب جام میں نہ سما سکی تو خاک پر گر پڑی۔ خاک کا لفظ انسان کے لئے اور جام آسمان کے لئے کس قدر مناسب واقع ہوا ہے۔ اور بارِ امانت جو انسان پر ڈالا گیا اُسکی تشبیہ اُس شراب سے جو پیالہ چھلکنے سے زمین پر گر پڑے کیسی لطیف و پاکیزہ تشبیہ ہے!!

عاشقانہ مضمون

بریں نیاز کہ بالست۔ نازمی سدم
گدا بسایۂ دیوار پادشا خفت است

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

غمت بہ شہر شبیخوں زناں بہ بنگہ خلق
عسس بخانہ و شہ در حرم سرا خفت است

یعنی کوتوال اپنے گھر میں اور بادشاہ حرم سرا میں آرام کرتے ہیں۔ انھیں کیا خبر ہے کہ تیرا غم یعنی عشق شہر میں خلقت کے گھروں پر شبخوں مار رہا ہے۔

طریقت

دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد
کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفت است

کہتا ہے کہ پارسا یعنی زاہد تو اس گھمنڈ میں کہ میں عبادت میں مصروف ہوں غافل ہے اور دزد مرحلہ جو منزلگاہ میں لگا ہوا ہے یعنی نفسِ امّارہ جاگ رہا ہے، یعنی تاک میں بیٹھا ہے۔ پس مجھے سبحہ و سجادہ و ردائے زاہد کی خیر نہیں معلوم ہوتی، اسلئے میرا دل کانپ رہا ہے۔

تصوف

ببیں ز دُور و مجو قربِ شہ کہ منظر را
دریچہ باز و بدروازہ اژدہا خفت است

قربِ درگاہِ الٰہی میں جو مشکلات و خطرات ہیں اُنکو بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ دُور ہی سے دیکھ لے

اختری خوشتر ازیں بجہاں می بایست — خرد پیر مرا بخت جواں می بایست

تا تنک مایہ بدریوزہ خود آرا نشود — نرخ پیرایۂ گفتار گراں می بایست

گفتم بروزگار سخنور چو من بسی ست — گفتند اندریں کہ تو گفتی سخن بسی ست

مشکیں غزالہا کہ نہ بینی بہیچ دشت — در مرغزار ہاے ختا و ختن بسی ست

در صفحہ نمودم ہمہ آں چہ در دل ست — در بزم کمترست گل و در چمن بسی ست

در از دستی من چاکے ار فگند چہ عیب — زہیش دلق ورع با ہزار پیوند است

نگفتہ کہ بہ تلخی لب باز و پند پذیر — برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند است

یہ خطاب ناصح کی طرف ہے۔

اگر نہ بہر من - از بہر خود عزیزم دار — کہ بندہ - خوبی او خوبی خداوند است

درگرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم — با ما سخن از طوبی و کوثر نتواں گفت

یعنی ہمکو آگے جانے کی جلدی ہے ہم سایہ و سرچشمہ یعنی طوبی اور کوثر پر آرام نہیں لے سکتے

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است — بر دار تواں گفت بمنبر نتواں گفت

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا — مومن نہ بود غالب و کافر نتواں گفت

گفتم ز کہ پرسم اثر عمر گذشتہ — ساقی بقدح بادۂ دہ سالہ فرو ریخت

در قالب طلا اثرش پردہ کشا شد — خاکے کہ قضا در تن گوسالہ فرو ریخت

گر منافق - وصل ناخوش ور موافق - ہجر تلخ — دیدہ وا غم کرد روے دوستاں دیدن نداشت

یعنی دوستوں کا منہ دیکھنا اور انسے تعارف پیدا کرنا نہیں چاہیئے تھا، کیونکہ جو منافق ہیں انکا ملنا ناگوار ہے

شوق

بحث وجدان بجای ماں - میکدہ جوی کا نادر اں   کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

بجائے ماں بمعنی بجائے دار یعنی بحث وجدال کو یونہیں رہنے دے اور میخانے میں جاکر وہاں نہ جمل

کا جھگڑا ہے نہ فدک کا قصہ ہے جمل سے مراد جنگ جمل ہے جسمیں حضرت عائشہ جمل یعنی اونٹ پر

سوار ہوکر حضرت امیر سے لڑنے گئی تھیں۔ فدک ایک کھجوروں کا باغ تھا جسپر حضرت سیدۃ النسا

فاطمہ زہرا نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت میں وراثت کا دعوے کیا تھا یہ دونو جھگڑے منجملہ اُن

بیشمار نزاعوں کے ہیں جسپر سنی شیعوں میں ہمیشہ سر پھٹول رہتی ہے۔

فخریہ

دل جلوہ میدہد ہنر خود در انجمن   رحمے مگر بجان حسودش نماندہ است

یعنی جب تک میں اپنے تئیں چھپاتا تھا حاسدوں کو کچھ آزار نہیں پہنچتا تھا اب علی الاعلان اپنے

ہنر ظاہر کرنے لگا ہوں گویا اب حاسد کی جان پر رحم باقی نہیں رہا۔

بد دماغی عاشقانہ

غالب باں بریدہ و آگندہ گوش نیست   آما دماغ گفت و شنودش نماندہ است

بلبل بدولت بنالۂ خونیں بہ بند نیست   آسودہ زی کہ یار تو مشکل پسند نیست

یعنی اے بلبل تو اپنے نالۂ خونیں کے سبب ضیق میں نہیں ہے، جب چاہتی ہے نالہ کرتی ہے۔ بس تو

آرام سے زندگی بسر کر کہ تیرا یار یعنی گل مشکل پسند نہیں ہے۔ بخلاف ہمارے کہ ہمکو رونے اور فریاد کرنے

کی بندی ہے، حالانکہ نالۂ خونیں سے دل بھرا ہوا ہے۔

تصوف

بے خود بزیر سایۂ طوبے غنودہ اند   شبگیر رہروان تمنا بلند نیست

یعنی جو لوگ امانی و آمال کے پھندے میں گرفتار ہیں انکا سفر کچھ لمبا چوڑا نہیں ہے انکا منتہائے مقصود

طوبے کے سایہ میں آرام کرنا ہے۔

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست ۔ قعر دریا سلسبیل و روی دریا آتش ست

دوسرے مصرع میں عرفی کے مضمون کو اُلٹا ہے ۔ اسنے - اس لحاظ سے کہ دریا کے اوپر کی سطح سے راحت حاصل ہوتی ہے اور دریا کی تہ میں پہنچنے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے جو آگ میں جل جانے سے ہوتا ہے - یوں کہا تھا " روی دریا سلسبیل و قعر دریا آتش ست " مرزا کہتے ہیں کہ بلا کا خوف خود بلا سے زیادہ سخت ہوتا ہے ۔ چنانچہ دریا میں انسان جبھی تک بیچین رہتا ہے جب تک کہ ڈوب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے جب ڈوب گیا پھر کچھ بھی بے چینی باقی نہیں رہتی ۔ بس یوں کہنا چاہیے کہ " قعر دریا سلسبیل و روی دریا آتش ست "

پاک خور امروز و زنہار از پے فردا منہ ۔ در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش ست

جو لوگ شراب طہور کی امید پر دنیا میں شراب نہیں پیتے وہ گویا جو شراب آج نہیں پیتے اُسکو کل کیلیے رکھ چھوڑتے ہیں ۔ بس اُن سے کہتا ہے کہ " پاک خور امروز " یعنی سب آج ہی نبیڑ دے اور کل کیلیے مت رکھ ۔ کیونکہ شریعت میں شراب آج تو پانی ہے اور کل وہی آگ ہو جاویگی ۔

ز وہم نقش خیالی کشیدہ ورنہ ۔ وجود خلق چو عنقا بدہر نایاب ست

قوی فتادہ چو نسبت - ادب مجو غالب ۔ ندیدہ کہ سوی قبلہ پشت محراب ست

یعنی جب تعلق اور نسبت قوی ہو جائے تو پھر آداب ظاہری کی توقع نرکھنی چاہیئے ۔ دیکھو ! قبلہ کی طرف پشت کرنا ہر ایک کے لئے خلاف ادب ہے ، مگر محراب مسجد جسکو قبلہ سے نہایت مضبوط تعلق ہے - اُسکی پشت ہمیشہ قبلہ ہی کی طرف رہتی ہے ۔

ہر چہ فلک نخواستہ است ہیچکس از فلک نخواست ۔ ظرف فقیہ مے نجست بادہ ما گزک نخواست

بیخود بوقتِ ذبح تپیدن گناہِ من — دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

یا و از عدو نیارم فانیہم زدور بینی ست — کاندر دلم گذشتن با دوست ہمنشینی ست

کہتا ہے میں جو رقیب کا خیال دل میں نہیں لاتا یہ دُور بینی کی بات ہے کیونکہ میرے دل میں ہر وقت دوست رہتا ہے اگر رقیب کا خیال دل میں آئیگا تو گویا رقیب دوست کے ساتھ ہمنشیں ہو جائیگا۔

من سوی او بہ بینم داند ز بیحیائی ست — او سوی من نہ بیند دانم ز شرمگینی ست

چہ فتنہ ہا کہ در اندازۂ گمانِ تو نیست — قیامت است - دلِ دیر مہربانِ تو نیست

روان فدای تو ! نامِ کہ بُردۂ ناصح؟ — زہے لطافتِ ذوقیکہ در بیانِ تو نیست

چونکہ ناصح ترکِ عشق کی نصیحت کرتا ہے اس لئے معشوق کا نام عاشق کے سامنے اچھی طرح نہیں لیتا۔ شاعر ناصح کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے کہ میری جان تجھپر قربان ہو! تونے کسکا نام لیا؟ وہ کیسی لطافت اور لذت ہوگی جو کہ تیرے بیان میں نہیں ہے؟ یعنی جس طرح اُسکا نام لینا چاہئے تھا اگر اُس طرح تو بھی وہ نام لیتا تو کیسی لطافت اور لذت تیرے بیان میں ہوتی۔ مگر چونکہ ناصح نے بُری طرح سے اُسکا نام لیا تھا - اس لئے کہتا ہے کہ وہ کیسی لطافت ہوگی جو تیرے بیان میں نہیں ہے۔

دل از خموشیِ لعلت امیدوار چرا است — چہ گفتۂ بزبانے کہ در دہانِ تو نیست

معشوق نے مُنھ سے کچھ نہیں کہا مگر اُسکی نگاہ یا تبسم یا کسی اور ادا سے اُسکے التفات یا وصل کی امید بندھی ہے پس کہتا ہے کہ تیرے لعلِ لب کی خاموشی سے میرا دل اس قدر کیوں امیدوار ہے تو نے اُس زبان سے جو تیرے مُنھ میں نہیں ہے کیا کہدیا ہے جس سے اُسکو امید بندھی ہے۔

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی — بد است مرگ و لے بدتر از گمانِ تو نیست

سنجی اگر بمرتبۂ خاک وارسی — دانی اگر بمعنی لولاک وارسی

خود ہر چہ از حق است از آنِ محمد است

شاہد بقتلِ عاشق و عاشق بخالِ خود — مجنوں بپائے لیلی و لیلی بفرقِ خود

مؤمن بآلِ احمد و آتش بروحِ جد — ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد

سوگندِ کردگار بجانِ محمد است

اے خامہ وصفِ قامتِ شوقم کم نگار — اے دل سخن ز راست قدان در میاں میار

قمری! ز ذکرِ سرو نفس را نگاہ دار — واعظ! حدیثِ سایۂ طوبیٰ فرو گذار

کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمد است

حکمش بمہر و ماہ روانست چوں قضا — دیدی کہ باز گشتنِ خورشید تیرقضا

بودہ است بر اشارۂ ابروی مصطفےٰ — بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را

کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمد است

آنجا کہ از مناقبِ عترت سخن رود — ور آل و از صحابہ و امت سخن رود

واں کا نیمہ ز ختمِ رسالت سخن رود — در خود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود

آں نیز نامور ز نشانِ محمد است

ہمت بمدحِ شہ من و حالی گماشتیم — گفتیم و از نگاشتنی ہا نگاشتیم

چوں کام و لب فراخورِ وصفش ندا شتیم — غالب ثنائے خواجہ بیزداں گذاشتیم

کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

واعظ! حدیثِ سایۂ طوبیٰ فروگذار — کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمد است

بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را — کاں نیمہ جنبشی ز بنانِ محمد است

ور خود ز نقشِ مُہرِ نبوّت سخن رود — آں نیز نامور ز نشانِ محمد است

غالبؔ ثنای خواجہ بہ یزداں گذاشتیم — کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

یہ غزل مرزا نے اپنی عام طرز کے خلاف نہایت صاف اور بلیغ لکھی ہے۔ راقم نے مرزا کی زندگی ہی میں اس غزل کی تخمیس کی تھی اور مرزا صاحب کو بھی دکھائی تھی۔ چونکہ وہ تخمیس ابتک شائع نہیں ہوئی اسلئے مقتضائے مقام یہ ہے کہ اسکو بھی اس غزل کے ساتھ نقل کردیا جاے۔

اعجاز از خواصِ لسانِ محمد است — عین الحیوٰۃ گم بہ دہانِ محمد است

گر نور و گر ہدے کہ ازانِ محمد است — حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمد است

آرے کلامِ حق بزبانِ محمد است

وانی ز پیشِ چشمِ تو برخیزد ار حجاب — کز نورِ شمع پردۂ فانوس راست تاب

باشد ظہورِ روشنیِ عارض از نقاب — آئینہ دارِ پرتوِ مہر است ماہتاب

شانِ حق آشکار ز شانِ محمد است

لطفِ خداست گر بسرِ کس نہاد دست — قہرِ خداست چوں ز سرِ کس بحملہ جُست

وانکس کہ شد ز رمیِ ما رمیت مست — تیرِ قضا ہر آئنہ در ترکشِ حق است

آ تا کشادِ آں ز کمانِ محمد است

گوئی اگر بعالمِ ادراک وارسی — بینی اگر بہ دیدۂ دراک وارسی

عالم آئینۂ رازست چہ پیدا چہ نہاں | تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب

یعنی اگر تو سوچ نہیں سکتا تو نگاہ ہی سے عالم کو دیکھ کہ اُسکا ظاہر اور باطن سب مظہر اسرار الٰہی ہے۔

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار | نیست گر صبح بہاری شب ماہے دریاب

گریں از جور بہ انصاف گراید چہ عجب | از حیا روے بما گر ننماید چہ عجب

کہتا ہے کہ ظلم و ستم کے بعد اگر وہ انصاف کی طرف مائل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں یعنی اپنے پچھلے ظلم یاد کرکے حیا سے ہمکو منھ نہ دکھلائے تو کچھ تعجب نہیں مطلب یہ کہ انصاف بھی کریگا تو اس طرح کریگا کہ ہم اُسکے دیکھنے سے محروم رہیں۔

بود ش از شکوہ خطر ورنہ سری داشت بمن | بمزارم اگر از مہر بیاید چہ عجب

خیالی پلاؤ پکاتا ہے تاکہ اسی طرح اپنے دل کو تسکین دے۔

با چنیں شرم کہ از ہستی خویشش باشد | غالب از رخ بہ دوست نسایدچہ عجب

یعنی اس شرم سے کہ اپنے تیئں غلطی سے موجود سمجھ رہا ہے اگر غالب خدا کے آگے سجدہ نہ کرے تو کچھ تعجب نہیں۔

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمد است | آرے کلام حق بزبان محمد است

آئینہ دار پرتو مہر ست ماہتاب | شان حق آشکار ز شان محمد است

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق ست | اما کشاد آں ز کمان محمد است

دانی اگر بمعنی لولاک وا رسی | خود ہر چہ از حق ست از آن محمد است

ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد | سوگند کردگار بجان محمد است

ابہام

مے باندازہ حرام آمدہ - ساقی برخیز　　　شیشہ خود بشکن بر سر پیمانۂ ما

برخلاف عقل و شرع کے کہتا ہے کہ اے ساقی شراب اعتدال کے ساتھ پینی حرام ہے تو اٹھ اور اپنا شیشہ یعنی بوتل یا صراحی ہمارے گلاس پر دے مار اس شعر میں افراط شوق کی تصویر کھینچی ہے خواہ کسی چیز کا شوق ہو جب کسی چیز کی طلب اور خواہش حد سے گذر جاتی ہے تو اس بات کی حس نہیں رہتی کہ اپنے ظرف کے موافق اسکی خواہش کیجاے جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے تو پیاسا دریا کو دیکھکر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جاؤں بس گو کہ مضمون شعر شراب کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے لیکن اسکا مصداق ہر چیز کا مشتاق قرار پا سکتا ہے۔

نازک خیالی

مو برآید ز کف دست اگر دہقاں را　　　نیست ممکن کہ کشد ریشہ سر از دانۂ ما

ظاہر ہے کہ انسان کی ہتیلی میں بال پیدا ہونے کی قابلیت نہیں رکھی گئی - کہتا ہے کہ اگر کاشتکار کی ہتیلی میں بال بھی نکل آئیں تو بھی یہ ممکن نہیں کہ ہمارا دانہ پھوٹ کر اسمیں سے ریشہ نکل آئے یعنی ہماری کوششوں کا مشکور ہونا محال ہے۔

تصوف

خرابیم و رضایش در خرابیہای ما باشد　　　ز چشم بد نگہدارد خدا ما دوستکاماں را

خراب - مست، ویران، اور تباہ، تینوں معنوں میں آتا ہے۔ دوست کام وہ شخص جسکی حالت دوستوں کی خواہش کے موافق ہو، یعنی عمدہ حالت ہو۔ کہتا ہے کہ ہم خود بھی خراب ہیں اور دوست کی خوشی بھی یہی ہے کہ خراب حال رہیں پس ہم دوست کاموں کو جنکی حالت دوست کی مرضی کے موافق ہے خدا تعالے نظر بد سے محفوظ رکھے۔

مناجات

بسا افتادہ سرمست و بسا افتادہ در طاعت　　　تو دانی تا بہ لطف از خاک برداری کداماں را

(Emamzamin)

نہیں ہے، کہ جس طرح بیع و شرا اور لین دین کے وقت شرطیں کر لیتے ہیں اُسی طرح دل دیتے وقت بھی کوئی شرط کر لیجاتی۔

آوازۂ شرع از سرِ منصور بلند ست — از شب روی ماست شکوہ عسس ما

شب روی - چوری کے لئے راتوں کو پھرنا۔ کہتا ہے کہ اگر مجرموں کو تعزیر نہ دیجائے تو شریعت کی شان و شوکت اور حکومت کی شکوہ ظاہر نہیں ہوتی۔ پس ہم جو مرتکب جرائم ہوتے ہیں گویا شریعت اور حکومت کی شان بڑھاتے ہیں۔

وقتست کہ خونِ جگر از درد بجوشد — چندانکہ چکد از مژۂ دادرس ما

کہتا ہے کہ میری مظلومی اب اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ خونِ جگر درد سے اسقدر اُبلے کہ حاکم دادرس کی پلکوں سے جا ٹپکے۔

در دہر فرو رفتۂ لذت نتواں بود — بر قند - نہ بر شہد نشیند مگس ما

یعنی ہم دنیا کی لذتوں سے متمتع ہوتے ہیں مگر اُن میں پھنستے نہیں جیسے وہ مکھی جو قند پر بیٹھتی ہے کہ جب چاہا اُڑ گئی نہ وہ مکھی جو شہد پر بیٹھتی ہے کہ پھر اُبھر نہیں سکتی۔

بادۂ مشکوی ما - بید - و کنارِ کشت ما — کوثر و سلسبیل ما - طوبی ما بہشت ما

حسرتِ وصل از چہ رو - چون بخیال سرخوشیم — ابر اگر نابیستد - بر لبِ جو ست کشت ما

یعنی جبکہ ہم خیال دوست ہی میں مست و سرشار ہیں تو وصل کی حسرت کیوں کریں۔ اگر ابر نہیں برستا تو نہ برسے، ہماری کھیتی خود ندی کے کنارے پر ہے۔

بردہ صد ابعیں بسر بر سر صد ہزار خم — گر نہی ور آفتاب بادہ چکد ز خشت ما

یعنی میرا دن اس قدر تاریک تھا کہ شام کی تاریکی اور اسکی تاریکی دونوں مل گئیں، اور یہ معلوم ہوا کہ شام کب ہوئی اور دن کب چھپا۔

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود ۔۔۔ خوشش بود گردانہ نبود دام را

یہ وہی مضمون ہے جو مرزا نے اردو میں اس طرح باندھا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ ۔۔۔ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

داستاں در تخم و غالب بوسہ ۔۔۔ شوق نشناسد ہمے ہنگام را

در ہجر طرب بیش کند تاب و تپم را ۔۔۔ مہتاب کفِ مار سیاہ ہست شبم را

یعنی جدائی کے زمانے میں جو سامان عیش و طرب مہیا ہوتا ہے اس سے میری بیقراری اور تپش زیادہ بڑھتی ہے۔ پس چاندنی جو کہ عیش و طرب کی محرک ہے وہ میری رات کے حق میں مار سیاہ کے پھین کا حکم رکھتی ہے۔

تشنہ لب ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم ۔۔۔ گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

کہتا ہے کہ میں کیسا ہی پیاسا ہوں لیکن اگر دریا کی موج پر مجھکو یہ شبہ بھی گذرے کہ دریا نے مجھے دیکھکر پیشانی پر بل ڈالا ہے تو میں غیرت کے مارے ساحل دریا پر جان دیدونگا مگر حلق تر نکرونگا۔

بیا یانِ محبت یاد می آرم زمانے را ۔۔۔ کہ دل عہدِ وفا نابستہ دادم دلستانے را

اس شعر میں اپنی نادانی اور حماقت ظاہر کرتا ہے، کہ اب انتہائے محبت میں جبکہ معشوق کی طرف سے ظلم و ستم و بیوفائی کی کچھ حد نہیں رہی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ افسوس ہے جب میں نے دل اسکو دیا تھا اسوقت وفاداری کا عہد نہ لے لیا۔ حالانکہ دل کا دینا کوئی اختیاری بات

شرابخواروں کے مشرب میں خود نمائی منع ہے۔ دیکھو جمشید جو بادہ نوشی میں ضرب المثل ہے اُسکے ہاں
آئینہ خود نمائی یعنی آئینہ جیسا کہ سکندر کے ہاں تھا۔ نہ تھا۔

بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا
زما گسستی و با دیگراں گرو بستی

یعنی اگر تونے ہم سے توڑکر غیروں کے ساتھ پیمان باندھا ہے تو اِسکا خیال نکر اور بے تکلف ہمارے پاس
چلا آ، کیونکہ عہدِ وفا تو ٹوٹنے ہی کے لئے باندھا جاتا ہے، وہ کبھی استوار نہیں ہوتا، جیسا کہ ہمارے
ساتھ باندھکر ٹوٹ گیا۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

یعنی وداع میں اَور لطف ہے اور وصل میں اَور لذت ہے۔ بس ہزار بار جا اور لاکھ بار آ۔ صد ہزار کے
لفظ نے شعر کو زیادہ بلیغ کر دیا ہے، کیونکہ شاعر باوجودیکہ لذت میں وداع اور وصل دونو کو یکساں قرار دیتا ہے
مگر پھر بھی اپنے مطلب کی بات کو نہیں بھولا، اور جانے کے لئے ہزار بار اور آنے کے لئے صد ہزار بار
کا لفظ استعمال کیا ہے۔

رواجِ صومعہ ہستی ست زینہار مرو
متاعِ میکدہ مستی ست ہوشیار بیا

یعنی صومعہ میں ہستی و پندار و غرور کا رواج ہے وہاں ہرگز نہ جا، اور میکدے کی جو کچھ پونجی ہے
وہ مستی ہے، یہاں ذرا ہوشیار ہو کر یعنی ظرفِ عالی لیکر آنا چاہئے۔ مستی حاصل کرنے کے لئے
ہوشیار ہو کر آنا۔ اِسمیں جو لطف ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

چوں بقاصد بسپرم پیغام را
رشک نگذارد کہ گویم نام را
گشتہ در تاریکیِ رہ زم نہاں
کو چراغے تا بجویم شام را

بیخودی

عاشقانہ

معشوقانہ

رشک

زاریانی

جنت کی کیفیت سے اور جو اسمیں لذت و راحت ہے اُس سے حاسد لوگ بیخبر ہیں۔ اِسلئے رشک سے اُنکی یہ حالت ہے کہ گویا اُنپر دوزخ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

سوز ترا رواں ہمہ در خویشتن گرفت ۔۔۔ از داغ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما

یعنی تیرے سوز اور تیری آگ کو جان نے بالکل اپنے اندر لے لیا ہے، اور ذرہ برابر کسی کو لئے اُسمیں سے حصّہ نہیں چھوڑا۔ پس ہم جو اپنے جگر کو داغ دار قرار دیتے ہیں درحقیقت اُسپر تہمت رکھتے ہیں۔

باچو تو سوئے معاملہ بر خویش منت است ۔۔۔ از شکوہ تو شکر گزار خودیم ما

روئے سیاہ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم ۔۔۔ شمع خموش کلبۂ تار خودیم ما

کدوئے چوں زمے یابم خیال خویشتن بالم ۔۔۔ کہ پندارم سر آمد روزگار بے نوائیہا

یعنی ایک شراب کا بھرا ہوا تونبا مجھکو ملجاتا ہے تو میں پھولا نہیں سماتا اور یہ سمجھتا ہوں کہ بس اب بے سروسامانی کا زمانہ ختم ہوا۔

سخن کوتہ مرا ہم دل بتقوے مائل ست اما ۔۔۔ ز ننگ زاہد افتادم بکافر ماجرائیہا

یعنی زاہد کے ساتھ ہم پیشہ ہونے سے عار آتا ہے اِسلئے میری کفار کی سی حالت ہے ورنہ تقوی کی طرف مجھے بالطبع میلان تھا۔

در مشرب حریفاں صنعت خود نمائی ۔۔۔ بنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را

حریفاں کا لفظ فارسی میں ایسا ہے جیسا اُردو میں یار لوگوں کا لفظ: اور لفظی معنی اسکے ہم پیشہ ہیں۔ جب شرابخوار کسی کو حریف یا حریفاں کہتا ہے تو اُس سے مراد شرابخوار ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم

سایۂ و چشمہ بصحرا دم عیشے دارد　　اگر اندیشۂ منزل نبود رہزن ما

یہ دنیا کی مثال ہے، یعنی اگر آخرت کا کھٹکا نہ لگا ہوا ہو تو دنیا خاصی آرام کی جگہ ہے۔ مگر چونکہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہے اس لئے یہاں آرام کے ساتھ دم نہیں لیا جا سکتا۔

مے پرد مور مگر جاں بسلامت ببرد　　تا چہ برق ست کہ شد نامزد خرمن ما

یعنی معلوم نہیں کہ ہماری خرمن پر کون سی بجلی گرنیوالی ہے کہ چیونٹے جان بچانیکے لئے پہلے ہی سے اڑے جاتے ہیں، تمثیل کے پیرائے میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوست اور رفیق کوئی ہمارے رنج میں شریک نہیں ہوتا۔

سخن ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر　　نشود گرد نمایاں ز رم توسن ما

یعنی ہمارے خیالات اس قدر لطیف ہیں کہ تحریر میں نہیں آسکتے، گویا ہمارے گھوڑے کی دوڑ میں گرد و غبار بالکل نہیں اٹھتا۔

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما　　ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب

یہ ملکۂ فطری کی طرف اشارہ ہے یعنی ہمنے شاعری خود نہیں اختیار کی بلکہ ملکۂ شاعری نے خود ہمکو مجبور کیا کہ ہم اسکو اپنا فن قرار دیں۔

یا بندۂ خود ایں ہمہ سختی نمی کنند　　خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما

یہ خطاب خداوند حقیقی کی طرف ہے، یعنی کیا ہم زبردستی سے تیرے سر ہو گئے ہیں کہ ہم پر ایسی سختی کیجاتی ہے؟

بر روے حاسداں در دوزخ کشودہ ایم　　از بہر خویش جنت در بستہ ایم ما

یعنی ہم اپنا کمال دیکھکر آپ ہی خوش ہوتے ہیں گویا ہم اپنے لئے جنت دربستہ ہیں پس چونکہ ہماری

دنیا

زار نالی

تحریف

تحریر

شاعری

تعریف

حال ما از غیر می‌پرسی منت می‌بریم　　آگہی بارے کہ آگہ نیستی از حال ما

یعنی تو جو ہمارا حال غیر سے پوچھتا ہے ہم اسی بات کے شکرگذار ہیں، غنیمت ہے کہ تو اس بات سے تو آگاہ ہے کہ تجھکو ہمارے حال کی خبر نہیں۔

دل بافسون تسکین ہمدون میتوان دادن　　چہ امیدست آخر خضر را و عیسیٰ مسیحا را

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن　　ز خود رفتیم و ہم باخویشتن بردیم دنیا را

وحشت ما از غم تست چہ پیدا چہ نہاں　　ہمچو رنگ از رخ ما رفت دل از سینہ ما

جوئے از بادہ و جوئے ز عسل دارد خلد　　لب لعل تو ہم ایں است ہم آنست مرا

خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت　　منتے بر قدم راہروان ست مرا

یعنی راہ کے تمام خار و خس میری گرمی رفتار سے جل گئے ہیں، پس رہگیروں کے قدم پر میرا احسان ہے کہ انکے لئے میں نے رستہ بالکل صاف کر دیا ہے۔ یہ تمام مضمون استعارے میں بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نازک خیالی کے طریقے میں جو الجھاؤ تھے وہ سب میں نے اس طریقے پر چلکر دور کر دئیے ہیں اور آئندہ آنے والوں کے لئے راہ صاف کر دی ہے۔

رہرو تفتہ درون رفتہ بہ آبم غالب　　توشہ بر لب جو ماندہ نشانست مرا

یعنی میری مثال اُس مسافر کی سی ہے جو گرمی اور لو سے جلا بھنا، پانی کو دیکھکر بے اختیار اُسمیں کود پڑے اور ڈوب جائے، اور ندی کے کنارے پر اُسکا زادِ راہ پڑا رہ جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کوئی مسافر ڈوبا ہے۔ اس شعر میں مرزا نے اپنی خاص حالت کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں نے مجھکو محض اٹکل اور قرائن سے پہچانا ہے، ورنہ میں جیسا کہ میں ہوں سب کی نظروں سے مخفی رہا ہوں۔

سے کسی کو پانی نہیں دیتا، پس اگر سکندر آبِ حیواں کے نہ ملنے کے سبب ہلاک ہو جائے تو ہو۔
دوسرے مصرع میں خدا کی بے نیازی کا بیان ہے، یعنی خضر جان جیسی عزیز چیز مفت نذر کرتا ہے
مگر تو اُسکو قبول نہیں کرتا، اور اِس لئے اُسکو کسی طرح موت نہیں آتی۔

بزم ترا شمع و گل خستگیِ بوتراب　　　ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

یعنی تیرے ہاں وہی سب سے زیادہ مقرب اور برگزیدہ ہیں جو سب سے زیادہ مبتلائے حوادث و
مصائب و آلام ہیں۔

سادہ ز علم و عمل مہرِ تو ورزیدہ ام　　　مستیِ ما پایدار بادۂ ما ناشتا

ناشتا نہار منہ رہنا اور کچھ نہ کھانا نہ پینا۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ گو میں نے شراب کا ایک قطرہ
نہیں پیا مگر نشے میں ہر وقت چور رہتا ہوں، یعنی گو علم و عمل کچھ نہیں رکھتا مگر تیری محبت میں سرشار ہوں۔

قطعہ

۱　اے خاکِ درت قبلۂ جان و دلِ غالب　　　کز فیضِ تو پیرایۂ ہستی ست جہاں را
۲　تا نامِ تو شیرینیِ جاں دادہ بہ گفتن　　　در خویش فرو بردہ دل از مہر زباں را

یعنی آنحضرتؐ کا نام مبارک لینے سے زبان میں ایسی شیرینی اور حلاوت پیدا ہوئی کہ دل نے پیار سے
اُسکو اپنے اندر اُتار لیا۔

ما ہما سے گرمِ پروازیم فیض از ما مجوے　　　سایۂ ہمچوں دُود بالا سے رود از بالِ ما

یعنی ہماری پرواز میں اِس قدر گرمی ہے کہ جس طرح دھواں آگ کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے اِسی طرح ہمارے
پروں کا سایہ نیچے نہیں پڑتا بلکہ دھوئیں کی طرح پروں کے اوپر اوپر جاتا ہے۔

اسکے بعد جو کمی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی اُسکو مرزا نے یوں پورا کیا ہے

"ز جامی بہ عرفی و طالب رسید ز عرفی و طالب بہ غالب رسید"

اگرچہ مرزا نے بیدل اور اُنکے متبعین کی زبان اور اُنکے اندازِ بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا اور اس خصوص میں وہ اہلِ زبان کے طریقے سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے تھے۔ مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رہی۔ لیکن آخر کار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی۔ ہم اس مقام پر اُنکی غزلیات میں سے زیادہ تر صاف صاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کرینگے جنکے بغیر مرزا کی طرزِ تخیل اور اُنکے شعر کی خصوصیت ظاہر نہیں ہو سکتی۔

انتخابِ غزلیاتِ فارسی

شاہدِ حسن ترا در روشِ دلبری طرۂ پُر خم صفات موی میان ماسوا

یعنی اگر تیرے حسن کو مثل شاہدانِ مجازی کے ایک شاہد قرار دیا جائے تو اُسکا طرۂ پُر خم کیا ہوگا؟ صفاتِ الٰہی۔ اور اُسکا موی میاں کیا قرار پائیگا؟ ماسوی اللہ۔ شعرائے متصوفین صفاتِ الٰہی کو اکثر زلف و گیسو اور طرہ و کاکل کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ اور چونکہ ماسوے اللہ کو صوفیہ معدوم محض جانتے ہیں اور معشوق کی کمر کو عشاق معدوم قرار دیتے ہیں۔ اس لئے شاہدِ حسنِ حقیقی کی کمر ماسوے کو قرار دیا ہے۔

آب نہ بخشی بزور خونِ سکندر ہدر جاں نہ پذیری بہیچ نقدِ خضر نارواء

ہدر یعنی حلال۔ مشہور ہے کہ سکندر آبِ حیواں کی تلاش میں گیا تھا مگر ناکام رہا۔ کہتا ہے کہ تو زور حکومت

جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا"

مرزا کے اس بیان سے پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے، مگر انکی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکی غزل میں نہ صرف نظیری۔ بلکہ عرفی، ظہوری، طالب آملی جلال اسیر اور انکے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے۔ کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے۔ انکی غزل بلاشبہہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے لیکن طرز بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی۔

ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں۔ جن میں عنصری سے لیکر جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سر آمدہ ہوا ہے اسکا نام لیا ہے۔ انکے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے۔ چونکہ اصل مثنوی اور اسپر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اس لئے ہم اسکو یہاں نقل کرتے ہیں ناظم کہتا ہے۔

"شنیدم کہ در دور گاہِ کہن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن

چو اورنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہِ مہی

چو فردوسی آورد سر در کفن — بہ خاقانی آمد بساطِ سخن

چو خاقانی از دار فانی گذشت — نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت

نظامی چو جام اجل در کشید — سر چترِ دانش بہ سعدی رسید

چو اورنگِ سعدی فرو شد ز کار — سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار

ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید"

اُسوقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرما کر خاموش ہو رہے۔

صہبائی، علوی بھی چونکہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا غالب نے اُس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا تھا اِس لیئے وہ مرزا کو اور مرزا اُنکو کم مانتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا اور مشاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مٹ بھیڑ ہوتی رہتی تھی۔ مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب و تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور یہی اُن کی اصلی ترقی کی بنیاد تھی۔

غزل معلوم ہوتا ہی کہ مرزا نے فارسی غزل بھی اول مرزا بیدل وغیرہ کی طرز میں کہنی شروع کی تھی چنانچہ اُس قسم کی بہت سی غزلیں اُنکے دیوان میں ابتک موجود ہیں مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخرکار عرفی، ظہوری، نظیری، اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں لکھتے ہیں جسکا ترجمہ یہ ہے "اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر اُن لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب اُن لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے۔ دیکھا کہ میں باوجودیکہ اُنکے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں، اُنکو میرے حال پر رحم آیا اور اُنھوں نے مجھپر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھکو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اُسکو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زاد راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھکو سکھایا۔ اب اِس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار۔

دل بدیں وصفم بیا سایہ سخن کوتہ کنید   آنکہ ننگ اوست بودن ہمسخن ہمتاے من

یعنی بوعلی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاق راے کرنا اور عقل فعال کا اسکو ودکر ہمتاے من، لکھنا یہ سب باتیں اُسکی مدح کے لئے کافی نہیں ہیں؛ مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعر میں مجھ جیسے شخص کا ہمسر و ہمتا ہونا بھی اُسکے واسطے موجب ننگ و عار ہے۔ اِسمیں قطع نظر اسکے کہ ممدوح کی اور اُس سے بھی زیادہ اپنی تعریف ایک نہایت لطیف پیرائے میں بیان کی ہے اِس بات کا بھی اشارہ ہے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

مرزا کی وفات سے چھہ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسن علی کے مکان پر جبکہ راقم بھی وہاں موجود تھا۔ آزردہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے؛ کھانے میں دیر تھی؛ فارسی دیوان غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ اُن میں ایک غزل تھی جس کے مقطع میں اپنے مُنکروں کی طرف خطاب کیا تھا۔ اور جسکا مطلع یہ ہے۔

نشاط معنویاں از شراب خانۂ تست   فسون بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

مرزا نے وہ اوراق اُٹھا لئے اور مولانا آزردہ سے مزاح کے طور پر کہا، "دیکھئے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے،" یہ کہکر غزل پڑھنی شروع کی۔ اول کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی؛ مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر جیسی کہ اُنکی عادت تھی کہنے لگے "دکلام مربوط ہے مگر نو آموز کا کلام معلوم ہوتا ہے،" سب حاضرین ہنس پڑے۔ جب مقطع کی نوبت آئی۔ مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کرکے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا۔

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی   مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

واسطے کہا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے برتر و بلند تر سمجھتے تھے ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے اُن کو مراتب برتر اور بالاتر سمجھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خاں کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین (یعنی امیر خسرو) سے ہوئی اور ایک ترک ایبک یعنی مرزا غالب پر اُسکا خاتمہ ہو لیا۔ سید غلام علی خاں وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربیت کی طرف متوجہ ہو جاتا تو عرب شعرا میں دوسرا متنبی یا ابو تمام ہوتا؛ اور اگر انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

مولانا آزردہ بیشک مرزا کی طرز خاص کو جو انہوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی ناپسند کرتے تھے؛ اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے خاطر نشین ہو گیا تھا وہ اخیر تک اُنکے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا۔ چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے اُسمیں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے کہ مولانا اُنکی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائب آلام و شکایت روزگار وغیرہ کا بیان ہے؛ اُسکے بعد مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں۔

با چنیں اندوہ کز بگفتیم و دل خالی نشد — خواجہ گر آندہ گسار من نبودے وای من
آنکه در یکتائیِ وے در فنِ فرزانگی — متفق گردیدہ رای بوعلی با رای من
آنکه چون خواہد بنامش نامہ نامی ساختن — بر نگارد عقلِ فعالش دو کرم فرمای من

لیکن چونکہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے اس لئے جس طرح قدردانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا اسی طرح نکتہ چینیوں کے خیال سے انکو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا؛ اور اُنکے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لئے اظہار کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی؛ اور اسطرح قدردان اور نکتہ چیں دونو انکی ترقی کے باعث تھے۔

لطیفہ

مولانا فضل حق باایںہمہ علم و فضل مرزا کو جس رتبے کا شاعر جانتے تھے اُسکا اندازہ حکایت ذیل سے ہوسکتا ہے۔ مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جاکر پوچھے۔ آنھوں نے کچھ معنی بیان کئے۔ اُسنے وہاں سے آکر مولانا سے کہا "آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں، آج اُنھوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کئے"؛ اور پھر وہ شعر پڑھا؛ اور جو کچھ مرزا نے اُسکے معنی کہے تھے بیان کئے۔ مولانا نے فرمایا پھر ان معنوں میں کیا بُرائی ہے؟ اُسنے کہا بُرائی تو کچھ ہو یا نہو مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے۔ مولانا نے کہا اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لئے جو مرزا نے سمجھے ہیں تو اُسنے سخت غلطی کی۔

مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے اور وہ مقطع یہ ہے۔

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب   گر ترقی نکنم شیخ علی را مانی

مومن خاں مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سنا اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اسمیں بالکل مبالغہ نہیں ہے۔ مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔

لطیفہ

ایک صاحب نے جو مومن خاں مرحوم کی تعلیوں سے خوب واقف تھے یہ حکایت سُنکر کہا کہ مومن خاں نے

مجبور کرتی ہیں۔ اوّلاً سابق استعداد اور فطری قابلیت جس کا اقتضا یہ ہے کہ اگر تمام عالم میں ایک قدردان یا مخاطب تک نہ ہو تو بھی وہ اپنے جوہر ظاہر کئے بغیر نہیں رہتی۔ جس طرح مورِ شیدا ویرانے میں بھی اور معمورۂ آبادی میں اُسی مستی اور نشاط کے عالم میں ناچنے سے گریز نہیں۔ اسی طرح وہ شاعر جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے بغیر اس کے کہ ملک میں کوئی اُس کی قدر کرے یا اُس کے کمال کی داد دے اپنے ہنر کی تکمیل میں ہاتھ پاؤں مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دوسرے اُس فطری ملکہ کا تحریک دینے والا اور اس آگ کا پتھر سے نکالنے والا اس بات کا یقین ہے کہ سوسائٹی میں کچھ لوگ ایسے سخن فہم و سخن سنج موجود ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمرِ طبیعی اختتام کے قریب پہنچ چکی تھی، مگر حسنِ اتفاق سے اس اخیر دور میں چند صاحبانِ فضل و کمال خاص دار الخلافہ دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضل حق خیرآبادی ثم الدہلوی، مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں متخلص بہ آزردہ، مولوی عبد اللہ خاں علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، نواب مصطفیٰ خاں حسرتی، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر، سید غلام علی خاں وحشت وغیرہم ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ہونا اُن کی شاعری کے حق میں بعینہ ایسا تھا جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خانخاناں، ابوالفتح، فیضی، اور ابوالفضل کا اُن کے زمانے میں ہونا۔

اگرچہ ان بزرگواروں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو ظاہرا مرزا کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے،

مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشاپردازی کے متعلق یہ بات قابل غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے پچاس برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی تکمیل اور اُسمیں ترقی کرنے پر مستعد و سرگرم رکھا جسکا زمانے میں کوئی قدرداں نہ تھا۔ اُنکے ممدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان واعیان تھے۔ جو فارسی زبان اور خاصکر فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے، یا بادشاہ اور سلاطین وامرا ورؤسا تھے۔ جنکو مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت۔ وہ شخص۔ جسکا قصیدہ انوری وخاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے، جسکی غزل عرفی وطالب کی غزل سے سبقت لیجائے، جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابو الفضل اور ظہوری کی نثریں پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں۔ اُسکو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپیہ ماہوار ملتا تھا، اور وہ بھی چھہ سات برس سے زیادہ نہیں ملا۔ گورنمنٹ کے ارکان واعیان کی مدح کے جلدو میں مرزا کو اُس خلعت کے سوا کبھی کچھ نہیں مرحمت ہوا جو فوراً فروخت ہو کر سرکاری چپراسیوں کے انعام میں صرف ہو جاتا تھا۔

مرزا کے ماننے والے اور اُنکے فارسی کلام پر ایمان بالغیب کہنے والے بلاشبہہ ملک میں بیشمار تھے، مگر ایسے خوش اعتقادوں کی کثرت اور اُنکی تحسین وآفرین سے شاعر کا دل ہرگز نہیں بڑھ سکتا۔ پس جبکہ ممدوحوں کی قدردانی کا وہ حال ہو، اور مادحین کی مدح سرائی کا یہ رنگ، تو پھر وہ کیا چیز تھی جسکو مرزا کی اصلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کے دل میں اصلی ترقی کا ولولہ نہ سلاطین وامرا کی داد و دہش سے پیدا ہو سکتا ہے اور نہ خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے، بلکہ اُس کا دل بڑھانے والی صرف دو چیزیں ہیں۔ جو خواہی نخواہی اُسکو ترقی کرنے پر

لیکن جس طرح تمام ممتاز اور نامور شعرا میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت
دیکھی گئی ہے۔ اسی طرح مرزا بھی اس کلیہ سے مستثنے نہ تھے۔ تصوف، حب اہل بیت، فخر، شوخی و
ظرافت، رندی و بیباکی، بیان رنج و مصیبت، شکایت و زار نالی، اظہار محبت و ہمدردی،
حسن طلب؛ یہ چند شعبے ان ایسے تھے جنکا بیان مرزا کے تمام اصناف سخن میں اکثر نہایت
لطیف و بدیع و موثر واقع ہوا ہے۔ بیشک یہ بات انکے عشقیہ مضامین اور اخلاق و موعظت کے
بیان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی؛ کیونکہ عشق و محبت اور تمام تعلقات و معاملات عاشق و معشوق
کا بیان، جیسا کہ ظاہر ہے، محض نیچرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے، اور شاعرانہ صنعت سے
جسکو مرزا نے جابجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ابا کرتا ہے۔ برخلاف اسکے مرزا اصناف
کلام میں اپنی اصطلاحی شاعری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے (الا ماشاء اللہ) اسی لیے
انکے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال جزالت اور متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان
اور غزل کا ایمان ہے عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ اخلاق و موعظت کا بیان بھی اسی لیے
موثر اور دلاویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور صاف اور شاعرانہ تکلفات سے پاک نہو دلوں
میں گھر نہیں کر سکتا۔ مگر اس سے مرزا کی استادی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ جب سعدی کی رزم کی نسبت
کہا جاتا تھا، کہ "این شیوہ ختم ست بر دیگراں" اور اسکا قصیدہ بھی بہت پست سمجھا جاتا تھا۔ اور
باینہمہ سعدی کی استادی کو سب نے تسلیم کیا۔ تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت ایسا کہنے
سے مرزا کی استادی میں کیونکر فرق آسکتا ہے۔ یہ میزان جو ہمنے مرزا کے کلام کی نسبت بتائی ہے
اسکو انکے کلیات نظم و نثر میں جانچنا چاہیے؛ نہ انتخابی اشعار میں جو اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں۔

نظم و نثر فارسی

فارسی لٹریچر میں ایشیائی مذاق کے موافق جو دستگاہ مرزا نے بہم پہنچائی تھی اور فارسی نظم اور فارسی نثر دونوں میں جو بلند پایہ اُنھوں نے حاصل کیا تھا۔ اُسکو اس زمانے میں کما حقہ لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔ جبکہ اُس زمانے میں جب بہت سے سخن سنج اور نکتہ پرور موجود تھے۔ مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدروانی کی شکایت کرتے تھے؛ تو اب کیا امید ہوسکتی ہے کہ لوگوں کو اُنکی قدر جتائی جاسکے۔ ہمسے اگر کچھ ہوسکتا ہے تو صرف اس قدر ہوسکتا ہے کہ اُنکے ہر قسم کے کلام میں سے کچھ کچھ بطور نمونے کے پبلک کے سامنے پیش کردیں؛ اور چونکہ فارسی زبان سے ملک میں عموماً اجنبیت ہوگئی ہے اسلئے جہاں جہاں ضرورت دیکھیں مرزا کے کلام کی شرح بھی کرتے جائیں۔ اس سے شاید یہ فائدہ ہو کہ مرزا کی قوتِ متخیلہ میں جو غیر معمولی اُپج اور پرواز قدرت نے ودیعت کی تھی۔ سمجھدار آدمی اُسکا کسی قدر اندازہ کرسکیں؛ لیکن زبان اور بیان کی خوبی جو ایک وجدانی چیز ہے اور جسکے نقاد اور جوہری ملک میں کم یاب بلکہ نایاب ہیں۔ اُسکی نسبت صرف مرزا کا یہ فصیح و بلیغ شعر لکھدینا کافی معلوم ہوتا ہے۔

بیا و رید گر ایں جا بود زبان دانے — غریب شہر سخن ہاے گفتنی دارد

البتہ ایک مختصر گر مرزا کے متعلق یہاں بتا دینا ضرور ہے جو اُنکا کلام دیکھتے وقت یاد رکھنا چاہیے۔

اگرچہ مرزا کو فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو خواہ نثر) ہر قسم کے مضامین بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشاق و ماہر و مسلّم الثبوت اُستاد کو ہونی چاہیے؛

استیلاء وہم کے مشاہدہ وحدت ذات سے محروم رہے جاتے ہیں، ہرچند انکو سمجھا ئیں گے، راہ پر نہ آئینگے۔ ناچار اشغال واذکار وضع کئے تاقوت متخیلہ اسمیں الجھی رہے اور رفتہ رفتہ بیخودی طاری ہوجاوے۔ وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہو اور ہم اسکو بہر پایہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں۔ ذاتی ہمہ اوست ورنہ ذاتی ہمہ اوست ہ

وہم صورتگری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے پس جب وہ وہم شغل وذکر کی طرف مشغول ہوگیا بے شبہہ اپنے کام سے یعنی صورتگری اور پیکر تراشی سے معزول ہوگیا۔ بیخبری اور بیخودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بمجرد فہم حاصل ہوتی ہے اس تشاغل کے نفس کو بیخودی میں آگئی۔ ایک دریا میں جان کر کودا، ایک کو کسی نے غافل کر کے ڈھکیل دیا۔ انجام دونو کا ایک ہے وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں، مگر ہاں کم ہیں، اور مخفی ہیں، اور کہیں کہیں ہیں۔ اور ایسے نفوس کہ جو کسب حالت بیخودی کے واسطے محتاج اشغال واذکار ہیں، بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں،،

کہ ولایت نبی کی وہ وجہ الی الحق ہے افضل ہے نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے ۔ نہ یہ کہ ولایت عام
افضل ہے نبوت خاص سے ۔ جس طرح نبی مستفیض ہے حضرت الوہیت سے اسی طرح ولی
مستنیر ہے انوار نبوت سے ۔ مستنیر کی تفضیل منیر پر اور مستفیض کو ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور
عقلا کے نزدیک مقبول نہیں ۔ اب وہ ولایت کہ خاصۂ نبی تھا نبوت کے ساتھ منقطع ہوگئی مگر وہ
فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے نقل وتحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے
چراغ جلتا چلا جاتا ہے ۔ اور یہ سراج ایزدی تا صبح ظہور قیامت روشن رہیگا ۔ اور اب اسی کا نام
ولایت اور یہی مشعل طریق ہدایت ہے ۔ ولایت وہدایت وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جو از روئے
کلمۂ لا الہ الا اللہ مشہود عیون اعیان امت اور منظور نظر اکابر ملت ہوئی ہے ۔ مگر وہ بات اب
کہاں کہ ایک بار لا الہ الا اللہ کہے اور دل نور معرفت سے منور ہو جاوے ۔ اور وہ ضامن نسبت برد
کہاں کہ قائل لا الہ الا اللہ کو اگرچہ اسکے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو قدمگاہ توحید پر قائم کردے ۔ یعنی
رسول مقبول واجب التعظیم قائل انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ والتسلیم ۔ اب سعادت بقدر ارادت ہے
اور راحت بعد جراحت سچ بھی تو ہے ! آدمی کیونکر سمجھ سکے اور بطلان بدیہیات کے جواز پر
اسکو کیونکر تسلی ہو ! یعنی اس مجموع موجودات کو کہ افلاک و انجم و بحار و جبال اسی میں ہیں نیست فنا بود
محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے ۔

اے کردہ بہ آرائش گفتار بسیچ　　در زلف سخن کشودہ راہ خم وپیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش میدانی　　ذاتیست بسیط منبسط دیگر ہیچ

جب اولیاء اللہ نے ۔ کہ وہ اطبائے روحانی ہیں ۔ دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے اور بسبب

عنوان پر لکھا ہے "لاموثر فی الوجود الا اللہ" اور خطے میں مندرج ہے "لاموجود الا اللہ" اور اس
خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور نامہ آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی
حقیقت اور اس معنی خاص کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں: آثاری، افعالی، صفاتی،
ذاتی۔ انبیاء سابقین صلوات اللہ علیٰ نبینا وعلیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم
ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری اٹھا دیں اور حقیقت نیرنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھا دیں۔
اب گنجینہ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ ہے اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے۔ رہے
عامۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود جو اصل
مقصود ہے انکی نظر میں نہیں۔ مگر جب لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہیں گے اسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی
قدر مکانہ پر آ رہیں گے یعنی ہماری اس کلمے سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے
شفاعت محمدی کی۔ اور یہی معنی ہیں رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے ندائے
روح افزائے "من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ"

قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے لیکن وحدت حقیقی کا رازداں ہے۔ گفتگوی توحید میں وہ لذت ہے
کہ جی چاہتا ہے کوئی سو بار کہے اور سو بار سنے۔ نبی کی حقیقت ذو جہتین ہے، ایک جہت خالق کہ جس سے
اخذ فیض کرتا ہے اور ایک جہت خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے۔

نبی را دو وجہ است دلجوے خلق | یکے سوی خالق یکے سوی خلق
بدان وجہ از حق بود مستفیض | بدیں وجہ بر خلق باشد مفیض

یہ جو صوفیہ کا قول ہے کہ "الولایۃ افضل من النبوۃ"، معنی اسکے صاف اور از روے انصاف یہ ہیں

مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اُردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع و مقفیٰ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اُردو خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے؛ خصوصاً سجع کی رعایت نے اُن میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن مرزا کو اُسمیں معذور سمجھنا چاہیئے؛ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفات بارِدہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اُسکو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اسکا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

باایں ہمہ انہیں سے بعض نثریں مرزا کی روشِ خاص میں نہایت ممتاز ہیں خصوصاً وہ دیباچہ جو اُنھوں نے مفتی میرلال صاحب کی کتاب سراج المعرفۃ پر لکھا ہے اُس میں جس خوبی اور متانت سے تصوّف کے اعلےٰ خیالات ظاہر کئے ہیں اُسکے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان میں تصوّف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اُسکے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے نہیں لکھے۔

کتاب سراج المعرفۃ جسپر مرزا نے یہ دیباچہ لکھا ہے۔ اُسمیں مفتی میرلال نے مرحوم بہادر شاہ کے ایماسے تمام اشغال و اذکار جو آنحضرت کے زمانے سے اُس وقت تک سینہ بسینہ یا سفینہ بسفینہ چلے آتے تھے۔ ایک جگہ جمع کئے تھے۔ مرزا نے اپنے دیباچے میں دکھایا ہے کہ ان اشغال و اذکار کو معرفتِ الٰہی میں کیا دخل ہے؛ اور کیونکر انکے ذریعے سے توحید وجودی تک سالک کی رسائی ہو سکتی ہے۔ دیباچۂ مذکور کا اوّل و آخر کا حصّہ چھوڑ کر صرف وہ مقام جس میں مرزا نے مذکورہ بالا مقصد کو بیان کیا ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مرزا لکھتے ہیں کہ وجہ حق یوں ہے کہ حقیقت از روے مثال ایک نامہ درہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جسکے

اُن خطوں میں لکھتے تھے۔ جن سے ہنسی یا ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے مثلاً سید یوسف مرزا کو اُن کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں

یُوسف مرزا کیونکر تجھکو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر یہ ایک شیوۂ فرسودۂ ابناے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجا کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا۔ پھر باپ مرا۔ مجھسے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہونگا یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونو قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی، نہ قید فرنگ،،

آنکھیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں "اے میری جان! اے میری آنکھو!

"نہ ہجران طفلے کہ زر خاک رفت چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لیکر آیا تھا۔ یہاں رہکر کیا کرتا؟ ہرگز غم نکرو۔ اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو خدا تمکو جیتا رکھے ۔ اولاد بہت۔ نانا، نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔ ہاں مظفرالدولہ کا غم منجملۂ واقعات کربلاے معلّی ہے۔ یہ داغ جیتے جی نہ مٹے گا۔

وہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھکر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے ! اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گذر جاؤں۔ عالم بیرنگی میں گذر پاؤں۔ جس سناٹے میں میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونو عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دئے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونو اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے اُنکو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہمکو تمکو ہوگا،،

مرزا نے بعض اُردو خطوں میں اور خاصکر اُردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفات بارِدہ میں شمار کیا جاتا ہے خصوصاً اُردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی مگر مرزا نے جس قسم کی مسجع عبارت اُردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے اُس پر یہ گرفت مشکل سے ہوسکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ نخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اُس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اسی لئے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بسبب لزوم مالایلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اسکی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اُردو رقعات میں اسکی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر یہ معلوم رہے کہ مقفیٰ عبارت مرزا خاصکر

بیگ بہنی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپیہ کرایہ کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی ؛ تباہ و خراب لاہور گیا ؛ وہاں پڑا ہوا ہے ؛ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلبھ گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقع ہے۔ صلحاء اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے اسکو بھی سچ جانو،،

بعض خطوں میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا بیان نہایت موثر طریقے میں کیا ہے جس سے انکے خیالات معلوم ہوتے ہیں مثلاً

ایک خط میں لکھتے ہیں ،، ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی، رکاب میں پانو ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر ؛ اور اگر بازپرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں ،، تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جیئے تو کیا۔ کچھ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی ؛ باقی سب وہم ہے۔ اے یار جانی۔ ہرچند وہ بھی

پھر دوسرا جنم ہمکو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے؛ یعنی ایک خط میں نے منشی
نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اُسکا جواب مجھکو آیا۔ اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال متخلص
بہ تفتہ ہو آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اُسکا نام بھی دلّی اور اُس محلے کا نام بھی بلّی ماروں کا محلہ ہے؛
لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اِس شہر
میں نہیں ملتا کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ؛ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہوگئے ہیں"
ایک خط میں نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں "دو کل تمھارے خط میں دوبار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی
بڑا شہر ہے؛ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہونگے۔ اے میری جان یہ وہ دلّی نہیں ہے جسمیں تم پیدا ہوے
ہو، وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلّی نہیں ہے جسمیں تم شعبان بیگ کی حویلی
میں مجھسے پڑھنے آتے تھے، وہ دلّی نہیں ہے جسمیں میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلّی نہیں
ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں؛ ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ
باقی سراسر ہنود۔ بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں + + +
امرای اہلِ اسلام میں اموات گنو تو حسن علیخاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپیہ روز کا پنشن دار سو روپے
مہینے کا روزینہ دار بنکر نامرادانہ مرگیا۔ میر ناصرالدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف
سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا
نہ دوا نہ غذا؛ انجام کار مرگیا۔ تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا
جسکا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا اُسکے پاس ایک پیسا نہیں ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو
مل گیا ہے مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر اور نوش جان کر کے

شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو، میں لم یلد ولم یولد ہوں۔

مرزا قربان علی بیگ سالک کو خط میں لکھتے ہیں "یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی: اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اترا تا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا؛ بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم (جیسا بادشاہوں کو بعد انکے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں) چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر!!! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں "اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بحرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو، بولے کیا بحیا، بے عزت؟ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام؛ قرض لیئے جاتا ہے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دونگا،،

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے اُسکی کیفیت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اسطرح لکھتے ہیں "صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیئے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمھارے دوست تھے اور منشی نبی بخش انکا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط؛ بعد چند مدت

سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھکو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گذری؟ بقول شیخ علی حزیں

"تا دسترس بود زدم چاک گریباں   شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم"*

"جب ڈاڑھی موچھ میں بال سفید آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے، اس سے بڑھکر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے؛ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام؛ مُلّا حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جُلاہا، کنجڑا، مُنھ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر مُنڈایا"

الغرض مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے جنمیں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہوں یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔ منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں "بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہوگیا، یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اُسکو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھکو بیٹا سمجھتی تھی۔ مرگئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے، تین پھپھیاں، اور تین چچا، اور ایک باپ، اور ایک دادی، اور ایک دادا، یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں یہ جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اُسکے مرنے سے مینے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مرگئے"

ایک ایسی ہی افسردہ تحریر میں نواب امین الدین خاں کو لکھتے ہیں "آج تم دونو بھائی اس خاندان میں

---

* یہاں اس شعر کے لکھنے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جبتک مجھے موقع ملا برابر ڈاڑھی کا حق ادا کرتا رہا یعنی منڈاتا رہا پس اسلئے میں کسی طرح شرمندہ نہیں ہوں ۱۲

میسر ہو اور ہم کو تو عشق مجازی تھی رہا۔ سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی ❊ عشق محمد بس است و آل محمد ❊ اللہ اسی سے ہو بس۔

ایک اور خط مرزا صاحب موصوف کو اسی چنا جان کی تعزیت میں اس طرح لکھا ہے۔ مرزا صاحب! ہمکو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائی شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی۔ کہ ہمکو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ۔ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے، اور اسی ایک نیکبخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا منھ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائیگی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائیگی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

زن نو کن اے دوست ہر نو بہار   کہ تقویم پارینہ ناید بکار

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے اسکی رسید اس طرح لکھتے ہیں۔ وہ حلیہ مبارک نظر افروز ہوا --- تمھارا حلیہ دیکھکر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھکو رشک نہ آیا کسواسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کسواسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اسکی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھکو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر

بڑھا دیں۔ پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت
یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں، سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونو ہتکڑیوں کے بھاگا۔
میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا، کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگونگا
بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی
ماہِ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بعد
نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤنگا۔ فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں روم ٭ سوی شہر خود ازیں بادیۂ ویراں بروم ٭

ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کو انکی محبوبہ چنا جان کی تعزیت میں لکھا ہے اسمیں لکھتے ہیں "آپ کا
غم فزا نامہ پہنچا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اُس مرحومہ کا اور آپکا معاملہ
بیان کیا یعنی اسکی اطاعت اور تمھاری اُس سے محبت سخت ملال ہوا۔ سنو صاحب شعرا میں
فردوسی اور فقرا میں حسن بصریؓ اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر
کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جاوے فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصریؓ سے ٹکر کھائے عاشق کی نمود یہ ہے کہ
مجنوں کی ہمطرحی نصیب ہو۔ لیلی اُسکے سامنے مری تھی تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری بلکہ تم اُس سے
بڑھکر ہوئے کہ لیلی اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں
جسپر مرتے ہیں اُسکو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک --- ++ کو میں نے بھی مار رکھا ہے
خدا اُن دونو کو بخشے اور ہم تم دونو کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس
بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے میں بیگانہ محض ہو گیا ہوں، لیکن کبھی
کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُسکا مرنا زندگی بھر نہ بھولونگا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گذرتی ہوگی

ترسیتم ہم بریں بگذرم" ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھکو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہونگا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کرونگا تاکہ مشرکین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اسمیں جلیں + + + +

سنو! مولوی صاحب تمنے کئی فاقوں میں۔ ایک شعر حافظ کا حفظ کیا "چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو الخ" اور پھر پڑھتے ہو اُسکے سامنے کہ اُسکی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دوچند سہ چند ہے! مجموعۂ نثر جداگانہ! اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا ہے اور ہزار شعر اسکے مخالف ہیں"

ایک خط میں تعلقات خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں "سنو! عالم دو ہیں! ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونو عالموں کا وہ ایک ہے۔ جو خود فرماتا ہے "لمن الملک الیوم" اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے "للہ الواحد القہار" ہرچند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں: لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گناہگار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا! اور مجھے اُس زنداں میں ڈالدیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیلخانے سے بھاگا تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے: اور پھر اُسی مجلس میں بٹھادیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریزپا ہے دو ہتھکڑیاں[*] اور

---

[*] بیڑی سے مراد اہلیہ اور دو ہتکڑیوں سے مراد حسین علی خاں اور باقر علی خاں جنکو مرزا نے اُنکے والد زین العابدین خاں کی وفات کے بعد خود فرزندوں کی طرح پرورش کیا تھا۔

بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمدوہی ایک سو باسٹھ ۱۶۲، تنگ آگیا، گذارا مشکل ہوگیا، روزمرہ کا کام بند رہنے لگا، سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینا بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گذرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا۔ قرض مقسط ادا ہوگیا۔ متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہوگئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی انکو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا،،

اے بےخبر ز لذتِ شربِ مدام ما،، دیکھا ہمکو یوں پلاتے ہیں۔ دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائلِ ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے، اور عرفا کے کلام سے حقیقتِ حقہ وحدتِ وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں، اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا مؤثر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام در بیں

بیٹے کو محبت چاہئیے بڑی بات ہے،،

نواب علاؤ الدین خاں اور انکے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر رنجی ہے۔ باپ دلی آئے ہیں اور بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب علاؤ الدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں "دو سنا گیا کہ نواب امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا۔ پھر دن رہے ازراہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔۔۔ میں نے تمہیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو ہے۔ اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی؟ جتنا تم اسکو چاہتے ہو۔ ہنسنے لگے۔ غرضکہ میں نے بظاہر انکو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے دینی و دنیوی معاملوں کے تم جانو، اللہ مالک ہے،،

ایک دفعہ حضرت ضروریات سے تنگ آکر بعض ضروری خرچ بند کر دیتے ہیں یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیتے ہیں نواب علاؤ الدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اسکا سبب دریافت کیا ہے اور مولوی حمزہ خاں کی طرف سے بطور نصیحت کے مرزا صاحب کو یہ شعر لکھا ہے "چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو" آپ اسکا جواب اس طرح لکھتے ہیں "بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا، ادھر دربار مل کو جا مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی، ہر ایک پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ اور چاٹو، نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھکر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل بھیجی کے سر، بایں ہمہ کبھی خاں نے کچھ دیدیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپیہ آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپیہ رام پور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے، مول میں قسط اسکو دینی پڑے، انکم ٹکس جدا، چوکیدارہ جدا، سود جدا، مول جدا،

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے؛ اُس میں لکھتے ہیں "دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں؛ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں؛ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے؛ اور روزہ بہلانا اور بات ہے"

جس زمانے میں برہانِ قاطع پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مؤلف برہان کی حمایت کی ہے ایک خط میں صاحب برہان کا ذکر کرنے کے بعد اُسکی اور اُسکے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں "اِن فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھدیا۔ نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اُسکو مانیں؛ ہندیوں کو کیونکر مسلّم الثبوت جانیں۔

لطیفہ ایک گائے کا بچہ بزورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا؛ بنی اسرائیل اُسکو خدا سمجھے"

ایک خط کے آخر میں جو نواب علاؤ الدین خاں کو لکھا ہے۔ لکھتے ہیں "اُستاد میر جان کو اِس راہ سے کہ میر تقی* پھپھی اُنکی چچی تھیں اور یہ مجھسے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا۔ اور اِس رُو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی و بیشیِ سن و سال کی رعایت نہیں کرتے۔ سلام۔ اور اِس سبب سے کہ اُستاد کہلاتے ہیں۔ بندگی۔ اور اِس نظر سے کہ یہ سید ہیں۔ درود۔ اور موافق مضمون اِس مصرع کے "دو سوے اللہ واللہ مافی الوجود" سجود"

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں "دیوانخانے کا حال محلسرا سے بدتر ہے میں مرنے سے نہیں ڈرتا؛ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہوگئی ہے؛ ابر دو گھنٹے

* یہ اشارہ صاحب برہانِ قاطع کی طرف ہے ۱۲

سوشل، اور دلچسپ مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں۔ بائیوگرفی اور ناولوں میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں۔ باوجود اسکے مرزا کی تحریر خط کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اِس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اُسکو پڑھکر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اُسکی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے؛ اُسمیں اُن کی لڑکی کو۔ جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہوگئی ہے۔ بعد دعا کے لکھتے ہیں "دیکھو بھئی اب ہم اگر کول آئے بھی تو تمکو بیٹھ کر دیکھیں گے؛ کیا تمھارے ہاں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟"

یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جو اب رئیس لوہارو ہیں۔ اُنکے بچپن کے زمانے میں اُنکے رقعے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اِس طرح لکھتے ہیں "اے مردمِ چشمِ جہاں بینِ غالب۔ اپنے القاب کے معنی سمجھ لو؛ یعنی چشمِ جہاں بینِ غالب کی پُتلی۔ چشمِ جہاں بین تمھارا باپ مرزا علاؤ الدین احمد خاں بہادر۔ اور پُتلی تم۔ میاں تمھارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں؛ میں تو صرف تمھارا دل دادہ ہوں۔"

لطیفہ

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے اُنھوں نے اُسکا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا اُسکے جواب میں اُنکو اِس طرح لکھتے ہیں "دیکھو صاحب یہ باتیں ہمکو پسند نہیں؛ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو؛ اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائیگا تو یہ کہوگے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے"

اِن الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ میں نے
جس قدر اُن کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے؛ میری نسبت نہیں لکھا؛ اُسی قدر اُنکو
اِس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں از راہ کسرِ نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔

مغربی طریقے پر جو قصے لکھے جاتے ہیں اُنمیں اکثر اِس قسم کے سوال وجواب ہوتے ہیں جیسے کہ
مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں ہر سوال وجواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا
اُنکے ناموں کی کوئی علامت لکھدی جاتی ہے؛ ورنہ یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا؟ اور جواب
کہاں سے شروع ہوا؟ مرزا ایسے موقع پر سائل ومجیب کا نام نہیں لیتے؛ اور نہ اُنکے نام کی علامت لکھتے ہیں۔
مگر سوال یا جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ سوال کیا ہے؟
اور جواب کیا؟ شاید قصے یا نوول میں یہ بات نہ چل سکے؛ مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

مرزا کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اُسکی پیروی نہ کرسکیں
مگر وہ چیز جسنے اُن کے مکاتبات کو نوول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخیٔ تحریر ہے جو اکتساب
یا مشق ومہارت یا پیروی وتقلید سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط وکتابت
میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے؛ اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی وظرافت پر رکھنی چاہی ہے؛
مگر اُنکی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی
طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تاروں میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں؛ اور قوتِ متخیلہ
جو شاعری اور ظرافت کی خلّاق ہے اُسکو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر
کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اُردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے، علمی، اخلاقی، پولیٹکل

قرز نہیں آپ سے خفا کیا ہونگے. بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے. اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں. کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا. اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے. میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں؛ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیئے گا. میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو؛ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا. لاحول ولاقوۃ"

اسکے بعد میر مہدی سے مخاطب ہوکر اصل مطلب لکھتے ہیں.

"بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اسکو غائب فرض کر لیتے ہیں؛ یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے انداز بیان سے واقف نہیں وہ اسکو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں. مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں "میر مہدی! جیتے رہو. آفریں صد ہزار آفریں. اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھکو رشک آنے لگا ہے. سنو دلی کی تمام مال ومتاع وزر وگوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی؛ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لیگیا مگر میں نے اسکو بحل کیا؛ اللہ برکت دے"

ظاہر ہے کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں؛ کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلہ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے. مگر جو لوگ مرزا کی اٹھکیلی چالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اسکے دوسرے معنی سمجھ جاتے ہیں. اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلے کا رہنے والا ہے -

مرزا کی اُردو خط وکتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا، اور نہ اُنکے بعد کسی سے اُسکی پوری پوری تقلید ہوسکی۔ اُنھوں نے القاب وآداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ اور اور بہت سی باتیں جنکو مترسلیں نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں سب اُڑادیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں، اُسکے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کردیتے ہیں۔

ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہہ بات چیت یا سوال وجواب کرتے ہیں۔ مثلاً اُنکو یہ لکھنا تھا کہ "محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گذرا۔ مینے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ اُسنے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائینگی؟ اُسنے کہا آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہورہی ہے"۔ اس مطلب کو اُنھوں نے اسطرح ادا کیا ہے "محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ۔ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائینگی؟ آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہورہی ہے۔"

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے؛ اُسمیں لکھنا یہ ہے کہ میر نصاحب آئے اور اُنسے یہ یہ باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اُسکو اسطرح شروع کرتے ہیں "اے میر نصاحب السلام علیکم۔ حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھدیتا ہوں؛ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میر نصاحب! اُسکے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا؛ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپکے

اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثرِ فارسی سے نہیں ہوئی۔
اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے؛ اور اُنکے اُردو دیوان کو بھی ایک عالی تبہ
کلام عام افہام سے بالاتر سمجھتے تھے؛ مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلیداً تھا نہ تحقیقاً۔ وہ خود
اپنے ایک مرتبہ دان اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں "میرے فارسی قصیدے کہ جنپر
مجھکو ناز ہے کوئی اُنکا لطف نہیں اُٹھاتا مگر بطریقِ اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے دادِ سخن
کہاں اور ادراک پایۂ معنی کہاں؟ تاریخ تمرٔیہ (یعنی مہر نیمروز) کے پانسات جزو جو آپکے پاس بھیجے
ہیں میری خاطر نہ کیجیے؛ انصاف سے کہیے کہ یہ نثر کہیں اور ہے؟ اور پھر اُس نثر کا کوئی مشتاق ہو"
اگرچہ مرزا کی اُردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہئے ویسی نہیں ہوئی۔ چنانچہ بعض افضل تحریروں
میں دیکھا گیا کہ اُردوے معلّیٰ اور بوستانِ خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے؛ لیکن پھر بھی
مرزا کی اُردو نثر کے قدر دان بہ نسبت ناقدر دانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے۔

مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں، چند تقریظیں اور دیباچے ہیں؛ اور تین مختصر
رسالے ہیں۔ جو برہانِ قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں؛ لطائفِ غیبی، تیغ تیز اور
نامۂ غالب۔ اسکے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں۔ جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے
لکھنا شروع کیا تھا۔ اِن میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطف انگیز اُنکے خطوط ہیں جنمیں سے زیادہ تر
اُردوے معلّیٰ میں اور اُس سے کم عودِ ہندی میں جمع کر کے چھپوائے گئے ہیں۔ اور بہت سے خطوط
اِن دونو کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں۔ جو اب تک شائع نہیں ہوئے۔ مگر
عنقریب بعض احباب کا ارادہ اُنکے چھپوانے کا ہے۔

بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا ہے، اُسکے شکریے میں یہ رباعی لکھی ہے۔ بڑا فیروزہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہوتا ہے۔

نثر اردو

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے، مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے، اور ہمہ تن مہر نیم روز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اُسوقت بضرورت اُنکو اُردو میں خط کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوت تخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُنکی ہمت مہر نیم روز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اُسوقت اُنکو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی - اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں - شاق معلوم ہوئی ہوگی۔ اِسلئے قیاس چاہتا ہے کہ اُنھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی حرارتِ غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے

مضمحل ہو گئے قوےٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں"

غالباً اُردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اول اول اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا۔ مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اُسکی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُنکی

اور لیت ولعل کرتے ہیں ۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں پھر یہ خیال
آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں ۔ صبح و شام کرنا لیت ولعل کرنے کو
کہتے ہیں چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح شام
کرنے والے ہیں ۔ مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کامروائی خلق میں جیسی لیت ولعل وہاں ہوتی ہے ایسی
کہیں نہیں ہوتی کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گذر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا ۔

رباعی ۵

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں ۔ آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن ۔ خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی بھی اسی قطعہ کے ساتھ جس میں روزے کا مضمون باندھا ہے دربار میں پیش کی گئی تھی ۔

رباعی ۶

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں ۔ عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا ۔ کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

یہ رباعی عاشقانہ ہے اور بالکل نیا مضمون ہے ظلم سے ہاتھ اٹھانا اس سے دست بردار ہونا اور
اسکو ترک کرنا باقی الفاظ کے معنی ظاہر ہیں ۔

رباعی ۷

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے ۔ بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار ۔ فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنگویم مشکل

اِس اخیر کے مصرع میں دو معنی پیدا ہوگئے ہیں ایک یہ کہ اگر اُنکی فرمائش پوری کروں اور آساں شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ بُرا مانتے ہیں اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اِس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخنورانِ کامل کی نافہمی اور کُند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھیرتا ہوں پس ہر طرح مشکل ہے۔

رباعی ۲

بھیجی ہے مجھے جو شاہِ جم جاہ نے دال　　ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال

یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال　　ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

بادشاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو بادشاہ پسند کہلاتی تھی یہ رباعی اُسکے شکریہ میں لکھی گئی ہے۔

رباعی ۳

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے　　تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ　　ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

رباعی ۴

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے　　کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے

کہتے ہیں کہیں خدا سے- اللہ اللہ!!!　　وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

اِس رباعی میں مرزا نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے کہتا ہے کہ ہم ہر چند دربار کے با اختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں مگر وہ ہماری کام روائی میں دِرنگ

قطعہ ۴

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو — اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں بادشاہ کی حضور میں پڑھا گیا تھا جسکو سنکر بادشاہ اور تمام مصاحبین جو دربار میں موجود تھے بے اختیار ہنس پڑے۔

قطعہ ۵

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی — مجھپہ کیا گذری گی اتنے روز حاضر ہوئے

تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد — تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

ایک شعر میں مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل جنمیں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں کس عمدگی سے بیان کی ہے یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے۔

قطعہ ۶

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے — جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے — کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے*

رباعیات

رباعی ۱

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اُسے سخنورانِ کامل

---

* شریکِ غالب اُس شریک کو کہتے ہیں جسکا حصہ دوسرے شریکوں سے غالب ہو۔ شریکِ غالب کے لفظ میں جو لطف ہے وہ ظاہر ہے۔

کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئی سلام ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

بادشاہ کے دربار کا یہ داب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے۔ چونکہ اُردو محاورے میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں اس لئے مرزا نے اُسکو اس پیرائے میں بیان کیا ہے۔

قطعہ ۳

شکریہ

نہ پوچھ اسکی حقیقت۔ حضور والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں۔ نکلتے نہ خلد سے باہر جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہلِ دربار کے لئے بطور اولوش کے بھیجا کرتے تھے اُسکے شکریے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گذرانتے تھے یہ قطعہ بھی اُسی قبیل کا ہے۔

لطیفہ

جسوقت چوبدار بادشاہی یہ اولوش لیکر آیا ایک باہر کا رہنے والا طالب علم۔ جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا۔ موجود تھا۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اُسنے مرزا سے متعجب ہو کر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے؟ مرزا نے کہا "ارے احمق! چنا وہ چیز ہے کہ اسنے ایکدفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھپر بڑے ظلم ہوتے ہیں! مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، بھوتے ہیں، پکاتے ہیں، اور مجھسے سیکڑوں کھانے کی چیزیں بناکر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھپر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جا؛ ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھکو کھا جائیں۔"

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھکو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سُنیے — ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم میری ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہو مجھکو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری* سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ ۲

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں — دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

* شاعری سے مراد یہاں صنعت شاعرانہ ہے چونکہ یہ قطعہ مرزا نے اپنے خاص طرز کے خلاف بہت سیدھا سادہ لکھا ہے تو دعا بھی ایسی ہی سیدھی سادی ہے جسمیں کسی طرح کی صنعت شاعرانہ نہیں ہے ۱۲

تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں　　تھا میں اک درد مندِ سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی　　ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز　　روشناسِ ثوابت و سیار

گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری　　ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی　　جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں　　بادشہ کا غلامِ کارگذار

خانہ زاد اور مرید اور مداح　　تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہوگیا صد شکر　　نسبتیں ہوگئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں　　مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد! اگرچہ مجھکو نہیں　　ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر　　جسم رکھتا ہوں۔ ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے ابکے سال　　کچھ بنایا نہیں ہے ابکی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ　　بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان　　دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی　　وقنا ربنا عذاب النار

؎ بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی مرزا کی آمد و رفت قلعہ میں جاری تھی اور مدحیہ قصیدے برابر بادشاہ کے ہاں گذرانتے تھے اور خلعت پاتے تھے ۱۲

کیا دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونو باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں: پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے۔ اِسکے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اُس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

اِس غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں جنھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بلایا تھا مگر غالباً مرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا اُن مدحیہ اشعار میں سے صرف دو شعر اس مقام پر لکھے جاتے ہیں۔

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے | بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کے لئے
زمانہ عہد میں ہے اُسکے محوِ آرائش | بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

قطعات

قطعہ ۱

یہ وہ قطعہ ہے جو مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اِس درخواست سے گذرانا تھا کہ اُنکی تنخواہ جو ششماہی گذرنے پر اکھٹی چھ مہینے کی ملا کرتی تھی وہ ماہ بماہ ملا کرے چنانچہ اِس درخواست کے موافق ملنے لگی تھی۔

شاعری سے مراد ... بھی ایسی ہی سیدھی

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ | اے جہاندارِ آفتاب آثار

ثواب حضور کی نذر کرونگا۔ اُدھر سفرِ حج کا وہ اشتیاق اور اِدھر حج کے ثواب کی یہ بیقدری۔

رندانہ

قناعت

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے — یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھکو — ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہ جام بہت ہے

یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لئے کافی ہے مگر اس خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع ہیچ نہ سمجھے اُسپر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

قناعت

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یعنی جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے اُسکا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کیلئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

کوشش

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

اس سے زیادہ کوشش کی سختی کسی پیرائے میں بیان نہیں ہوسکتی۔

شوخی

گدا سمجھکے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے — اُٹھا اور اُٹھکے قدم میں نے پاسباں کیلئے

اُردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے اندازِ بیان پر پروانہ تھے۔ ہمنے مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ ریمارک کیا ہے یہاں اُسکی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اسمیں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی ایک یہ کہ پاسبان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک

نہیں ہو سکتی بلکہ اسکے لئے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہئے یعنی جب تک دل تیغ عشق سے مجروح نہو یہ رتبہ
حاصل نہیں ہو سکتا۔

عاشقانہ

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

یعنی ساری عمر تو صبر کی آزمائش ہی میں گذر گئی پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کیجاتی۔

تعریف

بات پر وہاں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اخلاق

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

اخلاق

روک دو گر غلط چلے کوئی
ڈھانک لو گر خطا کرے کوئی

شکایت

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

مایوسی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

آرزومندی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

خواہش پر دم نکلنا اسکے پورے ہونیکے لئے جلدی کرنا چنانچہ کہتے ہیں کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو یعنی کیوں جلدی کرتے ہو پہلے مصرع میں بمقتضائے مقام یہ الفاظ کہ ,, دل میں باقی ہیں،، مقدر ماننے چاہئیں باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

شکایت

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

دوسرے مصرع میں بہت کے لفظ پر زور دینا چاہئے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔

شوخی

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے | دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

دھویا جانا سبب شرم و بیباک ہونا۔ پاک یعنی آزاد یا شستہ۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو ہمیں بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا شروع ہوگا اور پھر وقت آنسو جاری ہو بیٹھے تو اخفائے راز عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ دوستوں اور دشمنوں کی نسبت کچھ خیال نہ کیا یعنی مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ رونے سے دھوئے گئے تو بالکل پاک ہو گئے۔۔ بلاغت اور حسن بیان کی انتہا ہے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ | کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

شاہد حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اسکو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ سحابی بھی کہتا ہے

رباعی

اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ | دور تو و نزدیک ترا حال تباہ

کس نیست کہ جان از تو سلامت ببرد | آن را بہ تغافل کشتی این را بہ نگاہ

دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسکے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اسکی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے جب اسنے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہمکو فنا کر دیا۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی | مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

صوفیہ کی اصطلاح میں محادثت اور مسامرت (یعنی عبد اور معبود کے درمیان گفتگو ہونا) دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں کہتا ہے کہ شاہد حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت

انتظار

ہائے وہاں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا — لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے — تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے۔

عاشقانہ شوخی

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے — عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے — جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اسکی کیا تلافی ہو سکتی ہے نیکی نہیں کر سکتا۔

عاشقانہ

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

عاشقانہ

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی — نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھ سے

اس میں جذباتی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ قوتے جن سے عشق کے ترک کرنے یا اسکے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی ابتدائے عشق میں انھیں کو صدمہ پہنچا ہے پس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے نہ اسپر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے۔

تصوف

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

تصوف

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

عاشقانہ

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے — نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

اخلاق

سفینہ جبکہ کنارے پہ آ لگا غالب — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

لہٰذا تو خون دوسرے شعر میں ہے یہ معنی پیدا کر دیئے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا، اس لئے دوست کے سرِ انگشتِ حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اسکی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے — یہاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

بے حوصلگی یعنی کم ظرفی۔ یہاں سے مراد دنیا۔ معشوق سے کہتا ہے کہ تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے جور و ظلم سے تنگ آ کر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کرینگے کیونکہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو یہاں کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا۔

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل — کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

پھول کے کھلنے کو چاکِ گریباں سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے کہتا ہے کہ ہر ایک کام غیر کی ہدایت سے کرنا چاہیے، پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے تو بھی گریبان چاک مت کر۔ اسمیں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوشِ جنوں زیادہ ہوتا ہے۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے - نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد — مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

مگس کی قے یعنی شہد۔ زاہد جو شہد کے پینے کو موجبِ ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اسکو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کے تے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو ہیں عاشق تمہارے نام کے
عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک اسکو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادپیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب شاہِ دیندار نے شفا پائی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی کہتا ہے کہ میری قدر اُس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہوا اور ہر شخص آتے جاتے اُسپر پاؤں رکھکر گذرے یعنی ہوں تو گراں قدر مگر اُس پتھر کی طرح بے قدر ہوں پس میری گرانی کس قدر ارزاں ہے۔

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا کھل گئی ہیچمدانی میری

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی" دونو کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے مگر سعدی کے بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی ظاہری بدحالی دیکھکر سمجھ جائے کہ اسکا دل مغموم ہے کیونکہ سعدی کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم جاتا رہتا ہے نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے مگر مرزا کے بیان میں یہ احتمال باقی نہیں رہتا با اینہمہ سعدی کے شعر کو بہرحال مرزا کے شعر پر ترجیح دینی چاہیے کیونکہ الفضل للمتقدم۔

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے ۔۔۔ دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض

گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا ومافیہا کی کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتایا ہے تو اسکے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا یا وبا نہیں آنے کی یا لڑائیاں نہیں ہونگی وغیرہ وغیرہ لطف یارہ۔

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ۔۔۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا ۔۔۔ اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھیریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم ۔۔۔ آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف ۔۔۔ آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل ۔۔۔ جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہمکو ہو بہشت عزیز ۔۔۔ سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا ۔۔۔ دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

بادۂ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی محض از راہ شوخی کے کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اسکے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں، تاکہ نکیرین اُسکی بو کی کراہت سے بغیر سوال جواب کئے چلے جائیں۔

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جائے
جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے
سایے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اِس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے
حُسنِ مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

دوسرے مصرع میں دعوی متضمنِ دلیل ہے۔ معشوق کو مہرِ خورشید جمال اس لئے کہا ہے تاکہ اُسکو ماہِ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اسمیں سوا ملتا ہے
وہ گدا جسکو نہو خوئے سوال اچھا ہے
اُنکے دیکھے سے جو آجاتی ہے رونق منہ پر
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اسی کے قریب قریب سعدی رح کا بھی ایک شعر ہے وہ کہتے ہیں ؎ گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم

شوخی
گرفتاری بلا
شوخی
عاشقانہ
عاشقانہ
عاشقانہ
شوخی
اخلاق
عاشقانہ

تمیز نہیں رہی؛ اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونو مبدّل بزمانۂ حال ہو جائینگے۔ پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گذر گئی۔ قیامت گذر جانے کے دونو معنی ہیں؛ نہایت سختی کا زمانہ گذرنا، اور خود قیامت کا آجانا۔

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھکو بعدِ قتل   میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں   جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

دے کے خط منھ دیکھتا ہے نامہ بر   کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام   ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں   ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی   کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار   یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

گویا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا ہے، اور معشوق و عاشق میں جو ناز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں اُنسے ناواقف ہے؛ اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے معشوق کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔

میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں   کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین   ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

عاشقانہ شوخی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

زندگی اپنی جب اِس رنگ سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

یہ مضمون تھوڑے سے فرق کے ساتھ فارسی غزل میں بھی مرزا صاحب نے باندھا ہے اور وہ یہ ہے

"گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت"

معاملہ

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

معاملہ

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

معاملہ

غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اُسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

یہ شعر معاملہ کا ہے۔ جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گذرتا ہے ! اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرع میں پائی جاتی ہے. ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے ! پھر اسکے کیا معنی ؟ کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے. بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اور. "گر حیا بھی اُسکو آتی ہے"، یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا سے. اور "شرما جائے ہے"، یعنی غیر سے یا اُسکے ساتھ تکرار کرنے سے.

عاشقانہ

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

عاشقانہ

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے و لے باایں ہمہ
ذکر میرا مجھسے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

ناامیدی

بس ہجوم ناامیدی خاک میں ملجائیگی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بیجا صل میں ہے

عاشقانہ

فردا و دی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

کہتا ہے کہ تمھارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہوگئی کہ آج اور کل کی مطلق

یعنی جب غم دنیا سے سر اُٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اُٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اُسکے دیکھتے ہی تو یاد آ جاتا ہے۔ اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے۔ غرضکہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار اُس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے حرف بآسانی کزلک وغیرہ سے اُڑ سکے اور کاغذ پر اُسکا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں از راہ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لئے ہیں جسپر سے حرف غلط خود بخود اُڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرفِ وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکے خط کا کاغذ غلط بردار ہے۔ کہ جو بات سچے دل سے اُسپر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذرخواہ جسکے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق۔ عذرخواہ معافی چاہنے والا، یا معذور رکھنے والا۔ اِس شعر میں دعویٰ ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعوے متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذراتِ عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں۔ اُن کی بدمستی و غفلت کا عذرخواہ وہی ہے جسکے پرتو وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں ازراہِ تہذیب اُس کام کا ذکر نہیں کیا جسکے کرنے کے لئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ۔ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا۔ جب وہی چھٹ گیا اب مسجد میں مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کے کی گئی ہے؛ یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے۔ اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اس شعر کو حقیقت ومجاز دونوں پر محمول کر سکتے ہیں۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو توکیونکر ہو

اُس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جسکے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے۔

یہ کہہ سکتے ہو؟ ہم دل میں نہیں ہیں۔ پر یہ بتلاؤ — کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

اس شعر میں مخاطب معشوق حقیقی ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف۔ تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل وشکوہ ہجراں — خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی — فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

تصوف

شکایت

تصوف

عاشقانہ

عاشقانہ

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظّارہ سے وا ہو

یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے، بلکہ حقیقت واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور، دنیا کے حالات سے ناواقف، اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا، لیکن جس قدر اُسکا دائرہ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اُسی قدر اُسپر یہ بات کُھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے۔ جسپر حسد و رشک کیا جائے۔ بلکہ اُنکی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے؛ اور اِس لئے انصاف اور فیاضی اُسکے دل میں پیدا ہوتی ہے؛ اور وہ خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے پر متوجہ ہو جاتا ہے۔ اِس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ "چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظّارہ سے وا ہو"، جس طرح شعرا نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے۔

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ صواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلے نہیں
ابرا ہی دیکھے ہمنے بچایا ہے کشت کو

غدا شرمائے ہاتھوں کو کر رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

کشادہ رہتا تھا اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب و روز یوسف کی طرف نگراں رہتی تھیں۔

عاشقانہ

نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں — جسکے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار — جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے سبب اوپر نہیں اٹھتیں، بلکہ پلکوں کیطرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔

شوخی

وھاں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو درباں کو دے چکا ہوں دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اسکو ہر شخص ضروری جانتا ہے؛ کیونکہ سب سے حیراں ہو کر یہ پوچھتا ہے کہ بتاؤ انکی گالیوں کا کیا جواب دونگا جبکہ دعائیں سب نبڑ چکیں۔

تصوف

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزاے ایماں ہو گئیں

تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے۔ جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے؛ اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزاے ایمان بنجاتی ہیں۔

تصوف

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا — دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز — آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

حقیقت و مجاز دونو پر محمول ہو سکتا ہے۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے ۔ تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی ۔ سن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

ستم ظریف وہ ظریف جسکی ظرافت کے ساتھ ظلم بھی ملا ہوا ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں نے تو رقیب کو غیر سمجھکر کہا تھا کہ آپکی محفل غیر سے خالی ہونی چاہیے؛ اسنے یہ سن کر مجھے بزم سے اٹھوا دیا؛ یعنی یہاں ایک تو ہی غیر نظر آتا ہے۔

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر ۔ عشق کا اسکو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

قیامت ہے کہ سن لیلےٰ کا دشت قیس میں آنا ۔ تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ۔ کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوئی ہے دوسرے مصرع میں اسکی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے، اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے، کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا!!

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں ۔ کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام ۔ دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

یا رب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے ۔ لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے ۔ آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں ۔ خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر ۔ لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

یعقوب کی آنکھوں کو روزن دیوار زنداں قرار دیا ہے کیونکہ جس طرح روزن زنداں ہر وقت یوسف پر

رہتا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجودِ واجب سے بُعد ہے۔

تصوف

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر — یہاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

وحدتِ وجود اور کثرت موہوم کی تمثیل ہے قطرہ و موج و حباب کے ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورے میں اصطلاح ادا کرنا کہ "یہاں کیا دھرا ہے"، نہایت بلاغت ہے۔

بندش

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئی دوست — مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

عاشقانہ

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

سلوک

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

طالب راہ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اسکو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اول اول جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے، اور اسکے ساتھ ساتھ پھرتا ہے، پھر جب کوئی اس سے بڑھکر نظر آتا ہے تو اسکا تعاقب کرتا ہے، وعلیٰ ہذا۔ اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔

تصوف

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہمکو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

شکوۂ اہل وطن

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب — تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

عالی ظرفی

دو نوجہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یہاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اپنی فراخ حوصلگی اور اسکے ساتھ شرافتِ نفس کا اظہار ہے؛ یعنی میں جو دونوجہان لیکر خاموش ہو رہا اسکا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان پر قانع ہوگیا، بلکہ مجھکو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی اس لئے خاموشی اختیار کی۔

بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بیشک دوبالا ہو جاتا ہے، مگر اُسکا غصہ میں بگڑنا اُسکے بناؤ
سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اِس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں
ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں؛ اسکی اصل خوبی وجدانی ہے جسکو صاحبِ ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔
ایک روز مولانا آزردہ مرحوم کے روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم
اشعار کو پسند کرتے تھے، اس لئے مرزا کا کلام سنکر اکثر اُلجھتے تھے اور اُنکی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے۔ مگر اُس
روز اِس شعر کو سنکر وجد کرنے لگے اور متعجب ہوکر پوچھا کہ یہ کسکا شعر ہے؟ کہا گیا کہ مرزا غالب کا۔ چونکہ
وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے، اور اُس روز لاعلمی میں بے ساختہ اُنکے منہ سے
تعریف نکل گئی تھی، غالب کا نام سنکر بطور مزاح کے جیسی کہ اُنکی عادت تھی فرمایا "ایسی مرزا کی کیا
تعریف ہے یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے"، مگر فی الحقیقۃ یہ شعر بھی معنیً ولفظاً ویسا ہی اچھوتا اور
نرالا ہے جیسا کہ مرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا۔ جہاں تک کہ ہمکو معلوم ہے یہ اسلوب
بیان آجتک اِس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے ‌ ‌ ‌ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اُسکے قابو سے باہر ہونا چابک سواروں کی زبان میں اِس سے
بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حسنِ تشبیہ کا حق ادا کر دیتا ہے

اُتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے ‌ ‌ ‌ جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

غیر سے یہاں ماسوی اللہ مراد ہے۔ جو صوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے۔ کیونکہ وہ وجودِ واحد کے
سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجودِ ماسوی کے وہم سے رات دن پیچ و تاب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں　　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

دوسرے مصرع میں بطور طنز کے کہتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے؛ یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے۔ اسلئے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں۔

مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام　　　ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اِس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے "پھر آج جو خلافِ عادت جام کی نوبت مجھ تک پہونچی ہے" اِس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے ایسا حذف۔ جسپر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کئے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں مُحسّناتِ شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا　　　لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے؛ یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اُسکا التفات اور میلانِ طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف؛ اور ایک نگاہ کا چُرانا ایک طرف۔ اور اُسکے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف؛ اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہل و ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھئے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم پلّہ مصرع بہم پہونچ گئے جن میں حُسنِ ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ اور اگر معنی پر نظر کیجیے تو ہر ایک مصرع میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گذرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے؛ مگر اُسکا آنکھ چُرانا جو لگاوٹ کی ضد ہے وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب و دلاویز ہوتا ہے۔ اسیطرح

چارہ جیسی بیٹا یا دم شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار اور تکلیف میں جو لذت ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اُس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں، مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے اس لئے پہلے ہی قدم پر موت اتفاقی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذت آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

الفت گل سے غلط ہے دعوی وارستگی سرو ہے باوصف آزادی گرفتار چمن

مطلب یہ ہے اگر کوئی کیسا ہی آزاد و وارستہ مزاج ہو دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قبلہ پر قبلہ نما کا اطلاق ظاہرا مرزا کے سوا کسی نے نہیں کیا۔

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں ...

ر نہ معشوق نہ رسوا ہو جائے ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں، خواہ پوشیدہ مصلحت ہو، اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے اگر مرجانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہوجاتے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ ہمکو جینے کی بھی امید نہیں

یہ شعر سہل و ممتنع ہے اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں یہ سوء ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

یعنی آج اس خوف سے شراب دینی کہ کل نہ ملیگی ساقی کوثر کی فیاضی پر سوء ظن کرنا ہے۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔

مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھکو ستمگر۔ ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

جب کہتے ہیں کہ اُسکو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اِسکے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اُسکو اُس کام کے کرنے سے انکار ہے پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اُسکو کھا نہ سکوں مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اِسلئے نہیں کھا سکتا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاویگی ہماری فاقہ مستی ایکدن

کس مُنہ سے شکر کیجئے اِس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پای سخن درمیاں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مِرا ہمزباں نہیں

یہاں ہمزباں کے لفظ میں ایہام ہے ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہو سکتی اور در پردہ اِسمیں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

اُسی مطلب کو جو پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے دوسرے مصرع میں نئے رنگ سے کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے دشت نوردی کی مانع کوئی تدبیر نہ ہونی اُسکو اس طرح ادا کرنا کہ پاؤں میں چکر ہے مگر زنجیر نہیں کمال بلاغت ہے۔

حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

عاشقانہ
عاشقانہ
عاشقانہ
الزام
معاملہ
شوخی
تحریریہ
عاشقانہ
عاشقانہ

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا ۔ روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب ۔ یار لائے مِرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن ۔ جانوں کسیکے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات ۔ سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ۔ ہمکو حریصِ لذّتِ آزار دیکھکر

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ ۔ لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھکر

اِن آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں ۔ جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھکر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا ۔ یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھینگے مری بات ۔ دے اور دل اُنکو جو نہ دے مجھکو زباں اور

یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے مگر اسمیں در پردہ اُن لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے۔

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں ۔ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

اس شعر میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اُسوقت تک راہِ معرفتِ الٰہی میں ایک اور سنگِ گراں سدِّ راہ ہے پس اگر ہمنے بت توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔

ثابت کی ہے۔

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

یعنی اگر نالہ کی اجازت نہو گی تو ہم اُسکو ضبط کرینگے اور اُسکا اثر تجھ تک پہونچیگا۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے کہتا ہے کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے ضرور بہتر ہوگی اب دیکھئے مرنے کے بعد کیا حالت دکھلاتے ہیں جسکا تمام عمر منتظر رکھا ہے۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا

یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعوے چل نہیں سکتا یہ شعر حقیقت و مجاز دونو پر محمول ہو سکتا ہے

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

یعنی جب درد حد سے گذر جائیگا تو مر جائینگے یعنی فنا ہو جائینگے گویا قطرہ دریا میں کھپ جائیگا اور یہی اُسکا مقصود ہے پس درد کا حد سے گذر جانا یہی اُسکا دوا ہو جانا ہے۔

تجھسے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدل بدمِ سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

کیا کمال ہے یہ تو ہمارے انداز کا شعر ہے،، غرضکہ ایک ہمعصر دوسرے ہمعصر کی تعریف بھی کرتا ہے تو اُس میں ایک نہ ایک بات ضرور ایسی شامل کر دیتا ہے جس سے یا اُسکی تنقیص لازم آئے یا اپنی تعریف اُس سے بھی زیادہ نکلے۔

عاشقانہ

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

عاشقانہ نرم

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں — شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

عاشقانہ نرم

رشک کہتا ہے کہ اُسکا غیر سے اخلاص حیف — عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؟

واقعیت

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

کہتا ہے کہ میں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرم راز اور ہمنشین تھا وہی سُنکر میرا رقیب بن گیا؛ کیونکہ اوّل تو ایسے پری وش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیان کی زبان سے۔ پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی ،، اور پھر بیاں اپنا،، یہ مرزا کی خصوصیات میں سے ہے۔

ظرافت

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالینگے — بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسباں ہمارا جان پہچان نکلا؛ اب ہمارے لئے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہمکو ذلت دے ہم اُسکو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے؛ اور یہ ظاہر کرینگے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے؛ ہمارا اسکا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔

شکوہ آسمانی

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے — بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں اور اپنی دانائی اور ہنرمندی کس خوبصورتی سے

خندۂ گل کو خندۂ بیجا اس لئے کہا ہے کہ وہ کچھ سمجھکر یا از راہِ تعجب نہیں ہنستا، پس گویا اُسکا خندہ بے محل ہے۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُسکو یاد اسد ۔۔۔ جفا میں اُسکی ہے انداز کار فرما کا

یعنی فلک کو دیکھ کے خدا یاد آتا ہے، کیونکہ فلک سے جو جفا سرزد ہوتی ہے اُسیکے حکم سے ہوتی ہے۔

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں ۔۔۔ گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

یعنی اُسنے زبردستی کیوں نہ پلادی؟

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا ۔۔۔ بحر اگر بحر نہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگیٔ دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے ۔۔۔ کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق ۔۔۔ آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یعنی ہمارے جرم کے ثبوت کے لئے کسی کی شہادت ہونی ضرور ہے، صرف فرشتوں کا لکھنا کافی نہیں۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم ۔۔۔ میں معتقدِ فتنۂ محشر نہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک ۔۔۔ میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہوا تھا

کہتا ہے کہ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پلہ تک نہیں بھیگا۔ تذکرۂ آبحیات میں لکھا ہے کہ ذوق اس شعر کو نہایت پسند کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ مرزا کو اپنے اچھے شعروں کی خود خبر نہیں ہوتی۔ یہ بعینہٖ ویسی ہی بات ہے جیسے مولانا آزردہ نے مرزا کا ایک عمدہ شعر سُنکر اُسکی تعریف کرتے وقت کہا تھا کہ "اسمیں مرزا کا

حساب دینا پڑتا ہے۔

پیغامِ تصوف

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

تصوف

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

قرآن

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لطیفہ

سُنا ہے کہ جس وقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سُن کر کہا "بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے"۔ مرزا نے کہا "حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں"۔

عاشقانہ

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر — رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

کہتا ہے کہ تو نے ایک مشتاقِ قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لئے قتل نہیں کیا کہ خونِ بیگناہ اپنی گردن پر نہ لے مگر اب تیری گردن پر بجائے خونِ بیگنہ کے حق آشنائی کا رہیگا۔

عاشقانہ شوخی

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا — مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کہتا ہے کہ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اُس سے مجھکو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

خط میں لکھتے ہیں کہ "بھائی! شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے"

اگرچہ مرزا کی اردو شاعری پر بحث کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجایش ہے لیکن چونکہ لوگوں کو ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اس لئے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور صرف اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ مرزا کے دیوانِ ریختہ میں جس قدر اشعار سرسری نظر میں ممتاز معلوم ہوں وہ بطور انتخاب کے یہاں نقل کر دئے جائیں۔ جو اشعار اس سے پہلے مثالوں میں لکھے جا چکے ہیں ان کو اب مکرر نہ لکھیں گے اور جہاں ضرورت ہوگی شعر کے معنی بھی بتائینگے اور کہیں کہیں محاسنِ شعری کی طرف بھی اشارہ کیا جائیگا

ستائشگر ہے زاہد اسقدر جس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

طاقِ نسیاں وہ طاق جس میں کچھ رکھکر بھول جائیں۔ طاقِ نسیاں کا گلدستہ وہ گلدستہ جس کو طاق میں رکھکر بھول جائیں۔ بیخودوں کے بہشت کو گلدستۂ طاقِ نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے جو کہیں نہیں دیکھی گئی۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا — یہاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یعنی راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے، ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردہ ساز کی طرح بول رہے اور بج رہے ہیں، اور اسرار الٰہی ظاہر کر رہے ہیں۔

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب — خونِ جگر ودیعت مژگانِ یار تھا

یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھی، اور اسلئے اُسکے ایک ایک قطرہ کا حساب اسی طرح دینا پڑیگا جس طرح امانت کا

وعدے وفا کرنے، پانچویں میں آپ اپنے پر رشک آنا، چھٹے میں دلِ رنجور کا نقش مدعا غیر کی طرح بیٹھا جانا، ساتویں میں کھینچنے سے نقش کا مصور سے کھنچنا، آٹھویں میں مٹتے مٹتے آپ اپنی قسم ہو جانا، نویں میں آپ اپنی ہمت عالی کے ہاتھ بک جانا، دسویں میں باوجود موت آنے کے موت نہ آنی، یہ سب متاخرانہ نزاکتیں ہیں جو ولی سے لیکر میر، سودا اور درد تک کے کلام میں نہ تھیں؛ اور اگر تھیں تو صرف اُس قدر جیسے آٹے میں نمک۔

اگرچہ ایران میں زمانۂ حال کے شعرا ظہوری و عرفی و طالب و اسیر وغیرہ کی طرز کو ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی روز بروز طبیعتیں نیچرل شاعری کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ رفتہ رفتہ اِس قسم کے تکلفات اور نزاکتیں نظروں سے گر جائیں۔ لیکن یہ سب زمانے کے مقتضیات ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں ایسی باتوں سے اُن لوگوں کی اُستادی اور گرانمائگی میں کچھ فرق نہیں آتا جنکو نئی طرز کے موجد ہونیکا فخر حاصل تھا۔

بہرحال جو نسبت ظہوری، نظیری، عرفی، طالب، اسیر وغیرہم کے کلام کو سعدی، خسرو، حافظ، اور جامی کے کلام سے ہے تقریباً ویسی ہی نسبت مرزا کے ریختہ کو میر، سودا و درد کے ریختہ سے سمجھنی چاہیئے۔ قدما اُردو روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے؛ برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیب بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمالِ شاعری سمجھتے تھے اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی نشست کو محض خیالات کے ظاہر کرنے کا ایک آلہ (نہ کہ مقصودِ شاعری) تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا ایک دوست کو

نواب مرزا خاں داغ نے اسی مضمون میں نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں

رخِ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں   ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

الغرض اس قسم کی معنی آفرینیاں، غالب، مومن اور انکے متبعین کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں۔ چونکہ اس موقع پر صرف مرزا کے کلام پر بحث کرنی مقصود ہے اسلئے چند شعر مرزا کی غزلیات میں سے اسی قبیل کے یہاں نقل کئے جاتے ہیں

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں   رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ۔ دیکھو جرم کسکا ہے   نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں   آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

ضد کی ہے اور بات۔ مگر خو بری نہیں   بھولے سے اسنے سیکڑوں وعدے وفا کئے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے   میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھسے دیکھا جائے ہے

اسکی بزم آرائیاں سنکر دلِ رنجور یاں   مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

نقش کو اسکے۔ مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں   کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے   یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم   لے لیا مجھسے مری ہمتِ عالی نے مجھے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی   موت آتی ہے پر نہیں آتی

پہلے شعر میں خون کا رنگ ہوکر اڑجانا، دوسرے میں عاشق کے جذبہ اور معشوق کی کشیدگی سے کشاکش کا لازم آنا، تیسرے میں نکہتِ گل سے حیا آنی، چوتھے میں بھولے سے سیکڑوں

اس لیئے نئی طرز کے ایجاد کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو طرز فارسی میں متاخرین نکال چکے تھے اُسی کو ریختہ میں ڈھالنا تھا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا غالب نے سب سے پہلے یہ طرز اختیار کی تھی؛ کیونکہ جسطرح کیمسٹری کے مدون ہونے اور علم کے درجے پر پہنچنے سے پہلے اُسکے متفرق اصول مشرقی ملکوں میں بھی پائے جاتے تھے اسی طرح مرزا سے پہلے بھی بعض شعرا کے کلام میں اس نئی طرز کی کہیں کہیں جھلکی سی نظر آجاتی ہے مگر اسمیں شک نہیں کہ اوّل مرزا نے اور اُنھیں کی تقلید سے مومن، شیفتہ، تسکیں، سالک، عارف، داغ وغیرہم نے اس طرز کو بہت زیادہ رواج دیا۔ خصوصاً مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ یہاں ایسی ایک دو مثال لکھنی مناسب معلوم ہوتی ہے جس سے ناظرین بخوبی سمجھ جائیں کہ متاخرین کے اس خاص گروہ نے قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسلوبوں میں کس قسم کی تراکیب اور لفظی و معنوی تصرفات کرکے اُن میں ندرت اور طرفگی پیدا کی ہے۔ مثلاً میر تقی کا شعر ہے۔

میری تغیّرِ رنگ پر مت جا ۔۔۔ اتفاقات ہیں زمانے کے

اسی تغیّرِ رنگ کے مضمون کو مومن خاں نے اس طرح باندھا ہے۔

میری تغیّرِ رنگ کو مت دیکھ ۔۔۔ تجھکو اپنی نظر نہو جائے

یا مثلاً خواجہ میر درد نے معشوق کے رخِ روشن کو شمع پر اس طرح ترجیح دی ہے۔

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور ۔۔۔ شمع کے منھ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

غزل میں بمقابلہ سعدی، حافظ، خسرو وغیرہم کی غزل کے ہم اسی قسم کا تفاوت پاتے ہیں
مثلاً خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

گناہ اگرچہ نبود اختیارِ ما حافظ　　　تو در طریقِ ادب باش و گو گناہِ من ست

نظیری نے اسی مضمون کو حقیقت سے مجاز میں لاکر اسمیں ایک نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے
وہ کہتا ہے۔

تا منفعل ز رنجشِ بے جا نہ بینمش　　　مے آرم اعتراف گناہِ نبودہ را

یا مثلاً دوسری جگہ خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

از عدالت نبود دُور گرش پرسد حال　　　پادشاہے کہ بہمسایہ گدائے دارد

ظہوری کے ہاں یہ سیدھا سادہ خیال ابراہیم عادل شاہ کے حق میں۔ جو کہ اُسکا ممدوح
بھی ہے اور محبوب بھی۔ ایک نئے انداز سے بندھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

مروت کردہ شبہا بر تو سیرِ بام و در لازم　　　نمے باشد چراغی۔ خانۂ بے دستگاہاں را

یعنی چونکہ بے مقدور لوگوں کے گھر میں چراغ نہیں ہوتا اس لئے مروت اور کرم نے تجھپر
لازم کردیا ہے کہ راتوں کو کوٹھے پر چڑھکر ٹہلا کرے تاکہ تیرے چہرے کی روشنی سے اُنکے گھر
میں چاندنا ہوجائے۔ مطلب یہ کہ اُنکے حال سے واقف ہوکر اُنکی مدد کرے۔

مگر یہ انقلاب فارسی غزل میں کم و بیش چار سو برس بعد ظہور میں آیا تھا کیونکہ نئی طرز اُسوقت
تک ایجاد نہیں ہوتی جب تک ضرورتیں اہلِ فن کو سخت مجبور نہیں کرتیں۔ لیکن ریختہ میں یہ
انقلاب ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر پیدا ہوگیا، کیونکہ متاخرینِ اہلِ ایران کا نمونہ موجود تھا

مذکورۂ بالا خصوصیتوں کے علاوہ ایک اور بات قابلِ ذکر ہے جو مرزا اور اُنکے بعض معاصرین و متبعین کی غزل میں عموماً پائی جاتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ریختہ کی بنیاد فارسی غزل پر رکھی گئی ہے۔ جو جذبات اور خیالات اہلِ ایران نے غزل کے پیرائے میں ظاہر کئے ہیں ریختہ گویوں نے زیادہ تر بلکہ بالکل اُنھیں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پس جو انقلاب ایک مدت کے بعد فارسی غزل میں پیدا ہوا۔ ضرور تھا کہ وہی انقلاب اُردو غزل میں ایک عرصے کے بعد پیدا ہو۔

قدمائے اہلِ ایران جن کا دورہ مولانا جامی پر ختم ہوتا ہے اُنکی غزل میں جو جذبات و خیالات بیان ہوئے ہیں وہ اپنی نیچرل حالت سے متجاوز نہیں ہوئے؛ اور گو اسالیبِ بیان میں تلاحقِ افکار کے سبب رفتہ رفتہ بہت وسعت اور لطافت پیدا ہوگئی لیکن بیان کا طریقہ نیچرل سادگی کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ مگر چونکہ خیالات نہایت محدود تھے ایک مدت کے بعد جتنے سیدھے سادے عمدہ اور لطیف اسلوب تھے وہ سب نبڑ گئے اور متاخرین کے لئے ایک چچوڑی ہوئی ہڈی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ اگر متاخرین غزل کو ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ بناتے تو اُنکے لئے میدانِ غیر متناہی موجود تھا مگر اُنھوں نے اُس محدود دائرے سے باہر نکلنا نہ چاہا؛ اب جو لوگ تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اُنھوں نے تو اسی چچوڑی ہوئی ہڈی پر قناعت کی؛ مگر جنکی فطرت میں اُرجنیلٹی اور اُپج کا مادّہ تھا وہ اُنھیں قدیم خیالات و جذبات میں اپنے اپنے مبلغِ فکر کے موافق نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کرنے لگے۔ چنانچہ نظیری، ظہوری، عرفی، طالب، اسیر اور اُنکے اقران و امثال کی

فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا   بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

"ہمارے بھی منہ میں زبان ہے" اسمیں دو معنی رکھتے ہیں: ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تمکو قائل کر دینگے! اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھکر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا ہے یا نہیں۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے   دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

"کون اُٹھاتا ہے مجھے" اسکے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اُٹھا دیتے تھے اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اُٹھاتا ہے؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اُٹھا دیتے تھے دیکھوں اب میرا جنازہ کون اُٹھاتا ہے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے بادپیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے۔ اسمیں بادپیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیے ہیں: بادپیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں؛ پس ایک معنی تو اسکے یہ ہیں کہ فصلِ بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اسمیں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض بادپیمائی یعنی فضول کام ہے۔ اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا؛ اور بادپیمائی خبر۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ بادپیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے؛ اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح بادپیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے۔

نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اُسکو گوارا نہوتی ؛ اور یا اب ہمکو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے - اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اِس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اُس قصّے کی طرف اشارہ ہے جو قرآنِ مجید میں مذکور ہے ؛ کہ جب خدا تعالےٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا "کیا تو دنیا میں اُس شخص یعنی اُس نوع - کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اُسمیں فساد اور خونریزی کرے ؛ وہاں سے ارشاد ہوا کہ "تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں"، اور پھر آدم سے اُنکو زک دلوائی ؛ اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں ۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی ۔

مثال

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم | قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اِسکے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سروِ قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے ۔ اور دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اُسی میں سے بنایا گیا ہے ؛ اِسلیے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے ۔

مثال

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا | ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہمکو

اس شعر میں "ترے سر کی قسم ہے ہمکو" اِس جملے کے دو معنی ہیں ؛ ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہے ہم ضرور سر اُڑائینگے ۔ اور دوسرے یہ کہ ہمکو تیرے سر کی قسم ہے - یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اُڑائینگے جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے - یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے ۔

مثال

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ | جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

اِسکا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو ؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تمکو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں سے مرد افگن عشق کا ساقی یعنی
معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے
بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا۔ اس لئے اُسکو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے۔
مگر بغور غور کرنے کے بعد۔ جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے۔ اسمیں ایک نہایت لطیف معنی پیدا
ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع یہی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں۔ اور اس مصرع کو
دو مکرر پڑھا جاتا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے۔ "کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن
عشق"۔ یعنی کوئی ہے جو مے مرد افگن عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا
تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے۔ "کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق"
یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اسمیں لہجہ اور طرز ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے۔ اور
مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کروگے فوراً
یہ معنی ذہن نشین ہو جائینگے۔

کیونکر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز	کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اسکے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اُس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا۔ اسلیے
جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اُس بُت پر جان قربان کرنا عین
ایمان ہے۔ پھر اُس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند	گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

اسکے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق گویا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری

تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں، اور کیا فارسی میں، کیا نظم میں، اور کیا نثر میں۔ باوجود سنجیدگی و متانت کے۔ شوخی و ظرافت ہے؛ جیسا کہ مرزا کے انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا۔ مرزا سے پہلے ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گذرے ہیں؛ ایک سودا، دوسرے انشا؛ مگر دونو کی تمام شوخی و خوش طبعی ہجو گوئی یا فحش و ہزل میں صرف ہوئی؛ بخلاف مرزا غالب کے کہ انھوں نے ہجو یا فحش و ہزل سے کبھی زبانِ قلم کو آلودہ نہیں کیا۔

چوتھی خصوصیت مرزا کی طرزِ ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے؛ اور جسکو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں مابہ الامتیاز کہا جا سکتا ہے؛ بعض اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلودار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں؛ مگر غور کرنے کے بعد اسمیں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں؛ جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں۔ لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اِس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اِس قدر ویران ہے کہ اُسکو دیکھکر گھر یاد آتا ہے؛ یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اِس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہو گی؛ مگر دشت بھی اِسقدر ویراں ہے کہ اُسکو دیکھکر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق   ہے مکرر لبِ ساقی مین صلا میرے بعد

چوتھی خصوصیت

مثال ۱

مثال ۲

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ‏ ‏ ‏ ‏ پھر ترا وقت سفر یاد آیا" ‏ ‏ تمثیل

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گذری تھی اور جو اُسکے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اُسمیں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہوجاتا ہے اُسکو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے بلیغ شعر اُردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گذرتی ہے اِن دو مصرعوں میں اُسکی تصویر کھینچدی ہے جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہوسکتا۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ ‏ ‏ ‏ ‏ دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک ‏ ‏ تمثیل

جو مطلب اِس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اِس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے ‏ ‏ √ ‏ ‏ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے ‏ ‏ تمثیل

جو مطلب اِس طریقے سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمکو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں ‏ ‏ ‏ ‏ جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا ‏ ‏ تمثیل

دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا اُسوقت اُنکے دفع کرنے کی طاقت تھی۔

اِن اشعار میں جیسا کہ ظاہر ہے اصل خیالات سیدھے سادے ہیں، مگر استعارے اور تمثیل نے اُن میں ندرت اور طرفگی پیدا کردی ہے۔

بہت بچتے تھے مبتذل مضامین، مبتذل تشبیہیں، مبتذل محاورے، مبتذل ترکیبیں جس قدر
اُنکے کلام میں کم ملینگی ظاہراً کسی ریختہ گو شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں مثلاً صلِّ علی کا
لفظ جو بجائے سبحان اللہ وغیرہ کے استعمال ہوتا ہے اُسکو وہ کبھی جائز نہیں رکھتے تھے یہاں
تک کہ شاگردوں کی غزل میں بھی ہمیشہ اس لفظ کو کاٹ کر نام خدا یا کوئی اور لفظ بنا دیتے تھے
اسی طرح جو محاورے یا الفاظ صرف عوام الناس کی زبان پر جاری ہیں، اور خواص اُنکو
کبھی نہیں بولتے تا بمقدور وہ اُنکو استعمال نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ایسا التزام
کرنے سے زبان کا دائرہ نہایت تنگ ہوجاتا ہے اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہونا چاہئے وہ
فوت ہوجاتا ہے مگر مرزا کے کلام میں جو خصوصیتیں ہکو معلوم ہوئی ہیں اُن کا بیان کرنا ضرور ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے استعارہ و کنایہ و تمثیل کو۔ جو کہ لٹریچر کی جان اور
شاعری کا ایمان ہے، اور جسکی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے۔ ریختہ میں بھی نسبتہً
فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا۔ اور شعرا نے استعارے کو صرف محاورات اُردو میں بلاشبہہ
استعمال کیا ہے؛ لیکن استعارے کے قصد سے نہیں بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے
بلا قصد اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کیجاتی ہیں۔

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا　　بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہاں اِس مطلب کو۔ کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھادی تو اس سے کیا تسلی ہوسکتی
ہے۔ اِسطرح ادا کیا ہے "بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا"

---

* مرزا کہتے تھے کہ حرف جار بغیر مجرور کے بولنا ایک عامیانہ اور سوقیانہ بول چال ہے۔

[حاشیہ: دوسری خصوصیت] [حاشیہ: مثال]

بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغزِ سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقدِ وصال سے، استخوان کو خشت اور بدن کو قالبِ خشت سے، اور اسی قسم کی اور بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں اُنکے ابتدائی ریختہ میں پائی جاتی ہیں. لیکن جس قدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی اُسی قدر تشبیہوں میں - باوجود ندرت اور طرفگی کے - سنجیدگی اور لطافت بڑھتی گئی. مثلاً وہ کہتے ہیں.

مثال

مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیہاں ۔۔۔ ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام

یہاں سورج کو - اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزاے عالم میں سے ہے اور تمام اجزاے عالم آمادۂ زوال و فنا ہیں - چراغِ رہگذرِ باد سے تشبیہ دی ہے؛ جو بالکل نئی تشبیہ ہے.

مثال

دوسری جگہ سورج کو - اس لحاظ سے کہ حسنِ معشوق کے مقابلے میں اُسکو ناقص الخلقۃ قرار دیا ہے - ماہِ نخشب کے ساتھ تشبیہ دی ہے. چنانچہ کہتے ہیں.

خورشید ہنوز اُسکے برابر نہوا تھا ۔۔۔ چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے

مثال

ایک جگہ انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اُسکو غم سے نجات نہیں ہوتی - شمع سے تشبیہ دی ہے؛ کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے. جیسا کہ کہتے ہیں.

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک ۔۔۔ غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج

اس قسم کی بدیع و نادر تشبیہات سے مرزا کے دونو دیوان اردو اور فارسی بھرے ہوئے ہیں قطع نظر تشبیہات کے مرزا ہر ایک بات میں جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے ابتذال سے

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہونے سے　　　بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گذرا ہو مگر تمثیل نے اسکو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہل ہمت کا وجود ہوتا جو دنیا کو محض ناچیز سمجھکر اسکی طرف التفات نکرتے تو دنیا ویران ہو جاتی پس یہ جاننا چاہیے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں یعنی جسطرح میخانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہے اسی طرح عالم کا آباد و معمور ہونا دلالت کرتا ہے کہ اسمیں اہلِ ہمت معدوم ہیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جسکی امید　　　نا امیدی اُسکی دیکھا چاہیے

نا امیدی کی غایت اس سے بڑھکر اور ایسی خوبی سے شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یعنی جو گناہ ہمنے کئے ہیں اگر انکی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کر سکے اور انکی حسرت دل میں رہ گئی انکی داد بھی ملنی چاہیے۔

علاوہ جدتِ مضامین اور طرفگی خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں (اولاً عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً ریختہ گویوں کے کلام میں متداول ہیں مرزا جہاں تک ہو سکتا ہے ان تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے؛ بلکہ تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ایجاد کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے؛ بلکہ خیالات کی جدت ان کو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے) ان کے ابتدائی ریختہ میں جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں وہ اکثر غرابت سے خالی نہیں ہیں۔ مثلاً سانس کو موج سے،

بیٹھ رہتے، اور شوق وآرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں، اور اس لئے شوق وآرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔

وفاداری

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بتخانے میں کاٹ دے، اور وہیں مر رہے، تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسکو کعبے میں دفن کیا جائے، کیونکہ اُسنے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کردیا، اور یہی ایمان کی اصل ہے۔

تصوف

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

یعنی جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت اس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملے گی، پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیے تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں۔

تحسین کسی کے بیان کی تعریف

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُسنے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے حسنِ بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے مُنہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اُتر جائے کہ اُسکو یہ شبہہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔

ترجیح

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

جامِ جم پر جامِ سفال کو کس خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اُسکی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی اور بالکل نیا خیال ہے جو کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

سالک کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آئے اِسکو شہود کہتے ہیں۔ اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیتِ ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراء الورار ہے۔ کہتا ہے کہ جسکو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے۔ اور اُسکو غلطی سے شہود سمجھے ہیں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے؛ اور اِس سے بہتر اِس مضموں کے لئے مثال نہیں ہو سکتی۔

نظر لگے نہ کہیں اُسکے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

عشق حقیقی ہو یا مجازی اُسکے زخم کی گہرائی اِس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھپر کہ آساں ہو گئیں

یہ خیال بالکل اچھوتا ہے؛ اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے؛ اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اُس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ضد حقیقی یعنی اُنکے آسان ہو جانے سے کرنا درحقیقت حُسن مبالغہ کی معراج ہے۔ جس کی نظیر آجتک نہیں دیکھی گئی۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے　　دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے۔ اِس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لیجاؤ، اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونو صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہوتا۔ یعنی دشوار ہوتا۔ تو کچھ دقت نہ تھی؛ کیونکہ ہم مایوس ہو کر

شوخی

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد　　مجھسے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اسمیں بھی نئی طرح کی شوخی ہے۔ جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھسے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ؛ اور در پردہ الزام دیتا ہے؛ گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں؟ وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب اُنکو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تونے دنیا میں دیے ہیں، اور جو شمار میں اُسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، اُنکی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدم استطاعت کے اُسکو خاطر خواہ نکر سکا؛ کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہوا؛ اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی۔ بس جتنے گناہ کیئے ہیں اُتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔

بیکسی / غربت

مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور　　رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

پردیس میں مرنا۔ جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے۔ اُسپر خدا کا اس لیئے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں؛ کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا؛ لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو، مگر خبر گیر و غمخوار ایک بھی نہو، وہاں مُردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی؛ پس خدا کا شکر ہے کہ اُسنے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اِسمیں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہلِ وطن کی شکایت ہے۔ جسکو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔

تصوف

ہے غیبِ غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی، اگر دشمنی بھی ہوتی تو۔ اس لئے کہ اسمیں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے۔ ہم اُسی کو دوستی سمجھتے۔ لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاو ایسے دو لفظ بہم پہونچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں۔ اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چہار چند کر دیا ہے۔

فضیلت نوع انسانی

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر ۔۔۔ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

اِس شعر میں اِس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ "ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اُسکے متحمل نہوئے، اور ڈر گئے، اور انسان نے اُسکو اُٹھا لیا"، شاعر کہتا ہے کہ برقِ تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہ طور، کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھکر اُسکے موافق اُسکو شراب دی جاتی ہے؛ پس کوہ طور۔ جو منجملہ جمادات کے ہے۔ وہ کیونکر تجلی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال بھی مع اِس تمثیل کے جو اُسمیں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے۔

شوخی

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز ۔۔۔ دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

چونکہ خیال وسیع تھا، اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اِس لئے پہلا مصرع اُردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے، مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے۔ جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہو گی کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ آلٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کرینگے جو پہلے ہی دیجا چکی ہو۔

صرف اِس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے۔ اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اُسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھکو ہونے نے نہوتا میں تو کیا ہوتا

بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے۔ اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرع کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرع سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہوتا تو کیا بُرائی ہوتی، مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہوتا تو دیکھنا چاہیے کہ میں کیا چیز ہوتا، مطلب یہ کہ خدا ہوتا، کیونکہ پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہوتا تو خدا ہوتا۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے۔ اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اُسکو ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اُسکی فہم کا قصور ہے۔ دعوےٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اُسی کے موافق اُسکی تائید غیب سے ہوتی ہے۔ اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جسکو آنکھوں میں جگہ ملی ہے۔ اگر اُسکی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا۔ موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اُسکو۔ جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہوتا۔

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

لاگ دشمنی اور لگاؤ محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو، مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی اور لطافت سے ہرگز نہ بندھا ہوگا۔ مطلب

مجبور کیا تو اُن کو بھی آخر اُسی رُخ چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جارہا تھا اُسکے سوا ایک اور
لیک اسی کے متوازی اپنے لیئے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اُس چال کو چھوڑ کر
دوسری چال اختیار کی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور اُن کے مقلدین کے
کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکتا جاتا ہے اور اُسکے بعد
مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اُسمیں ہمکو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے ؛ اور جس
طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں، یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر، ایک بالکل
نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے ؛ اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا
ہے۔ یہاں اول ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں جن سے اُنکے خیالات
کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے

"بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

اخلاق

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے ؛ مگر غور سے دیکھا جاے تو بالکل اچھوتا خیال
ہے دعوے یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو
عین انسان ہے اُسکا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے ؛ بلکہ شاعرانہ
استدلال ہے۔ جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کرسکتا۔

"ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا"

فلسفۂ انسانی

نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں۔ نشاطِ کار یعنی کام کرنے کی اُمنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے
ایک نیا خیال ہے ؛ اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے ؛ کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ

جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے اُس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے۔ البتہ ہمکو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لئے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑیگا۔ جسکو امید ہے کہ اہل انصاف تسلیم کرینگے۔

میر و سودا اور اُنکے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے۔ کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اولاً فارسی اور اُسکے بعد اُردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں وہی مضامین بہ تبدیلِ الفاظ اور بتغیرِ اسالیب بیان عامۂ اہلِ زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کئے جائیں۔ چنانچہ میر سے لیکر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہلِ زبان میں گذرے ہیں اُنکی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ اُنکی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لیجائے۔

برخلاف اسکے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ اُنکی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جنکو اور شعرا کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا۔ اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کئے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہے؛ اور اُن میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے اوّل سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سرمو انحراف نہیں کیا؛ اور جس چال سے کہ اگلوں نے راہ طے کی تھی اُسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اول شاہراہ کا رُخ چھوڑ کر دوسرے رُخ چلنا اختیار کیا؛ اور جب راہ کی مشکلات نے

مگر چونکہ مرزا کے معاصرین اکثر نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے اس لئے وہ ریختہ کے سرانجام کرنے میں بھی اپنی پوری توجہ اور ہمت صرف کرتے تھے اور دونو زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر رکھتے تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر اور اُسکے کلام کے رتبہ کا اندازہ اُسکے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا، بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اُسکے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ میر کی قدر لوگ اس لئے نہیں کرتے کہ اُسنے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں؛ بلکہ صرف اُسکے منتخب اشعار نے۔ جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں۔ اُسکو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے۔ لطف علیخاں آذر آتشکدہ میں نوری صفاہانی کی نسبت لکھتا ہے کہ اُسکے دیوان کا مختصر ہونا بھی اُسکے کلام کی خوبی اور حسنِ طبع کی کافی دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعرا کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا؛ ورنہ فردوسی و نظامی دونو مثنوی میں، اور انوری و خاقانی دونو قصیدے میں، مسلّم الثبوت نہیں ٹھہر سکتے۔ کیونکہ انوری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی باعتبار سادگی اور صفائی و عام فہم ہونے کے خاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے؛ حالانکہ چاروں شخص فارسی شاعری کے رُکنِ رکین مانے جاتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ جدا جدا کلام جدا جدا معیاروں سے جانچے جائیں۔ مرزا کے اردو کلام میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات۔ گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں۔ لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں۔ اور

بہت زیادہ کام لیا گیا تھا اور اس لئے اُسمیں ایک غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہو گئی تھی۔ جب قوتِ ممیزہ نے اُسکی باگ اپنے قبضے میں لی تو اُسنے وہ جوہر نکالے جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھے۔

یہاں یہ امر جتا دینا ضرور ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا؛ بلکہ محض تفننِ طبع کے طور پر کبھی اپنے دل کی اُمنگ سے، کبھی دوستوں کی فرمایش سے، اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لئے، ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنکے اُردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف ایقدر معتد بہ نہیں پائی جاتی۔ وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں "بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو؛ اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہیکو ہیں؛ پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجکو ناز ہے کوئی اُنکا لطف نہیں اُٹھاتا۔ اب قدردانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرتِ ظلِ سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے۔ یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل لکھکر لیجاتا ہوں"

قطع نظر اسکے وہ اُس زمانے کے خیالات کے موافق اُردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے؛ بلکہ اُسی میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعہ میں جسکی نسبت مشہور ہے کہ اُسمیں شیخ ابراہیم ذوق کی طرف خطاب ہے۔ کہتے ہیں

"فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من ست"

"راست میگویم من و از راست سر نتوان کشید — ہر چہ در گفتار فخرِ تست آن ننگِ من ست"

مرزا کو اس شعر کا اپنی طرف منسوب ہونا غالباً اسلیئے ناگوار گذرا ہو گا کہ مرے شیر اور رحمت خدا کی یہ دونو محاورے زیادہ تر عامیوں اور سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں؛ اور اسد کی رعایت سے مرے شیر کہنا یہ بھی آنکی طبیعت کے خلاف تھا؛ کیونکہ وہ ایسی مبتذل رعایتوں کو جو ہر شخص کو بآسانی سوجھ جائیں۔ مبتذل جانتے تھے۔

اس قسم کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعری میں بلکہ وضع میں، لباس میں، طعام میں، طریق ماندوبود میں، یہاں تک کہ مرنے اور جینے میں بھی عام طریقے پر چلنا پسند نکرتے تھے۔ یہاں ایک لطیفہ قابل لکھنے کے ہے۔

لطیفہ

مرنے سے آٹھ سات برس پہلے اُنھوں نے ایک مادۂ تاریخ اپنی وفات کا نکالا تھا۔ جس میں ۱۲۷۷ھ نکلتے تھے۔ اتفاق سے اُسی سال شہر میں وبا آئی؛ مگر مرزا بچ گئے۔ اِس امر کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "درمیاں ۱۲۷۷ھ (ظم ہو) بات غلط نہ تھی (یعنی اسی سنہ میں مجھے مرنا چاہئے تھا) مگر میں نے وباے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا؛ واقعی اسمیں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفعِ فساد ہوا کے سمجھ لیا جاویگا" اگرچہ یہ ایک ہنسی کی بات لکھی ہے؛ مگر آنکی طبیعت کا اقتضا اِس سے صاف جھلکتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب جسکو یہ خط لکھا ہے وہ اُنکی اِس خصلت سے خوب واقف ہے۔

شعر گوئی

بہر حال مرزا ایک مدّت کے بعد اپنی بیراہ روی سے خبردار ہوئے۔ اور استقامتِ طبع اور سلامتیِ ذہن نے اُنکو راہِ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا۔ گو اُن کا ابتدائی کلام جسکو وہ حد سے زیادہ جگر کاوی اور دماغ سوزی سے سرانجام کرتے تھے مقبول نہوا؛ مگر۔ چونکہ قوتِ متخیلہ سے

نہ کریں، اور اُنکے نقشِ قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے بلکہ دوسرے رستے پر چلنا اُنکی قدرت سے باہر ہوتا ہے۔

برخلاف اِسکے جنکی طبیعت میں اُرِجنیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا مادّہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر اُنکو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ اُنکو قدم کی شاہ راہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھُلی نظر آتی ہیں۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں اُسپر چلنے سے اُنکی طبیعت اِبا کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں وہ منزلِ مقصود تک پہنچانے والا نہو، مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہو جائیں عام رہگیروں کی طرح آنکھیں بند کرکے شارعِ عام پر پڑ جائیں۔

مرزا کی طبیعت اِسی قسم کی واقع ہوئی تھی وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے۔ وہ جنست شرکاکے سبب خود شاعرانہ نفرت ظاہر کرتے تھے۔ عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہوسکتا تھا اجتناب کرتے تھے۔

ایک صاحب نے جو غالباً بنارس یا لکھنؤ سے دلّی میں آئے تھے مرزا کے ایک شعر کی اُنکے سامنے نہایت تعریف کی۔ مرزا نے کہا ارشاد تو ہو وہ کونسا شعر ہے؟ اُنھوں نے میر امانی متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا

"اسد اِس جفا پر بتوں سے وفا کی ‌ ‌ ‌ مرے شیر شاباش رحمت خدا کی"

چونکہ شعر میں اسد تخلص واقع ہوا تھا اُنھوں نے یہ سمجھا کہ مرزا غالب کا شعر ہے۔ مرزا یہ سنکر بہت جزبز ہوے اور فرمایا اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اُسکو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی۔

جو نہ اُن سے پہلے اُردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں۔ مثلاً اُنکے موجودہ اُردو دیوان میں ایک شعر ہے
"قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے"
میں نے خود اِس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے فرمایا کہ اے کی جگہ جُز پڑھو، معنی خود سمجھ میں آجائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری - جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ - اور بلبل - جو ایک قفسِ عنصری سے زیادہ نہیں - اُنکے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف اُنکے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اے کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہرا یہ اُنھیں کا اختراع ہے ایک شخص نے یہ معنی سُنکر کہا کہ "اگر وہ اے کی جگہ جُز کا لفظ رکھدیتے یا دوسرا مصرعہ اِسطرح کہتے" اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے"، تو مطلب صاف ہو جاتا" اُس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تا بمقدور بچتے تھے اور شارعِ عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اِس لئے وہ بہ نسبت اِسکے کہ شعر عام فہم ہو جائے اِس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرزِ خیال اور طرزِ بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے۔

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اُسکو اُردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اِسمیں شک نہیں کہ اِس سے اُنکی اُرجنیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا خاطر خواہ سُراغ ملتا ہے اور یہی اُنکی ٹیڑھی ترچھی چالیں اُنکی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پک ڈنڈی پر اگلی بھیڑ و ل کا گلہ چلا جاتا ہے اُسی پر آنکھیں بند کرکے گلّے کے پیچھے پیچھے ہولیں، اور لیک کے ادھر اُدھر آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اُسمیں اگلوں کی چال ڈھال سے سرِمو تجاوز

خاموشی ہی کا فائدہ دیتا ہے ؛ کیونکہ میرا کلام کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

چونکہ مرزا کی طبیعت فطرتاً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی اس لئے نکتہ چینوں کی تعریضوں سے انکو بہت تنبہ ہوتا تھا ؛ اور آہستہ آہستہ ان کی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی۔ اسکے سوا جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا انکو اپنا خالص مخلص دوست اور تمیزدار سمجھنے لگے تو انھوں نے اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی ؛ یہاں تک کہ انھیں کی تحریک سے انھوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا ؛ اور اسکے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔

مرزا نے ریختہ میں جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبول خاص و عام نہیں ہو سکتی تھی۔ لوگ عموماً میر، سودا، میر حسن، جرأت اور انشا وغیرہ کا سیدھا سادہ اور صاف کلام سننے کے عادی تھے۔ جو محاورے روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے انھیں کو جب اہل زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو انکو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی کہ ادھر قائل کے منھ سے نکلا اور ادھر سامع کے دل میں اتر گیا ؛ مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی۔ جیسے خیالات اجنبی تھے ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی۔ فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروف ربط اور توابع فعل - جوکہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں - انکو مرزا اردو میں عموماً استعمال کرتے تھے۔ اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر ان میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے۔ بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے

ہیں۔ جہاں مرزا بھی ہوتے تھے۔ تعریضاً ایسی غزلیں لکھکر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پُرشوکت وشاندار معلوم ہوتی تھیں ؛ مگر معنی ندارد ؛ گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔

ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رام پوری نے۔ جو نہایت ظریف الطبع تھے۔ اور جنکو چند روز قلعۂ دہلی سے تعلق رہا تھا۔ مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اُردو شعر سمجھ میں نہیں آتا ؛ اور اُسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے

"پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال"

مرزا سُنکر سخت حیران ہوے ؛ اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہِ مزاح کے کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے ؛ اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھپر اِس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں ؛ اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمھارے دیوان میں اِس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

مرزا نے اِس قسم کی نکتہ چینیوں پر اُردو اور فارسی دیواں میں جا بجا اشارہ کیا ہے۔ اُردو میں ایک جگہ کہتے ہیں

"نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مِرے اشعار میں معنی نہ سہی"

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے

"گر خامشی سے فائدہ اخفای حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے"

یعنی اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حال دل ظاہر نہیں ہوتا تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی

اُن کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سے اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن پر اُردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے۔ جیسے ذیل کے اشعار جو اب دیوان میں موجود ہیں۔

۱ شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

۲ ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

۳ لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

۴ شبِ خمارِ چشمِ ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

۵ یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا — جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

اِن اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی مگر اسمیں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کئے ہونگے۔ جب کہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دُکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دُکھا ہوگا؟ ظاہرا یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار۔ جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے۔ اُنکے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اُٹھ سکا ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار اُنکی نظر میں کھٹکے ہوں؛ مگر چونکہ دیوان چھپکر شائع ہو چکا تھا اِس لئے اُنھوں نے اِن اشعار کا نکالنا فضول سمجھا۔

مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی میر تقی نے کی تھی اُسکی دونوں شقیں اُنکے حق میں پوری ہوئیں؛ ظاہر ہے کہ مرزا اوّل اوّل ایسے رستے پر پڑ لئے تھے کہ اگر استقامتِ طبع، اور سلامتِ ذہن، اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک، اور نکتہ چین ہمعصروں کی خُردہ گیری اور طعن و تعریض؛ سدِّ راہ نہوتی تو وہ شدہ شدہ منزلِ مقصود سے بہت دُور جا پڑتے۔ سُنا گیا ہے کہ اہلِ دہلی مشاعروں

(۲) اسد ہر اشک ہے اک حلقہ بر زنجیر افزودن | بہ بندِ گریہ ہے نقش برآب امید رستن ہا
(۳) بحسرت گاہِ نازِ کشتۂ جاں بخشیِ خوباں | خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا
(۴) رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ | اشارت فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا
(۵) پریشانی سے مغزِ سر ہوا ہے پنبۂ بالش | خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا
(۶) موسمِ گل میں مے گلگوں حلالِ میکشاں | عقدِ وصلِ دخترِ رز انگور کا ہر دانہ تھا
(۷) ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا | گوئیا صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

چونکہ مذکورۂ بالا شعروں میں۔ قطع نظر اسکے کہ طرزِ بیان اردو بول چال کے خلاف ہے۔ خیالات میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم ہوتی ؛ اس لئے ان کے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف چوتھے شعر کی جو کسی قدر آسان ہے یہاں بطورِ نمونے کے شرح کیجاتی ہے ؛ تاکہ معلوم ہو کہ مرزا نے مشقِ سخن کس قسم کے خیالات سے شروع کی تھی اور کس قدر کاوش سے وہ یہ نئی قسم کے مضمون پیدا کرتے تھے۔

کہتا ہے کہ فنا میں جو لذت اور ذوق تھا ہماری غفلت نے اس سے ہمیشہ دور دور رکھا۔ اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو اشارت فہم کے لئے ہر ایک ناخن۔ جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ ابرو کا کام دیتا تھا۔ ابرو کا کام ہے اشارہ دیا کرنا ؛ اور ناخنِ بریدہ جو ابرو کی شکل ہوتا ہے وہ بھی فنا کی لذت کی طرف اشارہ کرتا تھا ؛ کیونکہ ناخن کے کٹنے سے جو ایک قسم کی فنا ہے لذت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

یہ اوپر کی سات بیتیں ہمنے مرزا کے ان نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی ہیں جو انھوں نے اپنے دیوانِ ریختہ کو انتخاب کرتے وقت انمیں سے نکال ڈالی تھیں۔ مگر اب بھی

کہنا شروع کیا تھا۔ قطع نظر اِسکے کہ اُس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے۔ اُس روش کا انداز ہ اِس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ میر[†] تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے اُنکے لڑکپن کے اشعار سُنکر یہ کہا تھا کہ "اگر اِس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُسنے اِسکو سیدھے رستے پر ڈالدیا تو لاجواب شاعر بنجائیگا؛ ورنہ مہمل بکنے لگے گا"

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ۔ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب۔ فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کے بول چال اور اُنکی قوتِ تخیلہ پر چڑھگیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتدا میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اُسی روش پر مرزا نے اُردو میں چلنا اختیار کیا تھا جیساکہ وہ خود فرماتے ہیں

"طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا — اسد اللہ خاں قیامت ہے"۔

یہاں بطور نمونہ کے مرزا کے ابتدائی کلام میں سے چند اشعار لکھے جاتے ہیں:

(۱) کرے[*] گر فکرِ تعمیرِ خرابیہائے دل گردوں — نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالبہا۔

[†] مرزا کی ولادت ۱۲۱۲ھ میں ہوئی ہے اور میر کی وفات ۱۲۲۵ھ میں واقع ہوئی اِس سے ظاہر ہے کہ مرزا کی عمر میر کی وفات کے وقت تیرہ ۱۳ چودہ ۱۴ برس کی تھی۔ مرزا کے اشعار اُنکے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم والد ناظر حسین مرزا صاحب نے میر تقی کو دکھائے تھے ۱۲

[*] یہ شعر مرزا نے اپنے دیوانِ ریختہ میں سے تو نکال ڈالا مگر دیوانِ فارسی میں بتغیرِ الفاظ داخل کر دیا یعنی اِس طرح "کند گر فکرِ تعمیرِ خرابیہائے ما گردوں ؛ نیاید خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالب ہا"

پرورش پائی تھی بہت آسودہ حال تھی اور ننھیال کی ثروت سے ظاہرا مرزا اور اُنکے بھائی سے بڑھکر کوئی فائدہ اُٹھانے والا نہ تھا۔ آغازِ شباب میں جبکہ سر پر کوئی مربی ہو۔ دولت و آسودگی سے زیادہ کوئی چیز خانہ برانداز نہیں ہوسکتی۔ مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اُس آسودگی نے وہ کام کیا جو آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے۔ جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گذری ہے اُسکی کیفیت کا خود اُنھیں کے الفاظ سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ وہ ایک جگہ اپنی جوانی کی حالت اِس طرح ظاہر کرتے ہیں "با فرو فرہنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن، با فرومایگاں ہمنشیں، و با اوباش ہمرنگ، پاے بیراہہ پوے، و زباں بے ہرزہ گوے، و شکستِ خویش گروں را دستیار، و در آزارِ خویش دشمن را آموزگار" اِسکے بعد لکھتے ہیں "تیزی رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد" الغرض مرزا کا لڑکپن اور اُنکی جوانی ایسی حالت میں بسر ہوئی تھی کہ ایک ایسے فن میں جسکا نہ کوئی قدرداں نظر آتا تھا اور نہ کوئی خریدار دکھائی دیتا تھا، اعلےٰ درجے کا کمال بہم پہونچانا تو درکنار؛ اُس کا خیال بھی دل میں گذرنا قریب ناممکن کے تھا۔ پس یہ صرف اُنکی طبیعی مناسبت اور فطری قابلیت کا اقتضا تھا کہ اُس غفلت و بدمستی کے عالم میں بھی شعر کا کھٹکا برابر لگا رہا اور شاعری کی تکمیل کا خیال ایسی بےخبری کے زمانے میں بھی فراموش نہیں ہوا۔

مرزا نے گلِ رعنا[1] کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اول اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا اس لئے ہم بھی پہلے اُنکے اُردو دیوان کا ذکر کرتے ہیں جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اُردو شعر

[1] مرزا نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج احمد کی فرمایش سے اپنے تمام اُردو اور فارسی دیوان کا انتخاب کیا تھا جس کا دیباچہ اُنکے کلیات نثر فارسی میں موجود ہے اُسکا نام گلِ رعنا رکھا تھا۔

دفع غم نیست جز بغم خوردن چارہ کار نیست جز کردن

مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ اُنکی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملکہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے۔ جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمہ میں تصریح کی ہے۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل کے موزوں کئے تھے؛ جنکی ردیف میں کہ چہ بجائے یعنی چہ کے استعمال کیا تھا۔ جب اُنھوں نے وہ اشعار اپنے اُستاد شیخ معظم کو سُنائے تو اُنھوں نے کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے، ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مرزا یہ سُنکر خاموش ہو رہے۔ ایک روز مُلّا ظہوری کے کلام میں ایک شعر اُنکی نظر پڑ گیا جسکے آخر میں لفظ کہ چہ یعنی چہ کے معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لے کر دوڑے ہوئے اُستاد پاس گئے اور وہ شعر دکھایا شیخ معظم اُسکو دیکھکر حیران ہو گئے؛ اور مرزا سے کہا تمکو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے؛ تم ضرور فکر شعر کیا کرو؛ اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروا نہ کرو۔

مرزا کو جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے باپ نے پانچ برس کی اور چچا نے نو برس کی عمر میں چھوڑا تھا۔ چچا کے بعد کوئی مربّی و سرپرست اُنکے سر پر نہ رہا تھا۔ مرزا کی ننھیال جہاں اُنھوں نے

ــــــــــــــــــــ

[1] منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنہیا لال ایک صاحب آگرہ کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہمعمر تھے ایکبار دلّی میں آئے اور جب مرزا صاحب سے ملے تو اثنائے کلام میں اُنکو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی وہ بھی آپکو یاد ہے؟ اُنھوں نے انکار کیا لالہ صاحب نے کہا وہ اُردو مثنوی میرے پاس موجود ہے چنانچہ اُنھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لا کر دی اور وہ اُسکو دیکھکر بہت خوش ہوئے اُسکے آخر میں یہ فارسی شعر کسی اُستاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا۔ "رشتہ در گردنم افگندہ دوست ؎ مے کشد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست،، لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جبکہ یہ مثنوی لکھی تھی آٹھ نو برس کی تھی ۱۲

دوسرا حصہ

مرزا کے کلام پر ریویو اور اُسکا انتخاب

مرزا کے کلام پر ریویو کرنا، اور اُسکی حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی - ایک ایسے زمانے میں جبکہ فارسی زبان ہندوستان میں بمنزلہ مُردہ زبان کے ہوگئی ہے اور ذوقِ شعر روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے - ایک نہایت مشکل کام ہے مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گراں قدر ہے وہ اُنکی فارسی نظم و نثر ہے۔ لیکن اوّل تو فارسی زبان سے مُلک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے؛ دوسرے مرزا کے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل ناآشنا ہیں۔ پس جو شخص اِس زمانے میں اُن کے کلام پر ریویو کرنا، اور اُسکے ذریعے سے مصنّف کی حقیقت اور اُسکا رتبہ پبلک پر ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ درحقیقت ایک ایسے کام کے درپے ہے جسمیں کامیابی کی بہت ہی کم امید ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر کچھ امید ہے تو اُسی صورت میں ہے کہ کچھ کیا جاوے؛ نہ یہ کہ کام کی مشکلات پر نظر کرکے اُس سے ہاتھ اُٹھا لیا جاوے۔

سخن سرائے نوائیں نوائے را نازم | بنالہ ہمنفسِ من بہ شور ہمسرِ من
بہ نکتہ شیوۂ شاگردِ من بہ من ماناست | صنم بصورتِ خود مے تراشد آزرِ من
اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم | بود بپایہ ارسطوے من سکندرِ من
زمینِ کوے مرا آسماں کند ہر صبح | طلوعِ نیّرِ رویش ز طرفِ منظرِ من
اگر شوم بہ مثلِ آتشے شرارہ فشاں | شود بقاعدۂ ہمدمی سمندرِ من
بہ بحر گر فتدم رہ۔ بود سفینۂ من | بہ تخت گر بودم رای۔ گردد افسرِ من
بہ مہرِ دوست دہم دل۔ نشاطِ خاطرِ من | بہ کینِ خصم نہم رخ لوائے لشکرِ من
گرم زغصہ تبہ گشتہ کار۔ مونسِ من | ورم ز کار فرو ماندہ دست۔ یاورِ من
زہے ز روے تو پیدا فروغِ دانش و داد | بدیں فروغ۔ جہانتاب گشتہ اخترِ من
ز تو کہ آئنۂ فیضِ صحبتِ اُوئی | ہوائے دیدنِ غالب فتادہ در سرِ من
مرا ستودی[1] و گفتی کہ من ازانِ توام | فدائے آنِ تو بادا اقل و اکثرِ من
سعادت و شرف چون منے بعرضِ کمال | نہ بس بود کہ بود چوں توئے شاگرِ من؟

نواب محمد مصطفےٰ خاں مرحوم جو فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اگرچہ مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ جب تک مومن خاں مرحوم زندہ رہے اُنھیں سے مشورۂ سخن کرتے رہے لیکن خانِ موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونو زبانوں میں وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہو تو مرزا کے بعد اُنکے معاصرین میں سے

نواب محمد مصطفےٰ خاں

[1] معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے مرزا کی مدح میں کوئی قصیدہ لکھا تھا جسکی طرف اِن دونو بیتوں میں اشارہ ہے ۱۲

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید
مرگیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

لطیفہ

یہ دونو صاحب باہم گر نہایت گہری دوستی رکھتے تھے ؛ یہاں تک کہ اُنکی دوستی عشق کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ ایک دفعہ جبکہ راقم بھی جہانگیر آباد میں موجود تھا سید غلام علی خاں مرحوم نوابصاحب سے ملنے کو آئے ہوئے تھے اور مرزا صاحب نے بھی اُن کا یہاں آنا سن لیا تھا۔ اُنھیں دنوں میں مرزا کا خط نواب صاحب کے نام آیا۔ اُسمیں خاں صاحب کو بھی سلام لکھا تھا اور اخیر میں خواجہ حافظ کے مشہور شعر کا پہلا مصرع اِسطرح بدل کر لکھا تھا

"چو با حبیب نشینی و جام پیمائی
بیاد آر حریفان بادہ پیما را"

ایک عزیز نے یہ لطیفہ سُنکر کہا کہ خواجہ حافظ کے اصل شعر میں اِس قدر لطف نہ تھا جیسا کہ اِس موقع پر مرزا صاحب کے اِس تصرف سے اُسمیں لطف† پیدا ہوگیا۔

مرزا صاحب کے اُن شاگردوں کا حال جنکے نام کے بہت سے خطوط اُردوے معلّی اور عودِ ہندی میں مرزا کے لکھے ہوئے موجود ہیں یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں؛ اِس لئے ہم صرف دو صاحبوں کا مختصر ذکر اِس مقام پر لکھتے ہیں ایک نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم اور دوسرے نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کہ غالباً اِن دونو بزرگوں میں سے کسی کے نام کا کوئی خط مرزا کے اُردو مکاتبات میں نہیں ہے جن سے اُن کی خصوصیت مرزا صاحب کے ساتھ خاص و عام کو معلوم ہو

نواب ضیاء الدین احمد خاں

نواب ضیاء الدین احمد خاں۔ جو فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ قطع نظر کمال شاعری و انشا پردازی کے تاریخ، جغرافیہ، علم انساب، علم اسماے رجال تحقیق لغات

† یعنی نوابصاحب چونکہ شراب سے مجتنب تھے اور مرزا پیتے تھے اس لئے اُنکی نسبت جام پیمائی اور اپنی نسبت بادہ پیما کا لفظ کہا ۱۲

یہ دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا۔ جو شخص اصلاح کے لئے اُنکے پاس غزل بھیجتا تھا ممکن نہ تھا کہ وہ اُسکے خط کا جواب اور اُسکی غزل میں اصلاح دیکر نہ بھیجیں۔ اگرچہ مرزا کی فطرت شاعری میں اپنے طبقے کے لوگوں سے اِس قدر بلند واقع ہوئی تھی کہ وہ کسی شاگرد یا مستفید کو اپنے ساتھ ساتھ نہیں لے چل سکتے تھے۔ جیسا کہ اُنھوں نے خود ایک فارسی شعر میں اِس مضمون کیطرف اشارہ کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں

سایہ ہمچون دود بالا میرود از بالِ ما　　ما ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجوے

با اینہمہ اہلِ دہلی و نواحِ دہلی میں چند اصحاب جو مرزا کے فیضِ صحبت اور مشورۂ سخن سے زیادہ مستفید ہوئے تھے اُنکے ارشد تلامذہ سمجھے جاتے تھے؛ جیسے نیر رخشاں، عارف، سالک، مجروح، علائی، تفتہ وغیرہم۔ اِنکے سوا خاص اہلِ دہلی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو عُرفاً مرزا کے شاگرد نہیں سمجھے جاتے تھے لیکن درحقیقت اُنکے شاگرد معنوی تھے؛ جیسے نواب مصطفٰے خاں مرحوم جنھوں نے مومن خاں مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام فارسی ہو یا اُردو مرزا ہی کو دکھایا۔ یا جیسے سید غلام علیخاں[۱] مرحوم متخلص بہ وحشت جو مرزا کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد اور اُنکی صحبت سے مستفیض رہے تھے۔ مرزا نے اِنھیں دونو صاحبوں کی طرف اپنی ایک اُردو غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے اور کہا ہے

---

[۱] یہ صاحب دلی کے ممتاز لوگوں میں تھے اُنکے والد کا نام سید فرحت اللہ خاں تھا اور مولانا رشید الدین خاں مرحوم کے داماد تھے قطع نظر علم و فضل کے اُردو اور فارسی دونو زبانوں میں نہایت خوش بیان اور شعر کا مذاق اعلےٰ درجے کا رکھتے تھے اول سرکار انگریزی میں ملازم رہے پھر الور میں فوجدار ہو گئے پھر لکھنؤ میں نواب سعید الدولہ مرحوم نائب وزیر کے توسط سے کہ اُن سے قرابتِ قریبہ رکھتے تھے ایک معزز خدمت پر ممتاز ہو گئے وہاں سے پھر الور چلے آئے تھے اور غدر تک وہیں رہے غدر کے بعد اخیر عمر تک سررشتہ تعلیم میں منسلک رہے اور نواب مصطفٰے خاں مرحوم اُنکی ہر حال میں مدد کرتے رہے ۱۲

پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا دوسرا مصرع یہ تھا "ذکرو ہجر مدارا ابن سر تو سلامت"، مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر ورد زباں رہتا تھا "دم واپسیں بر سر راہ ہے * عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے"

وفات

آخر۔ ذیقعدہ ۱۲۸۵ہجری کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی، اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہٗ میں اپنے خسر کے پائین قبر دفن کئے گئے۔ اُنکی وفات کی تاریخیں جو مدت تک ہندوستان کے اُردو اخباروں میں چھپتی رہیں وگنتی اور شمار سے باہر ہیں، صرف ایک تاریخ جسمیں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا۔ یاد رکھنے کے قابل ہے (یعنی آہ غالب بمرد) ۱۲۸۵ جسکو مختلف لوگوں نے مختلف طور پر قطعات میں منتظم کیا تھا۔ تاریخوں کے علاوہ مرزا قربان علی بیگ سالک، میر مہدی حسین مجروح، اور مؤلف کتاب ہٰذا نے اُردو میں اور منشی ہرگوپال تفتہ نے فارسی میں، مرزا کے مرثیے بھی لکھے تھے۔ جو اُسی زمانہ میں چھپکر شائع ہو گئے تھے۔

جنازے کی نماز

مرزا کے جنازے پر جب کہ دلی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی۔ راقم بھی موجود تھا، اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب محمد مصطفٰے خاں، حکیم احسن اللہ خاں وغیرہم، اور سب سے اہل سنت اور امامیہ دونو فرقوں کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان نبیرہ بخشی محمود خاں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ۔ مرزا صاحب شیعہ تھے، ہمکو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے موافق اُنکی تجہیز و تکفین کریں۔ مگر نواب صاحب نے نہیں مانا، اور تمام مراسم اہل سنت کے موافق ادا کئے گئے، اسمیں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ اُنکے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا تھا، مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ اور سنی دونو ملکر یا علیحدہ علیحدہ اُنکے جنازے کی نماز پڑھتے اور جسطرح زندگی میں اُنکا برتاؤ سنی اور شیعہ دونو کے ساتھ یکساں رہا تھا اسیطرح مرنیکے بعد بھی دونو فرقے اُنکی حق گزاری میں شریک ہوتے۔

شاگرد اور قدر دان

مرزا صاحب کے شاگرد اطراف ہندوستان میں بیشمار تھے۔ اُنکی وسعت اخلاق اور عام رضا جوئی نے

کہ اُسکے ننھے ننھے بچے ہیں ؛ اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے ؟ اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو ؟ مرزا اُسکے جواب میں لکھتے ہیں ،، امراؤ سنگھ کے حال پر اُسکے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے ۔ اللہ اللہ !!! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار اُنکی بیڑیاں کٹ چکی ہیں ، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے ، نہ دم ہی نکلتا ہے ۔ اُسکو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لونگا ؛ تو کیوں بلا میں پھنستا ہے ،، وہ ہمیشہ تعلقاتِ خانگی کو جِدًا یا ہزلًا ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے ۔

جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا ۔ طوطا سردی کے سبب پروں میں مُنھ چھپائے بیٹھا تھا ۔ مرزا نے دیکھکر کہا ،، میاں مٹھو ! نہ تمھارے جورو نہ بچے ، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے بیٹھے ہو ؟

ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے ۔ ایک مکان آپ خود دیکھکر آئے ؛ اُسکا دیوانخانہ تو پسند آگیا ، مگر محلسرا خود نہ دیکھ سکے ۔ گھر پر آکر اُسکے دیکھنے کے لئے بی بی کو بھیجا ۔ وہ دیکھکر آئیں تو اُن سے پسند ناپسند کا حال پوچھا ۔ اُنھوں نے کہا اِسمیں تو لوگ بلا بتاتے ہیں ۔ مرزا نے کہا کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھکر کوئی بلا ہے ؟

یہاں مرزا کا ایک قطعہ اور ایک رباعی مقتضائے مقام کے موافق لکھی جاتی ہے

گیرکہ در روزِ حشر چوں تو بہشتی	بر سرِ دوزخ نہند تیرہ نہنبن
لیک نباشد دراں مضیقِ مصیبت	در طلبِ نان و جامہ کشمکش از زن
لیک نباشد دراں مقامِ صعوبت	شورِ تقاضائے ناروائے مہاجن
اے آں کہ براہِ کعبہ روئے داری	دانم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زیں گونہ کہ تندی خرامی ۔ دانم	در خانہ زنے ستیزہ خوئے داری

مرزا اپنی شوخیِ طبع کے ہاتھ سے مجبور تھے ، اور کسی موقع پر خوش طبعی کرنے سے نہ چوکتے تھے ۔

ناچار زراہِ حق گذاری　　تا کردہ شود تلافیٔ آں

من نیز طلب کنم برایش　　ایں خواہش اگرچہ نیست آساں

آئینہ و تاج از سکندر　　انگشتر و تخت از سلیماں

از عالمِ غیب جامِ جمشید　　از چشمۂ خضر آبِ حیواں

عمرِ ابد و نشاطِ جاوید　　نیروے دل و ثباتِ ایماں

توفیقِ جوابِ نامۂ خویش　　توقیعِ عطا و بذلِ احساں

خانگی تعلقات

مرزا کی بی بی - جو الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں - وہ نہایت متقی پرہیزگار اور نماز روزہ کی سخت پابند تھیں۔ جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالات تھے اُسی قدر اُن کی بی بی احکامِ مذہبی کی پابند تھیں؛ یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور شوہر کے الگ رہتے تھے۔ بایں ہمہ بی بی شوہر کی خدمتگذاری اور خبر گیری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھیں مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے مگر اُنکے کھانے اور دوا ٹھنڈائی اور جڑاول وغیرہ کا انتظام سب گھر میں سے ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقتِ معین پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے۔ اور بی بی اور اُن کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے تھے، اور اپنی بساط سے بڑھکر اُن کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت اُنکی گھٹی میں پڑی تھی اُنکی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جنکو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔

لطیفہ

کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا، اور اسمیں یہ بھی لکھا

این ہر دو رسید و نیست پیدا — زاں سو اثرے بہیچ عنواں

رنجید مگر ز مدح نوّاب — اے کاشکش نہ گشتمے ثناخواں

ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم — از گفتۂ خویشتن پشیماں

عقلم بجواب گفت "غالب! — زنہار مخور فریبِ شیطاں

نوّاب لفٹنکِ ارمغان است — تا نامہ فرستدت پاماں

و انہا کہ بخاطرش گذشتہ است — زود آں ہمہ جمع کرد نتواں

زود است کہ جمع نیز گردد — دیر است کہ دادہ است فرماں

تا راہ روانِ بحر و بر گرد — آرند بکوششِ فراواں

دیبا ز دمشق و مخمل از روم — الماس ز معدنِ وزراز کاں

نیل از دکن و زمرّد از کوہ — توسن ز عراق و دُرّ ز عمّاں

فیروزۂ نغز از نشاپور — یا قوتِ گزیدہ از بدخشاں

جمّازۂ تیز رو ز بغداد — شمشیرِ بُرندہ از صفاہاں

پشمینۂ قیمتی ز کشمیر — زربفتِ گراں بہا ز ایراں

بالجملہ درنگ چوں ازیں روست — بر رنج و ملال نیست برہاں

چوں پیرِ خرد بدلفریبی — گفت ایں ہمہ رازہائے پنہاں

گشتم بدمِ امیدواری — مرہم بہ زخمِ یاس و حرماں

گفتم کہ چو با من ایں کرم کرد — آں قبلہ و قبلہ گاہِ اعیاں

بھیجا تھا، اور اُسکے ساتھ عرضداشت بھی گذرانی تھی، پھر کیا سبب ہے کہ جواب عنایت نہیں ہوا؟ کیا نواب مجھسے آزردہ ہوگیا؟ اگر یہ بات ہے تو میں نے ناحق تعریف لکھی۔ خدا جانے میں نے کیا لکھدیا ہوگا جس پر نواب کو آزردگی ہوئی۔ عقل نے کہا تو کیوں گھبراتا ہے؟ نواب جس ساز و ساماں کے ساتھ صلہ بھیجنا چاہتا ہے وہ جلدی فراہم نہیں ہوسکتا۔ اُسنے بہت دن سے حکم دے رکھا ہے کہ دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، معدن سے الماس، کان سے سونا، دکن سے ہاتھی، پہاڑ سے زمرد، عراق سے گھوڑا، دریا سے موتی، نیشاپور سے فیروزہ، بدخشاں سے یاقوت، بغداد سے سانڈنی، اصفہاں سے تلوار، کشمیر سے پشمینہ، ایران سے زربفت، یہ سب چیزیں فراہم کرکے لائیں، تب غالب کو صلہ بھیجا جائے۔ پس جبکہ یہ ساری ڈھیل اِس وجہ سے ہے تو اُسکو نواب کی آزردگی کی دلیل نہ سمجھنا چاہیے۔ جب عقل نے مجھکو یہ دم دیا تو میری تمام یاس و ناامیدی امید کے ساتھ بدل گئی۔ میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ جب ممدوح میرے لئے یہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اُسکے لئے آئینہ اور تاج سکندر سے، انگشتری اور تخت سلیماں سے، جامِ جمشید عالمِ غیب سے، آبِ حیواں چشمۂ خضر سے، عمرِ ابد، نشاطِ جاوید، دل کی قوت، ایمان کی مضبوطی اپنے خدا سے، اور اپنی عرضی کا جواب اور قصیدے کا صلہ ممدوح سے کیوں نہ مانگوں''

قطعہ

گفتم بخرد بخلوتِ انس کاے شمع و چراغِ ہفت ایواں

آیا زچہ رُو بود کہ نواب ننوشت جوابِ نامہ ام - ہاں!

آں گونہ عریضۂ کہ دانی درویش نوشتہ سوے سلطاں

آں گونہ قصیدۂ کہ گوئی از صفحہ دمیدہ سُنبلستاں

بہت بڑے لوگوں سے تعریف سنی گئی ہے۔ کیس وہ دلی میں آئے ہیں۔ اور مرزا کے مکان پر ٹھیرے ہیں
ان کی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جسکا ماحصل یہ ہے کہ "خدا نے میری
بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا؛ اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم، اور میرے درد
کا درماں اپنے ساتھ لایا؛ اور جسنے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اسنے اپنی باتوں سے
ایک ایسی شمع روشن کی جسکی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی۔ جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود
میری نگاہ سے مخفی تھی۔ دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی
اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے؟ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں، مگر جب تک میں نے اس
بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ اور سخن فہم کسکو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے
حسن کے دو حصے کئے؛ آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوعِ انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہمِ سخن اور
ذوقِ معنی کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے، اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو
غرضکہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بیفکر
ہوں؛ اور اس نعمت پر دنیا سے قانع ہوں۔

مرزا پر جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمائش کی جاتی تھی جو اُن سے بآسانی سرانجام نہ ہو سکتی تھی
تو وہ اس بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت و ناموری پر حرف آئیگا؛ بلکہ صاف
لکھ بھیجتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔ ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم و مغفور نے
مرزا سے اس بات کی خواہش کی کہ اردو میں جناب سید الشہدا کا مرثیہ لکھیں۔ چونکہ مرزا اُنکی بہت
تعظیم کرتے تھے اور اُنکے سوال کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے اُن کے حکم کی تعمیل کے لئے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ چونکہ

قسم، وساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، اُستا کی قسم، گرو کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ، نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔ کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں ؎

برہا نیم کہ ہستیم و ہمساں خواہد بود"

مرزا کی اسی راستبازی کا سبب تھا کہ وہ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے۔ جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا۔ جو خلوت میں کرتے تھے وہی جلوت میں بھی کرتے تھے۔ پس اگر اُن میں کوئی عیب تھا تو وہی تھا جسکو ہر کس و ناکس جانتا تھا؛ مخفی عیبوں سے وہ بالکل پاک تھے

وہ اس خیال سے کہ اُن کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اکثر تنگ دل رہتے تھے۔ چنانچہ اس بات کی اُنھوں نے فارسی اور اُردو نظم و نثر میں جا بجا شکایت کی ہے ایک روز قلعے سے سیدھے نواب مصطفی خاں کے مکان پر آئے؛ اور کہنے لگے کہ "آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھکر لے گیا تھا؛ جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ "مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو"۔ اِسکے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانے کی نا قدر دانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔

مہر نیمروز میں اِس مضمون کو کہ میں نے اپنا کمالِ شاعری محض نا قدر دانوں کی مدح سرائی میں صرف کیا وہ ایک جگہ اِس طرح بیان کرتے ہیں "در سینہ من نغمئے داشت بہ رواں آسائی نسیمے کہ از نسترن زار وزد؛ زیاں زدہ من۔ کہ دم جز بہ نا بایست نہ زدم۔ بنانِ مرا قلمے بود بہ دجلہ باری ابرے کہ از قبلہ خیزد؛ بیہدہ کوش من۔ کہ باراں بشورہ زار فرو ریختم"۔ یہی وجہ تھی کہ جب حسنِ اتفاق سے اُن کو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسر آجاتا تھا تو اُسکو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر تخلص۔ جو ایک زمانے میں کول میں سررشتہ دار تھے، اور جنکی سخن فہمی اور سخن سنجی کی

ناقدر دانی کی شکایت

سخن فہموں کی قدر

منشی حقیر کی تعریف

سرایت کر گئی تھی باوجود اسکے وہ روایت اور حکایت اور وعدہ و اقرار اور بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق اللہجہ تھے۔ اسی لئے جو شخص اُنکے وعدے یا اقرار کا یقین نہ کرتا تھا اُس سے نہایت ناراض ہوتے تھے۔ تفضل حسین خاں مرحوم خلف دیوان فضل اللہ خاں سے مرزا نے اپنا دیوان مانگا ہے اور اقرار کیا ہے کہ میں اُسکو دیکھکر واپس بھیجدونگا۔ اُنھوں نے دیوان کے دینے سے انکار کیا ہے۔ اُن کے انکار کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں "کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و اُستادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے؟ میرا کلام! خرید آٹھ دس روپیے کی! سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھکو دے ڈالو؛ تمکو مبارک رہے؛ مجھکو مستعار دو؛ میں اُسکو دیکھ لوں؛ جو میرے پاس نہیں ہے اُسکی نقل کر لوں؛ پھر تم کو واپس بھیجدوں؛ اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اسکی ہے کہ مجھکو جھوٹا جانتے ہو؛ میرا اعتبار نہیں، یا یہ کہ مجھکو آزار دینا اور ستانا بدل منظور ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دیدو۔ باللہ واللہ میں اُسمیں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے بھیجدونگا۔ اگر تمکو واپس نہ دوں تو مجھپر لعنت؛ اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تمکو آفریں"

اسی طرح ایک خط میں نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں

"ہدست مرگ دلے بدتر از گمان تو نیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا؛ مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کون سی رباعیاں مانگتے ہو؛ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج؛ معنی اسکے یہ کہ تو جھوٹا ہے؛ ابکے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم؛ انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی

لکھا "خوک شم دارو نہ پنجہ اگر نزدیک اساتذہ اطلاق سُم و پنجہ بیک محل روا باشد اعلام باید فرمود" مرزا نے اسکے جواب میں صاف لکھ بھیجا کہ اگر کلیاتِ فارسی کے چھپنے سے پہلے آپ کا خط پہونچ جاتا تو میں اس لفظ کو بدل ڈالتا۔ اور اس مصرع کو اس طرح بنا دیتا "خوک شد و بہ نفسی ساز کرد"، چنانچہ جب مرزا کا کلام دوسری بار چھپا تو انھوں نے یہ مصرعہ اسی طرح بنا دیا۔

مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا یہ شعر ہے۔

ہمچناں در تتق غیب ثبوتے دارند ۔۔۔ بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیاں

مرزا صاحب خود مجھسے کہتے تھے کہ میں نے ثبوتے کی جگہ نمودے لکھا تھا۔ مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انھوں نے کہا کہ اعیانِ ثابتہ کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے اسکی جگہ ثبوت بنا دو، چنانچہ طبع ثانی میں انھوں نے بجائے نمود کے ثبوت بنا دیا ہے اسیطرح ایک قصیدے کے مطلع کا پہلا مصرعہ یہ ہے

عیدِ اضحےٰ بسر آغازِ زمستاں آمد

مرزا نے اول عیدِ قرباں لکھا تھا پھر نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے کہنے سے عید اضحےٰ بنا یا گیا۔ حالانکہ نواب صاحب خود مرزا سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور مومن مرحوم کے بعد ہمیشہ انھیں کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔

ان باتوں کے بیان کرنے سے مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نہیں ہیں بلکہ انصاف اور حق پسندی کی شریف خصلت اور وہ ملکہ جسکے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ہے۔ جن لوگوں میں اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی اُن کا اپنے فن میں ترقی کرنا ناممکن ہے۔

حالانکہ ایشیائی شاعری - جسکی بنیاد جھوٹ اور مبالغے پر رکھی گئی ہے - مرزا کی رگ و پے میں

مشاہیر نے اُسپر نثر میں تقریظیں لکھی تھیں؛ اور مرزا نے نظم میں ایک مثنوی لکھی تھی۔ جو اُنکے کلیات میں موجود ہے۔ باوجودیکہ مرزا کو سرسید کی خاطر بہت عزیز تھی، اور وہ اُن سے اور اُنکے خاندان سے مثل یگانوں† کے ملتے تھے، مگر چونکہ مرزا۔ ابو الفضل کی طرزِ تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے، اور جو آئین اُس کتاب میں لکھے ہیں اُنکو اِس زمانے کے آئینوں کے مقابلے میں ہیچ و پوچ سمجھتے تھے، اور تاریخ کا مذاق جیسا کہ خود اُنھوں نے اعتراف کیا ہے بالکل نہ رکھتے تھے اِس لئے آئینِ اکبری کی تصحیح کو اُنھوں نے ایک فضول کام سمجھا۔ گو اُنکی یہ راے غلط ہو یا صحیح۔ مگر جو کچھ آئینِ اکبری اور اُسکی تصحیح کی نسبت اُن کا خیال تھا اُسکو تقریظ میں ظاہر کئے بغیر نہیں رہے۔ چنانچہ اُس مثنوی کے اول کے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

مژدہ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب — یافت از اقبالِ سیّد فتح باب

دیدہ بینا آمد و بازو قوی — کہنگی پوشید تشریفِ نوی

دیں کہ در تصحیحِ آئیں راے اوست — ننگ و عارِ ہمتِ والاے اوست

دل بہ شغلے بست و خود را شاد کرد — خود مُبارک* بندۂ آزاد کرد

گوہرش را آنکہ نتواند ستود — ہم بدیں کارش ہمی داند ستود

ہر چنیں کارے کہ اصلش ایں بود — آں ستاید کش ریا آئیں بود

من کہ آئینِ ریا را دشمنم — در وفا اندازہ دانِ خود منم

---

† مرزا آثار الصنادید کی تقریظ میں سرسید کی نسبت لکھتے ہیں "با ہمگنانش دلیست از فرزانگی بآئین مردمی دانا؛ و بامنش جانِ بہرست از دلنشینی بہ پیوند خویش دانا"

* مبارک بندہ آزاد کردن عبث کام کرنے کو کہتے ہیں۔ اِسمیں لطف یہ ہے کہ ابو الفضل کے باپ کا نام مبارک تھا ۱۲

نہوں ختم ہوجاتا تھا۔ اخیر میں کتاب کی نسبت چند جملے جو اصلیت سے خالی نہوتے تھے، اور مصنف کے خوش کرنے کے لئے کافی ہوتے تھے، لکھدیتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ مرزا سے شکایت کرتے تھے کہ آپ نے ستائش میں مضائقہ کیا ہے۔

جب مرزا نے منشی ہرگوپال تفتہ کے دیوان کی تقریظ۔ جو کلیات نثر غالب میں موجود ہے۔ لکھکر بھیجی تو انھوں نے بھی اسی قسم کی شکایت کی تھی۔ مرزا اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھکو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کروں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤگے؛ اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفے خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ اُن کی مدح کتنی ہے؟ مرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ انطباع دیوانِ حافظ کی۔ جان جاکوب بہادر کی فرمائش سے لکھی ہے اُسکو دیکھو؛ کہ فقط ایک بیت میں اُنکا نام اور اُنکی مدح آئی ہے اور باقی نثر میں اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ اگر کسی شاہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اُسکی مدح اتنی نکرتا کہ جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہمکو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدل کر اُسکے عوض ایک فقرہ اور لکھدیا ہے۔ اس سے زیادہ بھٹئی میری روش نہیں۔ ظاہرا تم خود فکر نہیں کرتے؛ اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اِس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے۔ کس واسطے کہ اُن کے کان اِس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانینگے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے۔

(سر) سید احمد خاں نے جب نہایت جانفشانی اور عرقریزی سے آئینِ اکبری کی تصحیح کی تو دلی کے

ہوسے! اور کیسے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اُردو خطوں میں
اس شعر کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔ اسی طرح
مومن خاں کا جب یہ شعر سُنا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اسکی بہت تعریف کی اور یہ کہا "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھکو دے دیتا" اس
شعر کو بھی اُنھوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے

دکھلایئے لیجا کے تجھے مصر کا بازار　　　لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اُسپر وجد کرتے تھے۔

"رُخ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں　　　اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے"

بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ اُنکی تعریف میں شاید اُنکا
دل بڑھانے کو حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے اخیر عمر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھکر
اُسکی بے انتہا تعریف کی؛ اور یہ کہا "کہ اگر میں اب رشک کرنیکے قابل ہوتا تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد"
مرزا پر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں۔ اور جیسا کہ ظاہر ہے تعریف کی مستحق فی الحقیقۃ
بہت ہی کم کتابیں ہوتی ہیں۔ مرزا کی طبیعت چونکہ صلح جو اور مرنج و مرنجاں واقع ہوئی تھی وہ کسی سے
انکار تو نہیں کرتے تھے؛ مگر تقریظ نگاری کا اُنھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے
خلاف بھی نہو اور صاحب کتاب خوش بھی ہو جاسے۔ بہت سا حصہ تمہید میں، یا مصنف کی ذات اور
اسکے اخلاق، یا اسکی محبت اور دوستی کے بیان میں، یا اور لطیف اور پاکیزہ باتوں کے ذکر میں جو محل

اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہوگئے۔ اس شہرت کا باعث مرزا کہت

سچ ہوا؛ اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اسکے تدارک کے لئے کچھ رسالے

اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے، اور بادشاہ

بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی - جسکا نام غالباً دمتی ... نامے اسکے ہر ایک شعر پر - خواہ اچھا

کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔ اس مثنوی میں ... شعر میں کچھ تمیز نہیں کی جاتی؛ مرزا کی

بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ... دمی ہو جب تک اسکا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو

جب یہ مثنوی لکھنؤ پہونچی تو مجتہد العصر ... اخیر عمر میں تو ان کا ثقل سماعت انتہا کو پہونچگیا تھا؛ مگر

پہلے ایسے ... نامہ ... تو ان سے بات چیت اور شعر و سخن سن لیتے تھے؛ مگر جب تک کوئی

شعر ان کے دل میں نہ چبھتا تھا ٹس سے مس نہوتے تھے۔ انکے بعض معاصرین اس بات سے آزردہ

رہتے تھے؛ اور اسی لئے انکی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ مگر مرزا باوجودیکہ ان کی طبیعت نہایت

صلح جو واقع ہوئی تھی - شعر کی داد دینے کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا تھا اسکو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔

لیکن جو شعر ان کے دل میں چبھ جاتا تھا اسکی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغے کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔

درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لئے ایسا نہیں کرتے تھے؛ بلکہ ذوقِ سخن ان کو بے اختیار کردیتا تھا۔ وہ

شیخ ابراہیم ذوق جنکی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو ان سے چشمک تھی۔ ایک روز جب کہ مرزا شطرنج میں مصروف

تھے منشی غلام علیخاں مرحوم نے انکا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سنانے کو پڑھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

خانِ مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اسکی بھنک پڑ گئی فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھسے کہا بھیّا تمنے

کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا ذوق کا۔ یہ سنکر نہایت متعجب

انصاف

رہے ہوئے ؛ اور جیسے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے ۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اُردو خطوں میں اور جس طرح میں کتنا ہوں ہے ۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے ۔ اسی طرح سے کچھ تعلق تھا ؛ بلکہ صرف دو شعر ۔

کی ۔ جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے اُسکو تو اسی طرح گویا تب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمے ، خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھکو دے دیتا، اس

اے کہ ختم المرسلینش خوانمہ کیا ہے ۔ اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے

ایں الف لامے کہ استغراق راست تکلم نا ۔ اکوئی خواہاں نہیں وہاں جنس گراں کا

منشاء ایجاد ہر عالم یکیست گر دو صد عالم بود خاتم یکیست

اسکے بعد اسی مضمون کو اور زیادہ پھیلایا ہے ؛ اور پھر مثنوی کو ان دو شعروں پر جن میں نظیر خاتم النبیین کے ممتنع بالذات ہونے کی تصریح ہے ختم کر دیا ہے ۔

منفرد اندر کمالِ ذاتی است لاجرم شلش محالِ ذاتی است

زیں عقیدت برنگردم والسلام نامہ را در سے نوردم والسلام

اوپر کے بیان سے ناظرین کو معلوم ہوا ہو گا کہ مرزا کی طبیعت میں کس قدر سلامت روی تھی ؟ اور اعوجاج سے کس قدر اُنکا ذہن ابا کرتا تھا ؟ باوجودیکہ مولانا فضل حق نے اس مسئلے کے متعلق جو کچھ اُنکی رائے تھی مرزا کے خوب ذہن نشین کر دی تھی اور مرزا اُسی کو اپنی مثنوی میں بیان کرنا چاہتے تھے مگر جس طرح ایک ٹیڑھی چیز نلکی میں آ کر سیدھی ہو جاتی ہے اسی طرح مرزا کی راست بیانی نے اُس ٹیڑھی رائے کے تمام بل نکال ڈالے اور بغیر اسکے کہ مرزا کو وہابیوں کی حمایت منظور ہو جو ٹھیک بات تھی وہ

اِس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہوگئے۔ اِس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا؛ اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اِسکے تدارک کے لئے کچھ رسالے شائع کرائے، اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے، اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی۔ جسکا نام غالباً دمغ الباطل رکھا گیا تھا، اور جسمیں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔ اِس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے اُن کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔

جب یہ مثنوی لکھنؤ پہونچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اِس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اُسکی تعمیل کرتا ہوں۔ اِس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں۔

مرزا کی طبیعت نہایت سلیم واقع ہوئی تھی۔ باوجودیکہ تیزی ذہن اور سلامتی طبع دونو ایک جگہ بہت کم جمع ہوتی ہیں؛ مرزا میں یہ دونو باتیں بوجہ اتم موجود تھیں۔ اِسی سلامتی طبع کا اقتضا تھا کہ ابتدائے مشقِ سخن میں جو ٹیڑھا رستہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا۔ بغیر اِسکے کہ کوئی اُستاد رہبری کرے۔ جس قدر عقل و تمیز بڑھتی گئی اُسی قدر آہستہ آہستہ اُس سے انحراف ہوتا گیا؛ اور آخر کار اساتذۂ مسلّم الثبوت کی روشِ مستقیم پر آرہے۔

مرزا ازراہ عجز و انکسار کہا کرتے تھے کہ قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی و انوری پہنچتے ہیں افتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں؛ مگر مدح و ستائش میں مجھسے اُن کا ساتھ نہیں دیا جاتا۔ مرزا کا یہ کہنا بلکہ

سلامتی طبع

رباعیاں صرف بادشاہ کے خوش کرنے اور اہل دربار کے ہنسانے کے لیے لکھی گئی تھیں ، کیونکہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو ۔ مرزا اکثر مواقع پر بادشاہ کے خوش کرنے کو اس قسم کے اشعار دربار میں پڑھا کرتے تھے ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہ اور امیر خسرو کی مصاحبت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا مرزا نے اسی وقت یہ شعر انشا کرکے پڑھا

ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب   نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب

رمضان کا مہینا تھا ، ایک سنی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے ۔ عصر کا وقت تھا ۔ مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا ۔ مولوی صاحب نے تعجب سے کہا "کیا جناب کو روزہ نہیں ہے ؟ مرزا نے کہا "سنی مسلمان ہوں ، چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں"

ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے ۔ اُس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے ۔ ان کا مذہب اثنا عشری تھا ۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاک شفا دی گئی اور اسکے بعد بادشاہ کو صحت ہو گئی ۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائیگی تو حضرت عباس کی درگاہ میں جو کہ لکھنؤ میں ہے علم چڑھاؤنگا ۔ چنانچہ انہوں نے لکھنؤ جاکر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے ، حضور مدد فرمائیں ۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور انہوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا ۔ جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرا و علما سب شریک تھے ۔ اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے علم چڑھوایا گیا ۔

نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔

اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صُلحِ کُل تھا مگر زیادہ تر اُنکا میلانِ طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیرؑ کو وہ رسول خُدا کے بعد تمام اُمت سے افضل جانتے تھے۔

ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں یہ کہا کہ ہمنے سُنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہو گئی۔ چند رباعیاں لکھکر حضور کو سُنائیں۔ جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ اُن میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے مجھکو یاد رہ گئی ہے جو یہاں لکھی جاتی ہے

رباعی

جن لوگوں کو ہے مجھسے عداوت گہری　　کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی ؟　　شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری ؟

دہریت اور تصوف میں جو بُعدِ بعید ہے وہ ظاہر ہے؛ دہری خدا کے وجود ہی کا قائل نہیں اور صوفی صرف خدا ہی کو موجود جانتا ہے اور ماسوا کو ہیچ سمجھتا ہے پس صوفی دہری کیونکر ہو سکتا ہے؟ چوتھے مصرع کا یہ مطلب ہے کہ ماوراءالنہر یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سُنّی ہونے میں ضرب المثل ہیں؛ یہاں تک کہ شیعہ اُن کو ناصبی اور خارجی سمجھتے ہیں۔ چونکہ مرزا کی اصل ماوراءالنہر سے تھی اسلیے کہتے ہیں کہ ایک ماوراءالنہری رافضی یا شیعی کیونکر ہو سکتا ہے؟

جو لوگ مرزا کی طرزِ مزاج اور طرزِ کلام سے ناآشنا ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لئے اپنا مذہب غلط بیان کیا؛ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب

لطیفہ بیان

انھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں ایک توحید
وجودی اور دوسرے نبی اور اہلبیت نبی کی محبت ؛ اور اسی کو وہ وسیلہ نجات سمجھتے تھے۔

اگرچہ شاعر کے کلام سے اُسکے عقائد پر استدلال نہیں ہوسکتا مگر جو بات دل سے نکلتی ہے وہ چھپی
نہیں رہتی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر حکماے اسلام نے نعیم جسمانی سے انکار کیا ہے مرزا بھی اسکے
قائل نہ تھے چنانچہ انھوں نے اس خیال کو اپنے شاعرانہ انداز میں متعدد جگہ ظاہر کیا ہے ایک جگہہ
کہتے ہیں، "ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ÷ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"
یہی خیال ایک فارسی رباعی میں اس طرح ظاہر کیا ہے "گردیدن زاہداں بجنت گستاخ ÷
واں دست درازی بہ ثمر شاخ بشاخ ÷ چوں نیک نظر کنی زروے تشبیہ ÷ مانند بہائم و علف زار فراخ"
مرزا باوجودیکہ احکام ظاہری کے بہت کم پابند تھے ؛ لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے
تھے تو اُن کو سخت رنج ہوتا تھا ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعہ پر نہایت افسوس کرتے
تھے اور کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے ؛ پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر
مجھکو کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے ؟ مگر چونکہ طبیعت نہایت شوخ واقع ہوئی تھی۔ جب کوئی
گرم فقرہ سوجھ جاتا تھا پھر اُن سے بغیر کہے نہیں رہا جاتا تھا ؛ خواہ اس میں اُنکو کوئی کافر سمجھے ، یا
رند مشرب کہے ، یا بدمذہب جانے۔

غدر کے بعد۔ جبکہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہوئی تھی۔ پنڈت
موتی لال میر منشی لفٹنٹی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔ کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب
نے کہا "تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر ؛ اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار ؛ پھر میں

میر مہدی مجروح نے جے پور سے خط بھیجا ہے اور وہاں جو کسی تقریب میں کئی سَو من مصری کا شربت مہمانوں کے لئے کیا گیا تھا اُسکا ذکر لکھا ہے اُسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں

،، میر احمد حسین و مرزا قربان بیگ نامۂ شما را خواندند و بہ ذوقِ شربت ہفت صد من نبات ہر دو را آب در دہن گشت۔ سخن از بادۂ ناب نبود + ورنہ مرا نیز دل از جا رفتے ،،

مرزا نے غزلیات و قصائد و قطعات و رباعیات میں شراب کے متعلّق جس قدر مضمون باندھے ہیں وہ خواجہ حافظ اور عمر خیام سے کم نہونگے؛ یہاں ایک شعر اُردو غزل کا اور ایک فارسی غزل کا اور ایک فارسی رباعی لکھی جاتی ہے۔

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں — یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

خجلت نگر کہ در خمِ تا تم نیافتند — جز روزۂ درست بہ صہبا کشودہ

رباعی

غالب بہ سخن گرچہ کست ہمسر نیست — از نشۂ ہوش ہیچ اندر سر نیست

مے خواہی و مفت و نغز و آنگہ بسیار!!! — ایں بادہ فروش ساقیِ کوثر نیست

اسلام پر یقین

مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصلِ اصول اور رکنِ رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہلِ حال سے نہ تھے، مگر جیسا کہ کہا گیا ہے ،، من احب شیئاً اکثر ذکرہ ،، توحیدِ وجودی اُنکی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو اُنھوں نے جس قدر اصنافِ سخن میں بیان کیا ہے غالباً نظیری اور بیدل کے بعد کسی نے نہیں بیان کیا۔ مرزا کے حق میں اگر اور کچھ نہیں تو عرفی کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے۔

امید ہست کہ بیگانگیِ عرفی را — بہ دوستیِ سخن ہائے آشنا بخشند

لطیفہ ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے؛ اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پانو داپنے لگے۔ مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے، مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟ اُنھوں نے نہ مانا، اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر داپنے کی اُجرت دیدیجئے گا۔ مرزا نے کہا ہاں اسکا مضائقہ نہیں۔ جب وہ پیر داب چکے اُنھوں نے اُجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا "بھیا کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پانو داپے، میں نے تمھارے پیسے داپے؛ حساب برابر ہوا۔

لطیفہ ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے میں بھی وہاں موجود تھا اور اُنکے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا۔ مرزا نے کہا "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، میں اِن کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دونگا۔ پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ "نواب عبد الاحد خاں کے دسترخواں پر اُن کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لئے ہر قسم کے کھانے چُنے جاتے تھے؛ مگر خاص اُنکے لئے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی۔ وہ اُسکے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک روز اُنکے لئے مزعفر پکا تھا؛ وہی اُنکے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منھ لگا ہوا تھا جو اسوقت دسترخوان پر موجود تھا۔ نواب نے اُسکو کھانا دینے کے لئے خالی رکابی طلب کی۔ اُسکے آنے میں دیر ہوئی۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔ وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا، اور کہا "حضور اور رکابی کیا کیجیے گا اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے،، نواب یہ فقرہ سُنکر پھڑک گئے اور وہی رکابی اُسکی طرف سرکا دی،،

لطیفہ ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسماں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ظاہری بےنظمی اور انتشار دیکھکر بولے "جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو تو دیکھو

باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا، مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے، اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی راے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی راے بیان کرو۔ مرزا نے کہا بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں، میٹھا ہو اور بہت ہو۔ سب حاضرین ہنس پڑے۔

مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار اُنھوں نے مقرر کر لی تھی اُس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اُسکی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی، اور اُسکو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھکو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا، اور کنجی مجھکو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے، اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے، مگر داروغہ نہایت خیرخواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے، دوسرے اُسمیں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے۔ جس سے اُسکی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست　　　　آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اِس قدر احتیاط اور اعتدال کے اِس کافر نشے کی عادت نے آخر کار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا جسکی شکایت سے اُنکے تمام اُردو رقعات بھرے ہوئے ہیں۔

مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست۔ جن سے نہایت بے تکلفی تھی۔ اکثر شام کو اُن کے پاس جا کر بیٹھتے تھے۔ اور مرزا سرور کے عالم میں اُس وقت بہت پُر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔

حسنِ طلب

کے متولی صاحب کو آموں کی طلب میں لکھا ہے۔ اُسمیں لکھتے ہیں "ونحی تشکم بندہ ام، وقدرے ناتواں،
ہم آرائشِ خواں جوئیم، وہم آسائشِ جاں۔ خرد وراں دانند کہ ایں ہر دو صفت بہ انبہ اندر ست، و
اہلِ کلکتہ برآنند کہ قلمرو انبہ ہگلی بند رست۔ آرے انبہ از ہگلی، وگل از گلشن، انبار از جناب، وسپاس
از من۔ شوق می سگالد کہ تا پایانِ موسم دو سہ بار بخاطر دلی نعمت خواہم گذشت۔ وآز می نالد کہ حاشا بدیں پایہ
برخورداری خورسند نخواہم گشت"

لطیفہ

ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ۔ جن میں مرزا بھی تھے۔
باغِ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدرہے تھے۔
یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف
غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا اِس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟ مرزا نے ہاتھ باندھکر
عرض کیا "پیرو مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے " بر سر ہر دانہ بنوشتہ عیاں * کایں فلاں ابنِ فلاں
ابنِ فلاں * اِسکو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔
بادشاہ مسکرائے اور اُسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

لطیفہ

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے اُن کو آم نہیں بہاتے تھے ایک دن وہ مرزا
کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے؛ اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے
لئے ہوئے گلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے؛ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ حکیم صاحب نے کہا
دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بے شک گدھا نہیں کھاتا۔
مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہوتی تھی۔ اہلِ شہر تحفتہً بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے،

بغیر ملے نکل گئے ۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انہوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا مضمون یہ "کہ آج مجھکو اسقدر
ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں ۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے
کہ آپ کبھی کبھی تو اس طرف سے گذریں اور میں سلام کو حاضر نہوں" جب یہ رقعہ دیوان جی پاس
پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اُسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے ۔

مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی ۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے
نہیں رہ سکتے تھے ؛ یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انہوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا ۔ اخیر میں
ان کی خوراک بہت کم ہو گئی تھی ۔ صبح کو وہ اکثر شیرۂ بادام پیتے تھے ۔ دن کو جو کھانا ان کے لئے گھر میں
آتا تھا اُسمیں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا ۔ ایک پیالے میں بوٹیاں ، دوسرے میں لعاب ،
یا شوربا ، ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں تر کیا ہوا ، ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے
کی زردی ، ایک اور پیالی میں دو تین پیسہ بھر دہی ، اور شام کو کسی قدر شامی کباب ، یا سیخ کے کباب ؛
بس اس سے زیادہ انکی خوراک اور کچھ نہ تھی ۔

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا ، اور دسترخوان بچھا ؛ برتن تو بہت سے تھے ؛ مگر کھانا نہایت
قلیل تھا ۔ مرزا نے مسکرا کر کہا "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان
معلوم ہوتا ہے ؛ اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا"

فواکہ میں آم ان کو نہایت مرغوب تھا ۔ آموں کی فصل میں ان کے دوست دور دور سے اُنکے
لئے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے ؛ اور وہ خود اپنے بعضے دوستوں سے تقاضا کر کر کے آم منگواتے تھے ۔
اُنکے فارسی مکتوبات میں ایک خط ہے جو غالباً کلکتے کے قیام کے زمانے میں انہوں نے امام باڑہ ہگلی بندر

بہت جھک کر جانا پڑتا تھا؛ اُسمیں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لُو کے موسم میں دس بجے
سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جبکہ رمضان کا مہینا اور گرمی کا موسم تھا - مولانا آزردہ
ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اُسوقت مرزا صاحب اُسی کوٹھڑی میں کسی دوست کے
ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہونچے؛ اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر
کھیلتے ہوئے دیکھکر کہنے لگے کہ "ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا
ہے؛ مگر آج اِس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا" مرزا نے کہا "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے؛
مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھڑی تو ہے۔

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہوتی تھی۔ اگر کوئی اُنکے تمام ملفوظات جمع
کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف وظرائف کی تیار ہو جاتی۔

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا؛ مگر خودداری اور حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے
نہ دیتے تھے۔ شہر کے امرا و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں
نکلتے تھے۔ عمائدِ شہر میں سے جو لوگ اُنکے مکان پر نہیں آتے تھے؛ وہ بھی کبھی اُنکے مکان پر نہیں
جاتے تھے۔ اور جو شخص اُنکے مکان پر آتا تھا وہ بھی اُسکے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز
کسی سے مل کر نواب مصطفےٰ خان مرحوم کے مکان پر آئے؛ میں بھی اُس وقت وہاں موجود تھا؛
نواب صاحب نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟
مرزا نے کہا مجھکو آن کا ایک آنا دینا تھا؛ اِس لیے اوّل وہاں گیا تھا؛ وہاں سے یہاں آیا ہوں۔
ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم - چرٹ میں سوار - مرزا کے مکان کے پاس سے

خودداری

لطیفہ

تو وہاں نواب صاحب انکے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے اُن کو دیکھکر یہ مصرع پڑھا "کہ آب چشمۂ حیواں درون تاریکیست" جب دیوانخانے میں پہنچے تو اسکے دالان میں بسبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا "ایں خانہ تمام آفتاب ست" ایک صحبت میں مرزا میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے؛ انھوں سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا "میں تو تمکو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں"

لطیفہ

لطیفہ

مولوی امام بخش صہبائی مرحوم کی رائے پنج رقعہ اور مینا بازار کی نسبت یہ تھی کہ یہ دونو تحریریں بھی مثل سہ نثر کے ملا ظہوری کی ہیں مگر مرزا اسکے خلاف تھے۔ ایک جلسے میں دونو صاحب موجود تھے۔ اتفاق سے یہ ذکر چھڑ گیا۔ مرزا نے کہا "قطع نظر اسکے کہ سہ نثر کی اور پنج رقعہ و مینا بازار کی طرز میں بون بعید ہے۔ ظہوری کی شان سے نہیں ہے کہ وہ نثر کے ساتھ نظم نہ لکھے۔ تمام سہ نثر میں ایسا ایک صفحہ بھی مشکل سے نکلیگا جس میں نثر ہو اور نظم نہو۔ برخلاف اسکے تمام پنج رقعہ و مینا بازار میں ایک شعر کے سوا کہ وہ بھی ظہوری کا نہیں ہے۔ نظم کا کہیں پتا نہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص نظم و نثر دونو چیزوں پر برابر قدرت رکھتا ہو اُسکی نثر میں کہیں نظم نہ پائی جائے" مولانا صہبائی نے کہا "ایسے اتفاقات اکثر ہو جاتے ہیں یہ محض ایک اتفاق کی بات ہے" مرزا نے کہا "بے شک! مگر یہ ایسا اتفاق ہو گا کہ ایک شخص ہر ایک لحاظ سے نہایت سنجیدہ، شایستہ، اور معقول آدمی ہے؛ مگر اتفاق سے کبھی کبھی کاٹ بھی کھاتا ہے" یہ سنکر سب لوگ ہنس پڑے؛ اور مولانا صہبائی مسکرا کر خاموش ہو رہے۔

لطیفہ

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اُٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا؛ اور اسکے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی۔ جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں

کہ کونسا مطلع اچھا ہے؟ اور بطور متیقن کے اوّل نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اُس مطلع کو سُنکر سر دُھننے لگے؛ اور متحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا؛ اور اِس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ امید نہ رہی کہ اِس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملیگی۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا؛ اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھے۔

کتابِ فہمی

مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور اُن کو خوب سمجھتے تھے۔ نواب ممدوح فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ۔ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا۔ مطالعہ کر رہا تھا؛ اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاقاً اُسی وقت مرزا صاحب آنکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ اُنھوں نے کسی قدر غور کے بعد اُسکا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ صاحب بھی شاید اُس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔

حُسنِ بیان اور ظرافت

مرزا کی تقریر میں اُنکی تحریر اور اُن کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اِسی وجہ سے لوگ اُن سے ملنے اور اُنکی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے؛ مگر جو کچھ اُنکی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اِس قدر تھی کہ اگر اُن کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حُسنِ بیان، حاضر جوابی، اور بات میں سے بات پیدا کرنا اُنکی خصوصیات میں سے تھا۔

لطیفہ

ایک دفعہ جب رمضان گذر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تمنے کتنے روزے رکھے؟ عرض کیا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔ ایک دن نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے۔ انکے

لطیفہ

مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گذر کر دیوانخانے کے دروازے پر پہنچے۔

شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک شتنے آدمی تھے۔ کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ اکثر ایک سرسری نظر میں اُسکی تہ کو پہونچ جاتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم گلشنِ بیخار میں مرزا کی نسبت لکھتے ہیں ،، مضامینِ شعری را کماھو حقہٗ می فہمد، و بجمیع نکات و لطائف پے می برد؛ و ایں فضیلتے است کہ مخصوص خواص اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناس داری بایں نکتہ می رسی؛ چہ۔ خوش فکر اگرچہ کمیاب ست اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حالِ کسیکہ از ہردو شربے یافتہ، و حظّے ربودہ۔ بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ ،، نواب ممدوح نے مجھسے ایک واقعہ بیان کیا جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بہت بڑا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا آزردہ نے ،، دور نہیں ،، حُور نہیں ،، اِس زمین میں غزل لکھی تھی۔ اُسمیں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سُنا کر اُنسے کہا کہ۔ اگرچہ بحر دوسری ہے مگر اسی ردیف و قافیے میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جسکا مطلع یہ ہے ،، عشق عصیانست اگر مستور نیست ٭ کشتۂ جرم زباں مغفور نیست ،، ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین میں۔ جسمیں ہماری غزل ہے۔ اُردو غزل لکھتا تو اُسکا مطلع اِس طرح ہوتا ،، عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں ٭ کشتۂ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں ،، آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور۔ بغیر اِسکے کہ قائل کا نام لیا جائے۔ اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اُردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سُنائیں اور پوچھیں کہ کون سا مطلع اچھا ہے، چونکہ نظیری کا مطلع اُردو ترجمے سے بہت پست ہوگیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کرینگے اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دینگے۔ چنانچہ مولانا اور نوابصاحب اور بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہونچے۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اُردو کے دو مطلع ہیں؛ اِن میں آپ محاکمہ کیجیے

اور اُس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں ؛ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھیرا، کبھی نجف جا پہونچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی ؛ جس شہر میں رہوں اُس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتوان، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ میرے اور معاملاتِ کلام و کمال سے قطعِ نظر کرو؛ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں''

جیسی مرزا کی طبیعت میں درّاکی اور ذہن میں جودت اور سرعتِ انتقال تھی اسی طرح اُنکا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ اُنکے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا ؛ ہمیشہ کرایے کی کتابیں منگوا لیتے تھے، اور اُنکو دیکھکر واپس بھیج دیتے تھے۔ مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی اُن کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا مُحاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جسکی سند اہلِ زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے اُن کے کلام پر اعتراض کئے تھے، اور جنکے جواب میں مرزا نے مثنوی بادِ مخالف لکھی تھی ؛ اُن کو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھکر علیحدہ بھیجی تھیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے خطوط میں اُنکو مفصل بیان کیا ہے۔ برہانِ قاطع پر جو کچھ اُنھوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکرِ شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمربند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے۔ اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے۔

غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹننٹ گورنر کے دربار میں اُن کو حسبِ معمول سات پارچہ کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹنٹ کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا اس لئے اُنھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب اُن کو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے عمائد میں سے ایک صاحب۔ جو مرزا کے دلی دوست تھے، اور غدر کے بعد اُنکی حالت سقیم ہو گئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی اُنکو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل اُن کے بدن پر دیکھکر دل بھر آیا۔ اُن سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اِسکی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے؛ آپ مجھے بھی فرغل کے لئے یہ چھینٹ منگوا دیں۔ اُنھوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے، اور میں نے اِسی وقت اِسکو پہنا ہے؛ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اِسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائینگے؟ پھر اِدھر اُدھر دیکھکر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اُتار کر اُنھیں پہنا دیا اور اِس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ اُنکی نذر کیا۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں وہ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار یک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں

با زادگان بخشند تبرک ۔ بیع و شرا نیست ۔ چون و چرا نیست ۔ ہرچہ فرستادہ ام ارمغان ست ۔ و ہرچہ
خواہم فرستاد ارمغاں خواہد بود ۔"

مروّت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے
سے بہت گھبرانے لگے تھے ؛ بااینہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے ۔
ایک صاحب کو لکھتے ہیں "جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا ۔ اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا
اور اصلاح دیتا تھا ۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے ، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے ۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف
بوعلی قلندر کو بسبب کبرسن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنّت معاف کردی تھی ۔ میں متوقع ہوں کہ میرے
دوست بھی خدمتِ اصلاحِ اشعار مجھ پر معاف کریں ۔ خطوطِ شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کرونگا"
باوجود اسکے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے ۔ ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ نے
بسبب ذوقِ سخن کے اصلاحِ اشعار منظور فرمائی تھی ۔ اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "لاحول ولا قوۃ ! کس
ملعون نے بسبب ذوقِ شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی ؟ اگر میں شعر سے بیزار نہوں تو میرا خدا
مجھ سے بیزار ۔ میں نے تو بطریقِ قہرِ درویش بجانِ درویش لکھا تھا ؛ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے
ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے "

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا ۔ سائل اُنکے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا ؛
اُنکے مکان کے آگے اندھے لنگڑے لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے ۔ غدر کے بعد
اُنکی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہو گئی تھی ؛ اور کھانے پہننے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا ؛
مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے ؛ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے ۔

وہ یہ بھی کہتے سنتے کہ ایک دفعہ مرزا دبیر مرحوم نے اسی شعر پر مرثیے لگائے تھے مگر انکو خود پسند نہ آئے اور کہا کہ بس رتبے کا یہ شعر ہے ویسے مصرعے نہیں لگ سکتے ۔

مرزا کے اخلاق و عادات و خیالات

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے ۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے ۔ جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا اُسکو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا ۔ دوستونکو دیکھکر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے ۔ اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے ۔ اسلئے اُن کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے ۔ جو خطوط اُنھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں اُن کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غمخواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے ۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرضِ عین سمجھتے تھے ۔ اُن کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا ۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے ۔ دوستوں کی فرمایشوں سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے ۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمایشیں اُنکے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ اُنکی تعمیل کرتے تھے ۔ لوگ اُنکو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر اُن کو کبھی ناگوار نہ گذرتا تھا ۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھکر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے ۔ اُنھوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے اُسنے کتاب کی رسید لکھی ہے ، اور قیمت دریافت کی ہے ۔ اُسکے جواب میں لکھتے ہیں ،، حرفِ پرسشِ مقدارِ قیمت چرا بزبانِ قلم رفت ؟ ہنجارِ نوازشِ نیازمندانِ بے نوا نہ اینست ۔ بیے سرمایہ ام نہ فرومایہ ۔ سخنورم نہ سوداگر ۔ موئینہ پوشم نہ کتاب فروش ۔ پذیرندۂ عطایم نہ گیرندۂ بہا ۔ ہرچہ آزادگاں بشہزادگاں فرستند ندرست ؛ وہرچہ شاہزادگاں

زیادہ دلکش اور موثر تھا ۔ میں نے غدر سے چند سال پہلے ۔ جب کہ دیوانِ عام میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سنا ہے ۔ چونکہ اُنکے پڑھنے کی باری سب کے بعد آئی تھی اِس لئے صبح ہوگئی تھی ۔ مرزا نے کہا صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں ؛ یہ کہکر اوّل اردو طرح کی غزل اور اُسکے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پُردرد آواز سے پڑھی ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدردان نہیں پاتے ؛ اور اِس لئے غزلخوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے ۔

جس زمانے میں میر نظام الدین ممنوں شاہ صاحب کے پرانے مدرسے میں مشاعرہ کرتے تھے ایک مشاعرے میں مرزا نے اپنا فارسی قصیدہ دریا گریستن اور تنہا گریستن جو جناب سید الشہدا کی منقبت میں اُنھوں نے لکھا تھا پڑھا ۔ سنا ہے کہ مجلسِ مشاعرہ بزمِ عزا بن گئی تھی ۔ جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے ۔ مفتی صدرالدین خاں مرحوم بھی موجود تھے اتفاق سے اُسی حالت میں مینہ بھی برسنے لگا مفتی صاحب نے کہا ”آسماں ہم گریست“

اسی قصیدے کی نسبت سید اکبر مرزا خلفِ الصدق ناظر سید حسین مرزا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ بندرگاہ بصرہ میں ایک جگہ مجلسِ عزا تھی ، اور بارش ہو رہی تھی ۔ بانیٔ مجلس نے مجھسے کہا کہ تم بھی کچھ پڑھو ۔ میرے پاس اُسوقت پڑھنے کی کوئی چیز مرثیہ یا کتاب نہ تھی ۔ اِسی قصیدے کے چند اشعار زبانی یاد تھے ؛ میں نے وہی پڑھ دیے ۔ پانچ ہی سات شعروں پر مجلس میں خوب رقت ہوئی ۔ عرب ، عجم ، اور ہندی سب اِس مجلس میں شریک تھے ۔ مجلس کے بعد ہر ایک عجمی مجھسے پوچھتا تھا کہ یہ اشعار کس شخص کے تھے ؟ خصوصاً اِس شعر کی بہت تعریف کرتے رہے ۔

عزو شفاعت وصلۂ صبر و خونبہا — ہیچ از کسے نخواستہ الّا گریستن

قول کا اندازہ صرف استقامت طبع سے ہو سکتا ہے۔ اور بحروں میں کلام موزوں نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں "مفتعلن مفتعلن کشت مرا" ۔۔ شعر می گویم بہ از قند و نبات ۔۔ مرزا کا ایسا حال نہ تھا چنانچہ فارسی اور اردو میں متعدد غزلیں اور نیز ایک آدھ فارسی قصیدہ ایسی ٹیڑھی بحروں میں انھوں نے لکھا ہے کہ اکثر موزوں طبع بغیر واقفیت عروض کے ان بحروں میں نہیں چل سکتے۔ علم نجوم سے کسی قدر، اور اسکی اصطلاحات سے پوری واقفیت اُن کو تھی۔ چنانچہ اُنکی نظم فارسی میں جا بجا اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ موسیقی سے جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب ست" اُن کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے اُنکے مطالعے سے گذرے تھے۔ اور سچ پوچھیے تو انھیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے معاصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعرا میں ممتاز بنا دیا تھا۔ فن تاریخ اور سیاق و مساحت وغیرہ سے اُن کو مطلق لگاؤ نہ تھا۔ جس زمانے میں کہ وہ خاندانِ تیموریہ کی تاریخ یعنی مہر نیمروز لکھ رہے ہیں کسی نے اُن کو مورخ سمجھکر کچھ سوالات کئے ہیں اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "میں فنِ تاریخ و مساحت و سیاق سے آشنا بیگانہ ہوں کہ ان فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کارپردازانِ دفترِ شاہی خلاصۂ حالات اردو کی کتب اردو میں لکھکر میرے پاس بھیجدیتے ہیں، میں اُسکو فارسی کرکے حوالے کرتا ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں میں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں، مورخ نہیں ہوں"

"ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم — از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس"

مرزا کا خط نستعلیق شفیعا آمیز نہایت شیریں اور دلاویز تھا جیسا کہ اکثر اہلِ ایران کا ہوتا ہے اور باوجود خوشخطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی خاصکر مشاعروں میں حد سے

٭ لطیفہ۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ سے کسی نے پوچھا کہ مرزا صاحب کو ریاضی میں بھی کچھ دخل تھا یا نہیں؟ انھوں نے کہا ایسا ہی دخل تھا جیسا مجھے شاعری میں ہے"

چو شکوہ جز بہ تقاضاے دوستی نبود / ز غیر شکر و شکایت ز دوست دار کنم

سرشتِ پاک و دلِ صاف دادہ اند مرا / بحرفِ تلخ دلے خالی از غبار کنم

خوش آں کہ ساز کنم از تو شکوۂ بیجا / تو اعتذار کنی و من افتخار کنم

خوش آں کہ عذرِ تو چوں در کند مرا ز میں / وگر بہ پیشِ تو تمہیدِ اعتذار کنم

براں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد ز یں پس / ز کار ہاے جہاں خاصہ ایں سہ کار کنم

ز کردہ توبہ نمایم ز گفتہ استغفار / وگر سپاسِ تو پنہان و آشکار کنم

جب یہ قطعہ مرزا صاحب کے پاس پہونچا اُسپر یہ لکھکر کہ "بس اب بیت بحثی موقوف" میرے پاس بھیج دیا اِسکے بعد پھر اور کچھ نہیں لکھا گیا۔

عربی

مرزا نے عربی میں صرف و نحو کے سوا اور کچھ اُستاد سے نہیں پڑھا تھا؛ مگر چونکہ علمِ لسان سے اُن کو فطری مناسبت تھی۔ اُنکی نظم و نثر اُردو و فارسی کے دیکھنے سے کہیں اِس بات کا خطرہ تک دل میں نہیں گذرتا کہ یہ شخص عربیت اور فنِ ادب سے ناواقف ہوگا۔ عربی الفاظ کو اُنھوں نے ہر جگہ ایسی سلیقے سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اچھے فاضل اور ادیب کو استعمال کرنا چاہیے۔ شاعری جسکا ملکہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اُس سے قطع نظر کرکے

فارسی دانی

فارسی زبان اور فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق اور اہلِ زبان کے اسالیبِ بیان پر مرزا کو اس قدر عبور تھا کہ خود اہلِ زبان میں بھی مستثنیٰ آدمیوں کو ایران کے مستند شعرا کی زبان پر اِس قدر عبور ہوگا۔

عروض

اِسکے سوا فنِ عروض میں بھی اُن کو کافی دستگاہ معلوم ہوتی ہے۔ اکثر بڑے بڑے نامور شعرا کو دیکھا اور سُنا گیا ہے کہ باوجود کمال شاعری کے اِس فن سے محض ناآشنا ہوتے ہیں، اور سیدھی سیدھی بحروں کے سوا جنکے وزن اور

جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اُس زمانے میں مجھکو نواب محمد مصطفےٰ خاں مرحوم متخلص بہ شیفتہ و حسرتی رئیس جہانگیر آباد کے ہاں تعلق تھا، اور اُن دنوں میں وہ دلّی آئے ہوئے تھے، اور میں اُنھیں کے مکان پر مقیم تھا۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کی نظر سے گذرا تو اُنھوں نے چار بیت کا ایک نہایت لطیف قطعہ نواب مرحوم کے پاس لکھکر بھیجا جو ذیل میں درج ہے۔

قطعہ

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری ۔۔۔ ہمی بہ لطف تو خود را امیدوار کنم

چو حالی از منِ آشفتہ بے سبب رنجید ۔۔۔ تو گر شفیع نگردی بگو چہ کار کنم

دوبارہ عمر دہندم اگر بفرضِ محال ۔۔۔ بر آں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم

یکے ادائے عباداتِ عمر پیشینہ ۔۔۔ دگر بہ پیشگہ حالی اعتذار کنم

اگرچہ مجھکو شرم آتی ہے کہ مرزا کے عالی رتبہ کلام کے ساتھ اپنا کم وزن و بے وقعت کلام ناظرین کے سامنے بار بار پیش کروں، مگر مقام اور موقع اس بات کا مقتضی ہے کہ جس واقعہ کا ذکر چھڑ گیا ہے اُسکو انجام تک پہونچایا جائے۔ مرزا صاحب کے اس قطعہ پر میں نے ایک اور قطعہ لکھکر اُن کی خدمت میں بھیجا جو ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

قطعہ

تو اے کہ عذر فرستادۂ بسوے رہی ۔۔۔ سزد کہ جانِ گرامی بر آں نثار کنم

شکایتے کہ تواں گفت عینِ اخلاصش ۔۔۔ گرم تو دوست شماری ہزار بار کنم

نماند قاعدۂ شکر بے ریا بجہاں ۔۔۔ اساسِ دوستی از شکوہ استوار کنم

شگفت خاطر یاراں گر از صبا گفتی

رسید نشئهٔ عرفاں چو ذکر مے راندی
دمید نخل تمنا چو از وفا گفتی

دوید ریشه بدلها چو حرف مهر زدی
اثر ز لفظ دواندی اگر دعا گفتی

گهر به بزم فشاندی اگر ثنا خواندی
هزار نکتهٔ پوشیده بر ملا گفتی

هزار عقدهٔ سربسته باز بکشودی
ز سیر انفس و آفاق رازها گفتی

ز سر تفرقه و جمع قصه ها راندی
به محفلے که سخن ہاے آشنا گفتی

بر آید از دل بیگانگاں ترانهٔ ذوق
تو چوں فرشته ز غیب آمدی نوا گفتی

لطیفه ها که به لفظ و بیاں نمی گنجید
که پایهٔ سخن افراشتند تا گفتی

بحق لطف کلامت که هست بر دل ما
جز آں که در حق حالی برفزوا گفتی

تو اے که هر سخن نغز تو بدل جا کرد
خطا بود که بگیرم اگر خطا گفتی

هر آنچه گفته اندر جواب عرض نیاز
که گر نگفته ام آخر تو از کجا گفتی

ولے بعهده از حرف چند با خویشم
سفیه و معجب و خودبین و خودنما گفتی

عجب که قاعده دان نیاز مندی را
رهین ذوق نواسنجی انا گفتی

عجب که چاشنی اندوز خاکساری را
به زرق در گره عرض کیمیا گفتی

عجب که منفعلی راز نقد ناسره اش
جواب چیست اگر پرسم از کجا گفتی

نه راه حرف بسوئیت نه جاے من بدلت
چگونه گفتی؟ و چوں گفتی؟ و چرا گفتی

اگر نه روے سخن با تو بود می گفتم
هر آنچه در حق من گفته بجا گفتی

ولیک شرط ادب نیست بر تو خرده گرفت

دم از وجودک ذنب* زد ندیے خبراں — چہ ساں عطیۂ حق را گناہ ما گویند

بلے! گناہ بود دعوے وجود از ما — باہلِ راز چنیں گوے تا بجا گویند

دگر ملامتیاں را چہ زہرہ یا سخ — اگر بہ خشم گرایند و ناسزا گویند

نکردہ زر مسِ خود را و بہر عرضِ فریب — بہ پیشِ خلق حکایت ز کیمیا گویند

کساں کہ دعوے نیکی ہمی کنند۔ مرا — اگر نہ نیک شمارند۔ بد چرا گویند!

طمع مدار کہ یابی خطابِ مولانا — بس ست ہمچو توئے را کہ یار سا گویند

بگوے مردہ۔ کہ در دہر کارِ غالبِ زار — ازاں گذشت کہ درویش و بے نوا گویند

اس غزل کو دیکھکر مجھکو اس بات کا موقع ملا کہ مرزا کے کمالِ شاعری کی نسبت جو خیالات مکنونِ خاطر ہیں ؛ اور کبھی اُنکے اظہار کی نوبت نہیں آئی ؛ اُن کو کسی قدر شکایت کے ساتھ ایک مختصر قطعہ میں بیان کیا جائے۔ چنانچہ قطعۂ ذیل ترتیب دیکر مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا۔

قطعہ

توائے کہ رونقِ پیشینیاں بہم شکست — ز نظم و نثر تو کاندر زمانِ ما گفتی

چہ نغمہ ہا کہ بہ قانونِ ذوق سنجیدی — چہ بذلہ ہا کہ بہ اندازِ دلربا گفتی

---

* یہ ایک مشہور قول صوفیۂ کرام کا ہے۔ میں نے جو کچھ مرزا صاحب کو لکھکر دیا تھا اُس میں ایک موقع پر یہ جملہ بھی لکھا گیا تھا۔ مرزا اُسپر اعتراض کرتے ہیں اور اُس کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ "وجود ایک عطیۂ الٰہی ہے ؛ پس اُس کو ہمارا گناہ کیونکر کہا جا سکتا ہے ؟ البتہ دعوی وجود گناہ ہے۔ اگر اہلِ راز سے اِس طرح کہا جاے تو وہ تسلیم کر سکتے ہیں"، مگر معلوم رہے کہ جن لوگوں کا یہ قول ہے کہ "وجودک ذنب" وہ ایک وجودِ واجب کے سوا اور کسی وجود کے قائل نہیں ہیں۔ وحدتِ وجود اُن کا اصلِ اصول ہے۔ پس اُن کے نزدیک وجودِ ماسوا عطیۂ حق نہیں ہے بلکہ وہم و خیالِ انسانی کے مخترعات میں سے ہے اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ "وجودک ذنب"۔ ۱۲

ویسا ہی گمنام خط ہے جیسے پہلے آچکے ہیں۔ لفافہ مجھکو دیا کہ اِسکو کھولکر پڑھو۔ میں جو دیکھتا ہوں تو فی الحقیقت سارا خط فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا کس کا خط ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اُسکے اظہار میں تامّل ہوا۔ فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگردِ معنوی کا لکھا ہوا ہے۔ پھر اوّل سے آخر تک خود پڑھا۔ اُس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی۔ مُسکرا کر کہنے لگے کہ "اِس اُلّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بُڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں، تاکہ اُسکو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں، کیونکہ اُسکو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچّے کو ماں کی گالی دیتے ہیں، کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرم ساق جو بہتّر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اِس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا؟

اِسکے بعد مَیں اُن سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ دوسرے روز حضرت نے ایک غزل لکھکر میرے پاس بھیجی۔ جس میں اگرچہ میرے نام اور تخلص کی تصریح نہ تھی لیکن اُسکے بعض مضامین اور اشارات سے معلوم ہوا کہ اُسمیں جو طعن و تعریض ہے وہ میرے ہی نسبت ہے۔ غزل یہ ہے

بمقصدے کہ مرآں را رہِ خرد اگویند | برو برو کہ ازاں سو بیا بیا گویند
کسیکہ پائے ندارد چگونہ راہ رود | خود اہلِ شرع دریں داوری چہا گویند
زرمزِ نخل انا اللہ گوسے۔ ناآگاہ | حدیثِ جلوہ گہ و موسیٰ و عصا گویند
مگر ز حق نبود شرم حق پرستاں را | کہ نام حق نبرند وہمیں انا گویند
ز قولِ شاں نبود دل نشینِ اہلِ نظر | جز آں صفات کہ از ذاتِ کبریا گویند
نخواندہ در کتب و ناشنیدہ از فقہا | بغیر لے مزہ واگویہ ہا کہ وا گویند

الحاح اور نصیحت کرنی شروع کی۔ چونکہ اُن کا شوق بات انتہا کے درجے کو پہنچ گیا تھا، اور اُن سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعہ سے کیا کرتی تھی۔ نماز پنجگانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا الکچر لکھکر اُن کے سامنے پیش کیا۔ جس میں اُن سے اِس بات کی درخواست تھی کہ آپ کھڑے ہو کر، یا بیٹھکر، یا ایما و اشارے سے، غرض جس صورت سے ہو سکے نماز پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی۔ مگر نماز ترک نہ ہو۔

مرزا کو یہ تحریک سخت ناگوار گذری۔ اور ناگوار گذرنے کی بات ہی تھی۔ خصوصاً اِس وجہ سے کہ انہیں دنوں میں لوگ گمنام خطوط میں اُن کے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کرتے رہتے تھے اور بازاریوں کی طرح کھلی کھلی گالیاں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب نے میری اِس تحریر کو دیکھکر جو کچھ فرمایا وہ سننے کے لائق ہے۔ انھوں نے کہا، ساری عمر فسق و فجور میں گذری۔ نہ کبھی نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا، نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں۔ اب اگر چند روز بیٹھکر، یا ایما و اشارے سے نماز پڑھی۔ تو اِس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیونکر ہو سکے گی۔ میں تو اِس قابل ہوں کہ جب مروں تو میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں۔ اور میرے پاؤں میں رسی باندھکر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں۔ اور پھر شہر سے باہر لیجا کر کتوں، اور چیلوں، اور کوؤں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اِس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔ "لا الہ الا اللہ"، "لا موجود الا اللہ"، "لا مؤثر فی الوجود الا اللہ"

شاید اُسی روز جب کہ یہ گفتگو ہو چکی تھی اور مرزا صاحب کھانا کھا رہے تھے۔ چٹھی رساں نے ایک لفافہ لا کر دیا۔ لفافہ کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے انکو یقین ہو گیا کہ کسی مخالف کا

گمنام خطوں میں گالیاں

جب یہ مقدمہ داخلِ دفتر ہوگیا ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خط متضمن
سب و شتم بھیجنے شروع کئے - جن میں شراب نوشی اور بد مذہبی وغیرہ پر سخت نفریں اور طعن و ملامت
لکھی ہوتی تھی - اُن دنوں میں مرزا کی عجب حالت تھی ؛ نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے - اور
جب چٹھی رساں ڈاک لیکر آتا تھا تو - اِس خیال سے کہ مبادا کوئی اسی قسم کا خط نہ آیا ہو - اُن کا چہرہ
متغیر ہوجاتا تھا - اتفاق سے اُنھیں دنوں میں نواب مصطفے خاں مرحوم کے ہمراہ میرا دلی میں
آنا ہوا - چونکہ مجھکو ان نالائق گمنام خطوں کے آنے کا حال معلوم نہ تھا ؛ ایک روز مجھسے ایک
ایسی غلطی ہوگئی جس کے تصور سے مجھکو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے - یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی و سنیدی
کے نشے میں سرشار تھے - خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو ، اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں
میں سے اہلِ سُنت کو ، اور اہلِ سُنت میں سے صرف حنفیہ کو ، اور اُن میں سے بھی صرف اُن لوگوں
کو جو صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکامِ ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں ؛ نجات اور مغفرت
کے لائق جانتے تھے - گویا دائرۂ رحمتِ الٰہی کو کوئن وکٹوریا کی وسعتِ سلطنت سے بھی - جس میں
ہر مذہب اور ملت کے آدمی بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں - زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے
تھے - جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا تھا اُسی قدر اس بات کی تمنا ہوتی تھی کہ اُسکا
خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات اور مغفرت کے لئے ناگزیر ہے - چونکہ مرزا کی ذات
کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجۂ غایت تھا اس لئے ہمیشہ اُنکی حالت پر افسوس آتا تھا - گویا یہ سمجھتے تھے
کہ روضۂ رضواں میں ہمارا اُن کا ساتھ چھوٹ جائیگا ؛ اور مرنے کے بعد پھر اُن سے ملاقات نہو سکیگی -
ایک روز مرزا کی بزرگی ، اُستادی ، اور کبرسنی کے ادب اور تعظیم کو بالائے طاق رکھکر خشک مغز واعظوں کی

راقم کے ساتھ مرزا کا معاملہ

تمام فرہنگ نگاروں نے قراز کو اضداد میں شمار کیا ہے۔ اِسکی بابت مرزا لکھتے ہیں کہ " اسکو امرِ جامع قرار دینا ویسا ہی اجماع ہے جیسا کہ اہلِ شام نے خلافتِ یزید پر اجماع کیا تھا "

صاحب برہان کی چند عامیانہ غلطیاں اور اُسکے بیان کی بے ربطیاں ظاہر کرنے کے بعد ایک جگہ لکھتے ہیں " خدا پرستاں ! از بہرِ خدا ایں عربی مفہم فارسی ندان (یعنی جامع برہان) نمی پرسم کہ کیست؟ می پرسم کہ چیست ؟ ایک اور جگہ نہایت طیش میں آکر لکھتے ہیں " چوں شناسائی حقیقتِ جوہرِ لفظ ندارد و فرہنگ چرا می نگارد ؟ بوریا می بافت ، رسن می تافت ، ہیزم می فروخت ، گلخن می افروخت "

مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مؤلف پر۔ جو قاطع برہان کے جواب میں لکھا گیا تھا ، اور جو فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ ازالۂ حیثیتِ عرفی کی نالش بھی کی تھی ؛ مگر جب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخرکار اُنھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا۔ اثنائے تحقیقات میں دلی کے بعض اہلِ علم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لئے بُلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے ہیں آیا فی الواقع اُن سے فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں ؟ اُنھوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لئے اُن فقروں کے ایسے معنی بیان کئے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہو۔ اِن مولویوں کا مرزا سے ملنا جُلنا تھا۔ کسی نے پوچھا حضرت ! اُنھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی ؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا

بہر چہ در نگری جز بجنس مائل نیست   عیارِ* بے کسیِ من شرافتِ نسبی ست

---

* یعنی میری بیکسی کی وجہ شرافت نسبی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے چونکہ شرافتِ نسبی میں کوئی میرا ہمجنس نہیں ہے اس لئے کوئی میرا ساتھ نہیں دیتا ۱۲

گر چنیں با ہندیاں دارد تولا در سخن — من ہم از ہندم چرا از من تبرا کردہ است

مطلب از بد گفتنِ من چیست ؟ گویا نیک مرد — مُرد ایں کار از حق - آمرزش تمنا کردہ است

صاحبِ علم و ادب ! وانگہ ز افراطِ غضب — چوں سفیہاں دفترِ نفرین و ذم وا کردہ است

در جدل دشنام کارِ سوقیاں باشد - بلے ! — ننگ دارد علم ازاں کارے کہ آغا کردہ است

انتقامِ جامعِ برہانِ قاطع می کشد — آں چہ ما کردیم با وے خواجہ بابا کردہ است

من سپاہی زادہ ام گفتارِ من باید درشت — وائے بر وے گر بتقلیدِ من اینہا کردہ است

زشت گفتم - لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام — شوخیِ طبعے کہ دارم ایں تقاضا کردہ است

میکند تائیدِ برہاں لیک برہاں ناپدید — نیست جز تسلیمِ قولش ہر چہ انشا کردہ است

سستیِ طرزِ خرامِ خامۂ برہاں نگار — یا نمیدانست یا دانستہ اخفا کردہ است

بہرِ من توہین و بہرِ خویش تحسیں جا بجا — ہم مرا، ہم خویش را، در دہر رسوا کردہ است

یافتم از دیدنِ تاریخہائے آں کتاب — خود بدم گفت و بہ احبابِ خود ایما کردہ است

غازیاں ہمراہِ خویش آورد از بہرِ جہاد — تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است

قاطع برہان اور اُسکے متعلق مرزا کی جس قدر تحریریں ہیں اُن میں اعتراضوں اور جوابوں کے علاوہ بہت سے بیش بہا فائدے اور لطیف و دلچسپ حکایتیں اور لطائف و تُرہات بھی درج ہیں ۔

لطیفہ

لفظِ فراز کو صاحبِ برہان اضداد میں سے گنتا ہے اور فراز کردن کے معنی بند کرنا اور کھولنا دونو بتاتا ہے - مگر مرزا اسکو اضداد میں نہیں گنتے ؛ بلکہ اُسکے معنی صرف بند کرنے کے بتاتے ہیں ؛ اور جو اشعار مخالفوں نے سند میں پیش کیے ہیں مرزا نے اُنھیں اشعار سے اپنے دعوے کی تائید کی ہے ۔ مگر چونکہ ہندستانیوں کے

اور ان جوابوں میں زیادہ تر ظرافت اور شوخیٔ طبع سے کام لیا ہے۔ کہیں اُنکے طرزِ بیان کا خاکا اُڑایا ہے کہیں اُس کی تحقیقات کا مضحکہ کیا ہے۔

مولوی امین الدین کی کتاب "قاطع قاطع" کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا؛ کیونکہ اُسمیں فحش اور ناشایستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا حضرت! آپ نے اُسکا کچھ جواب نہیں لکھا۔ مرزا نے کہا "اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے، تو کیا تم بھی اُسکے لات مارو گے؟

ایک شخص مرزا احمد علی بیگ، متوطنِ کلکتہ ہیں؛ جنھوں نے مرزا کے خلاف ایک مبسوط کتاب مؤید البرہان لکھی ہے؛ جسکے لکھتے وقت تمام ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ قاطع برہان کے چند اوراق کی تردید کے لئے چھان مارا ہے۔ اور مثل اور مجیبوں کے مرزا کے کسی اعتراض کو تسلیم نہیں کیا۔ اور جو سبک الفاظ مرزا نے صاحب برہان کی نسبت استعمال کئے تھے ویسے ہی الفاظ مرزا کی نسبت استعمال کئے ہیں۔ اپنے تئیں اصفہانی الاصل قرار دیا ہے اور ٹیک چند بہار اور قتیل کی بہت تعریف کی ہے اور اپنی کتاب کی تعریف میں تقریظیں اور تاریخیں لکھوا کر کتاب کے آخر میں چھپوائی ہیں اُسکے جواب میں مرزا نے ایک رسالہ موسوم بہ تیغِ تیز لکھا ہے؛ اور ایک فارسی قطعہ بھی اُن کو لکھکر بھیجا ہے۔ جسکے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں، جو لطف سے خالی نہیں۔

خواجہ را از اصفہانی بودنِ آبا چہ سود	خالقش در کشورِ بنگالہ پیدا کردہ است
با قتیل و جامعِ برہان و لالہ ٹیک چند	لا بہ† و شوگیری و لطف و مدارا کردہ است
داوری گاہے* بنا فرمود و در وے ہر سہ را	منصف و صدر امین و صدرِ اعلیٰ کردہ است

† لابہ خوشامد: شوگیری طرفداری ۱۲ * داوری گاہ محکمہ ۱۲

محققوں نے اُسکی نسبت ظاہر کی ہے، اور جو غلطیاں اور بے ربطیاں مرزا نے برہان میں بتائی ہیں وہ اور اُنکے سوا اور بے شمار غلطیاں صاحب فرہنگ ناصری نے اُسمیں نشان دی ہیں۔ اس سے زیادہ ایک ہندوستانی محقق کی سلامتی طبع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟

مرزا نے قاطع برہاں کے اخیر میں چند فوائد لکھے ہیں؛ اُنہیں سے فائدۂ اول کا ماحصل یہ ہے کہ "ان فوائد کے پیش کرنے میں چونکہ خود نمائی کی بو آتی ہے اس لئے شاید لوگ یہ کہیں کہ خود ہندوستانی ہو کر اور ہندوستانیوں کو مسلّم نہ جاننا اور خود زباندانی کا دعوے کرنا بے معنی ہے۔ سو میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا دادا توراں سے آیا تھا، اور میرا باپ دلّی میں پیدا ہوا، اور میں آگرے میں۔ حاشا کہ میں اپنے تئیں اہلِ زبان سمجھتا ہوں مگر بلاشبہ زباندان ہوں اور میری زباندانی اولاً خداداد سلامتی طبع کی بدولت ہے؛ جو غلطی کو قبول نہیں کرتی اور بغیر سچائی کے تسلی نہیں پاتی۔ دوسرے اس وجہ سے ہے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرۃً مناسب واقع ہوئی ہے۔ تیسرے مولانا عبد الصمد کے فیضِ صحبت سے جو مجھکو دو برس تک برابر حاصل رہا۔ چودہ برس کی عمر میں میں نے اُس سے تربیت پائی؛ اور بارہ برس مشقِ سخن کی۔ اب کہ مجھکو چھیاسٹھواں سال ہے۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں۔ اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ کہ ان باون برسوں میں اُسنے کس قدر معنی کے دروازے مجھپر کھولے ہیں؛ اور میری فکر کو کس درجہ کی بلندی بخشی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا؛ اور زیادہ تر افسوس یہ کہ وہ شانِ ایزدی کی شناخت سے محروم رہے؛ اور میری نظم و نثر کے کرشموں کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ گویا نظیری جنّت آرامگاہ کا مقطع میرے حسبِ حال ہے۔

"تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح   باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ"

جتنے آدمیوں نے قاطع برہاں کے جواب لکھے ہیں اُن میں سے بعض کے جواب مرزا نے بھی لکھے ہیں

از وے آید "، اسی طرح برہان کی اکثر مثل عبارتیں نقل کرکے اُسپر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ " در ولایت ہند
کہ نہ ترکی دانند و نہ پارسی ضابطہ و تنبیع لغات فارسی کے توانند "، ایک جملہ صاحب برہان جامع (جو کہ ایرانی ہیں)
کا قول برہان قاطع کے باب میں نقل کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ " برہانِ قاطع میں لغات بغیر سند اور
شواہد کے ذکر کئے گئے ہیں ؛ اُنپر اعتبار نکرنا چاہیئے ۔ اُسمیں کنایات کو بھی علحدہ لغت قرار دیتا ہے ،
اور سریانی و عبرانی و ترکی و ژند و پاژند کے غیر مستعمل لغات کے بیان میں ، اور ایک ایک لغت کو بار
بار مختلف صورتوں سے ذکر کرنے میں ؛ تطویلِ لاطائل کرتا ہے "، اسکے بعد رضا قلی ۔ صاحبِ برہان
جامع کی تصدیق ، اور اُسکے ساتھ اتفاق رائے ، کرتا ہے ۔ چونکہ مرزا کی لائف میں یہ بیان بے مزہ
معلوم ہوگا اس لئے ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں جس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو وہ ہنگامہ
کو خود ملاحظہ کرے ۔

اگرچہ مرزا نے قاطع برہان میں بعض اعتراض غلط کئے ہیں ؛ خصوصاً لفظِ افسوس کے متعلق
ایک بڑی فاحش غلطی کی ہے ۔ کہ اُسکو لفظ عربی الاصل ماخوذ از اسف قرار دیا ہے ۔ اور اس غلطی کا
انھوں نے آخر کار خود بھی اعتراف کیا ہے ۔ اور عربی الفاظ کی تحقیق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے ،
اور ممکن ہے کہ اسکے سوا اور بھی کہیں کہیں اُن سے غلطی ہوئی ہو ؛ لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے
تو قاطع برہان کے دیکھنے سے مرزا کی سلامتیِ طبع اور ذوقِ صحیح کا کافی ثبوت ملتا ہے اور ۔ جیسا کہ
وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ وہ فارسی زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں
جیسے فولاد میں جوہر " فی الواقع فارسی زبان سے اُن کو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے ۔ جو رائے
کہ انھوں نے محض اپنے وجدانِ سلیم کی ہدایت سے برہان کی نسبت قائم کی تھی وہی رائے ایران کے

تینوں کی غلطیوں اور لغزشوں کے بیان میں منعقد کیا ہے اور اُسکے بعد ایک باب میں صرف
برہانِ قاطع کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اندلس ایک جزیرہ ہے ایک پہاڑ کے اوپر، یا
غرناطہ ایک صوبہ ہے ہندوستان کا، یا چپکاک کے تین معنی لکھے ہیں؛ پشیانی، قبالہ نویس،
اور مہرکن (اور یہ تینوں معنی غلط لکھے ہیں) یا کروخ جو ایک قریہ ہے مضافات ہرات میں اُسکو
برہان میں لکھا ہے - قریہ ایست از قرائے عالم۔ یہاں ازراہِ طنز صاحبِ فرہنگِ ناصری لکھتا
ہے "فی الحقیقت تحقیقے دقیق فرمودہ است" اسی طرح بہت سی غلطیاں صاحبِ برہان کی اِس
باب میں ظاہر کی ہیں۔ اور اِسکے سوا اپنی تمام فرہنگ میں جابجا اُسکا تخلیہ کیا ہے۔

جو اعتراض مرزا نے برہان پر وارد کئے ہیں؛ اُنکی بھی جابجا فرہنگِ ناصری سے تائید ہوتی
ہے۔ ازاں جملہ لفظ آبچیں، استخر و اصطخر، چدر، باختر، راوش و زاوش، کارکیا،
ویژہ و اویژہ، اور اِسی طرح کے اور بہت سے الفاظ کی تحقیق فرہنگِ ناصری میں مرزا کے
بیان کے مطابق پائی جاتی ہے۔ اِسکے سوا برہان کے بیان کو جہاں مرزا نے بے معنی اور مہمل
بتایا ہے؛ رضا قلی خاں بھی اُسکو مہمل بتاتا ہے۔ مثلاً لفظ انجکک کی تفسیر میں صاحبِ برہان
لکھتا ہے "ہر چند فراشِ خیال جاروبِ سنبل بر جل خرسک ریش زند از پوست آں پاک تواند"
مرزا اِسکی نسبت لکھتے ہیں "فقرۂ اخیر نگر کلامِ دیوست؛ ہرگاہ خوبیِ تحقیق چناں و حسنِ عبارت
چنیں باشد مقصودِ اصلی کہ معلوم کردنِ مجہولاتست از برہانِ قاطع چگونہ حاصل تواں کرد" رضا قلی
ازراہِ طنز اِسی فقرے پر یہ لکھتا ہے "دریں مقام ایں انشائے بدیع و بیانِ بلیغ زادۂ طبعِ لئیمِ
بودہ۔ برہانِ ذوقِ سلیم و سلیقۂ مستقیم صاحبِ برہان خود ہمیں عبارات بس است۔ تا از ینگ سیس

مخالفت ہوئی، مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مرزا۔ صاحبِ برہان کی نسبت ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی۔ کیونکہ ہندوستان کے پُرانے تعلیم یافتہ۔ جو آج کل ایک نہایت کس مپرس حالت میں ہیں۔ اُنکے لئے کنجِ خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اِسکے سوا باقی نہیں رہا کہ کسی سربرآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا ردّ لکھیں اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔

جو رسالے قاطع برہان کے جواب میں لکھے گئے ہیں جب اُن کو سرسری نظر سے دیکھا جاتا ہے تو مرزا کے اعتراضوں کے اکثر جواب بہت صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ایک مجیب برہان کی تائید اِسطرح کرتا ہے کہ جس طرح صاحبِ برہان نے لغت کی تحقیق کی ہے؛ اِسی طرح فرہنگ جہانگیری، یا فرہنگ رشیدی، یا سراج اللغات، یا مؤید الفضلاء، یا ہفت قلزم، یا کسی اور فرہنگ میں لکھا ہے۔ اور اِس سے بادی النظر میں صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا اعتراض غلط ہے۔ مگر جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فارسی لغات کی اکثر فرہنگیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں، اور جو فرہنگ سب سے پہلے لکھی گئی تھی پچھلوں نے زیادہ تر اُسیکا تتبع کیا ہے؛ تو کسی مجیب کے جواب کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی۔

ایران کے ایک مشہور مصنف رضا قلی خاں ہدایت نے ۱۲۸۸ھ میں یعنی مرزا کی وفات سے چار برس بعد فارسی لغت کی ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ جو فرہنگِ ناصری کے نام سے موسوم ہے، اور مرزا کی وفات سے دس بارہ برس بعد ہندوستان میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ فارسی لغات کے متعلق جو کچھ اُسنے لکھا ہے وہ بہرحال اُن فرہنگ نگاروں کی تحقیقات سے۔ جنھوں نے ہندوستان میں بیٹھکر فارسی لغت کی کتابیں لکھی ہیں۔ زیادہ معتبر اور زیادہ اطمینان کے لائق ہوگا۔ اُسنے اپنی فرہنگ کے شروع میں ایک باب فرہنگ جہانگیری، فرہنگِ رشیدی، اور برہانِ قاطع،

لغزشیں اور بے ربطیاں ہیں جو بغیر اسکے کہ درفش کاویانی کو اوّل سے آخر تک دیکھا جاے ذہن نشیں نہیں ہو سکتیں۔

جس وقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے نہ اُس وقت اُنکے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ لغات تھی، اور نہ کوئی اور ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیقِ لغت کی بنیاد رکھی جاتی۔ پس جو کچھ اُنھوں نے لکھا یا محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر اور یا ذوق و وجدان کی شہادت سے لکھا۔ باایں ہمہ چند مقامات کے سوا۔ جہاں فی الواقع مرزا سے لغزش ہوئی ہے، اور بعض غلطیوں کا اُنھوں نے خود بھی اقرار کیا ہے۔ اُنکے تمام ایراد واجبی معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ درفشِ کاویانی لکھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ فضلاے کلکتہ کی مصححہ و مطبوعہ برہان مرزا کے پیشِ نظر تھی۔

قاطع برہان کی مخالفت

اِس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ہر کس و ناکس مرزا کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ ایک قاطع برہان کے جواب میں مُحرقِ قاطع، قاطعِ قاطع، مؤید برہان، ساطع برہان وغیرہ چند رسالے لکھے گئے۔

مخالفت کی وجہ

مخالفت کی وجہ ظاہر ہے۔ تقلید نہ صرف امورِ مذہبی میں بلکہ ہر چیز، ہر کام، ہر علم، اور ہر فن میں ایسی ضروری شے ہو گئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خطور کرتا ہے؛ اور نہ کسی دوسرے کو اِس قابل سمجھا جاتا ہے کہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے۔ جو کتاب سَو دو سَو برس پہلے لکھی جا چکی ہے وہ وحیِ مُنزل کی طرح واجب التسلیم سمجھی جاتی ہے۔ پس مرزا کے اعتراضات برہانِ قاطع پر کیسے ہی صحیح اور واجبی ہوتے؛ ممکن نہ تھا کہ اُنکی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کیجاتی۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہے کہ مرزا نے جو ازراہ شوخی طبع کے صاحب برہان کا جابجا خاکہ اُڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظِ ناملائم بھی غیظ و غضب میں اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں زیادہ تر اِس وجہ سے

نام درفشِ کاویانی رکھا۔

یہاں دو چار مثالیں اُن الفاظ کی دینی مناسب معلوم ہوتی ہیں جن پر مرزا نے صاحب برہان کا تخطیہ کیا ہے۔ مثلاً صاحب برہان نے عنبر ارزاں کے معنی گیسوے رسول مقبول کے لکھے ہیں؛ اور پھر کہتا ہے کہ اُسکو عنبر لرزاں بھی کہتے ہیں۔ مرزا صاحب برہان کی غلطی کا منشا یہ بتاتے ہیں کہ اُسنے نظامی کا یہ شعر دیکھا ہے جو نعت میں ہے "بوے گراں عنبر لرزاں دہی ❊ گر بدو عالم دہی ارزاں دہی ❊" پس عنبر لرزاں میں استعارہ کو اصلی لغت قرار دیا اور دوسرے مصرع میں ارزاں کے موقع اور محل کو بالکل نہیں سمجھا اور آنحضرتؐ کی زلفِ عنبر بو جو دو نو جہان کے بدلے میں بھی ارزاں ہو اُسکا نام عنبر ارزاں رکھدیا۔ یا مثلاً برہان میں لکھا ہے "قافلہ شد بمعنی قافلہ رفت یعنی قافلہ سالار رفت کہ کنایہ از فوت شدنِ پیغمبر باشد،، اوّل تو قافلہ شد کو ایک لغت قرار دینا ہی بے معنی ہے پھر اُسکے معنی قافلہ سالار رفت کہنا اور قافلہ سالار کے جانے سے وفات سرورِ کائنات مراد لینا غلط در غلط اور خبط در خبط ہے مرزا غلطی کا منشا مولانا نظامی کے اِس شعر کو بتاتے ہین "قافلہ شد واپسیِ ما ببیں ❊ اے کسِ ما بیکسیِ ما ببیں ❊" یہ شعر مخزنِ اسرار کی مناجات میں واقع ہوا ہے مگر مرزا نے سہو سے اِسکو جامی کی طرف منسوب کیا ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دوست اور رفیق اور ساتھی سب چل دیے اب تیرے سوا کوئی ہمارا یار و مددگار نہیں ہے یا مثلاً صاحب برہان لکھتا ہے کہ "شش ضرب نتیجہ خوب کنایہ از گوہر و زر باشد و کنایہ از شکر و کنایہ از شکر و عسل و اقسام میوہ ہا ہم ہست و بحذف ضرب ہم بنظر آمدہ کہ شش نتیجہ خوب باشد،، مرزا نے جو اِسکا خاکا اُڑایا ہے وہ طول طویل ہے خلاصہ یہ ہے کہ اِس مرکب اور بے سر و پا جملہ کو لغت قرار دینا صاحب برہان ہی کا کام ہے اور اِس طرح کے صدہا الفاظ ہیں جن پر مرزا نے گرفت [illegible] کی ہے اور اِس طرح کی

نے سو روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لئے مرزا کے واسطے مقرر کر دیا۔ جو نواب کلب علی خاں مرحوم نے
بھی بدستور مرزا کے اخیر دم تک جاری رکھا۔ اور غدر سے تین برس بعد جب مرزا ہر ایک الزام
سے بری ثابت ہوئے سرکاری پنشن بھی جاری ہو گئی۔

لطیفہ
جب نواب یوسف علیخاں کا انتقال ہو گیا اور مرزا تعزیت کے لئے رام پور گئے چند روز بعد
نواب کلب علیخاں مرحوم کا نواب لفٹنٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا آنکی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود
تھے چلتے وقت نوابصاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا "خدا کے سپرد" مرزا نے کہا حضرت۔
خدا نے تو مجھے آپکے سپرد کیا ہے آپ پھر اُلٹا مجھکو خدا کے سپرد کرتے ہیں"

قاطع
جب مرزا دستنبو کو ختم کر چکے، اور اب بھی تنہائی اور سناٹے کا وہی عالم رہا؛ اُس وقت سوا اسکے
اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس اور رفیق سمجھیں، اور کچھ لکھ پڑھکر اپنا غم غلط کریں۔ اور دل بہلائیں۔
مرزا پاس اُس وقت سوائے برہانِ قاطع اور دساتیر کے کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ برہان کو اُٹھا کر
سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں۔ پھر زیادہ غور سے
دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی۔ ایک ایک لفظ متعدد فصلوں میں مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا۔ شعرا
نے جو الفاظ بطور مجاز و کنایہ کے استعمال کئے ہیں اُن کا ذکر بطور مستقل لغات کے دیکھا۔ طریقۂ بیان اکثر
بھونڈا اور اصولِ لغت نگاری کے خلاف پایا۔ بہت سے لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی جسکے معنی بالکل
سمجھ میں نہ آئے۔ مرزا نے یادداشت کے طور پر جو مقام قابلِ اعتراض نظر آئے اُنکو ضبط کرنا شروع
کیا۔ شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی۔ جسکا نام قاطع برہان رکھا گیا، اور ۱۲۷۶ھ میں چھپ کر
شائع ہو گئی۔ پھر مرزا نے ۱۲۸۲ھ میں باضافۂ دیگر مضامین و فوائد اُسکو دوسری بار چھپوایا اور اُسکا

ہوگئے تھے۔ شہر کے تمام مسلمان عمائد۔ جو مرزا کے دوست اور عزیز تھے۔ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے۔
اسکے سوا گھر میں جس قدر بی بی کے پاس زیور یا کوئی اور قیمتی چیز تھی؛ جب شہر لٹنے لگا۔ تو وہ دوسری
جگہ گاڑنے دابنے کے لئے بھیج دیا؛ جہاں سے فتحمند سپاہ نے کھود کر سب نکال لیا۔ مگر مرزا نے
اس تنگی وعسرت کی حالت میں بھی اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا، اور جو حالت
اُنپر اور اُنکے متعلقین پر خوش وناخوش گذری اُسمیں نوکر بھی برابر شریک رہے۔ نوکروں کے علاوہ
جن لوگوں کے ساتھ مرزا امن کے زمانے میں ہمیشہ سلوک کرتے تھے وہ اس حالت میں بھی مرزا کو
ستاتے تھے اور چار ناچار اُنکی بھی مرزا کو خبر لینی پڑتی تھی۔ مرزا لکھتے ہیں کہ "اس ناداری کے
زمانے میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا، اور بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا گویا اور لوگ
روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا" اسکے بعد کتاب کو اس طرح ختم کرتے ہیں کہ "اس بازیچۂ
اطفال یعنی کتاب دستنبو۔ کے لکھنے میں کب تک خامہ فرسائی کیجائے؛ جو حالت کہ اس وقت
درپیش ہے ظاہر ہے؛ کہ اُسکا انجام یا موت ہے، یا بھیک مانگنا۔ پہلی صورت میں یقیناً یہ داستان
ناتمام رہنے والی ہے، اور دوسری صورت میں نتیجہ اسکے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؛ کہ کسی دکان
سے دھتکارے گئے، اور کسی دروازے سے کوڑی پیسا کچھ مل گیا۔ پس اپنی ذلت و رسوائی
کے سوا اب اُسمیں لکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔ قدیم پنشن اگر مل بھی گئی تو بھی کام چلتا نظر نہیں آتا،
اور نہ ملی تو تو کام ہی تمام ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دونو صورتوں میں۔ چونکہ اس شہر کی آب وہوا اب
خستہ دلوں کو راس آتی معلوم نہیں ہوتی۔ ضرور شہر چھوڑنا اور کسی اور بستی میں جاکر بسرام کرنا پڑیگا"
غدر کے بعد دو دو برس تک مرزا کا یہی حال رہا۔ مگر دو برس بعد نواب یوسف علیخاں مرحوم نئیس رامپور

اگرچہ فتح دہلی کے بعد مہاراج پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمود خاں مرحوم اور اُنکے ہمسایوں کے مکان پر۔ جسمیں ایک مرزا بھی تھے۔ حفاظت کے لئے پہرہ بیٹھ گیا تھا؛ اس لئے وہ فتحمند سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے؛ مگر پھر بھی اُنکو طرح طرح کی کلفتیں اُٹھانی پڑیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو تیس برس کی عمر میں دیوانے ہوگئے تھے، اور اخیر دم تک اُسی حالت میں رہے؛ جب مرزا نے دلی میں سکونت اختیار کی تو اُنکو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آئے تھے۔ مرزا کے مکان سے اُنکا مکان تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر تھا۔ ایک دربان اور ایک کنیز۔ کہ دونو عمر رسیدہ تھے۔ اُنکے پاس رہتے تھے۔ جب دلی فتح ہوگئی، اور شہر اہل دہلی سے خالی ہوگیا، اور رستے بند ہوگئے؛ اُس وقت مرزا بھائی کی طرف سے سخت پریشان رہنے لگے۔ بھائی کے کھانے پینے سونے مرنے اور جینے کی مطلق خبر نہ تھی۔ ایک روز یہ خبر آئی کہ مرزا یوسف کے مکان میں بھی کچھ سپاہی گھس آئے تھے، اور جو کچھ اسباب ملا۔ لے گئے۔ پھر ایک دن وہی بڈھا دربان جو مرزا یوسف کی ڈیوڑھی پر رہتا تھا یہ خبر لایا کہ پانچ روز سخت تپ میں مبتلا رہکر آج آدھی رات گذرے مرزا یوسف کا انتقال ہوگیا۔ اُس وقت نہ کفن کے لئے کپڑا بازار میں مل سکتا تھا؛ نہ غسال اور گورکن کا کہیں پتا تھا، نہ شہر سے قبرستان تک جانا ممکن تھا؛ مگر مرزا کے ہمسایوں نے اُنکی بڑی مدد کی۔ پٹیالہ کی فوج کے ایک سپاہی کو۔ جو حفاظت کے لئے تعینات تھا۔ اور مرزا کے دو آدمیوں کو ساتھ لیا؛ اور مرزا صاحب کے ہاں سے دو سفید چادریں لیکر مرزا یوسف کے مکان پر پہونچے۔ اور بعد غسل اور تجہیز و تکفین کے مسجد کے صحن میں۔ جو مکان کے قریب تھی۔ دفن کردیا۔ مرزا نے دستنبو میں اس مقام پر یہ اشعار لکھے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ مرزا کی وفات کے بعد دونو تھوڑے تھوڑے فاصلے سے جوان عمر میں فوت ہو گئے۔

زین العابدین خاں عارف سے مرزا صاحب کو غایت درجے کا تعلق تھا۔ کچھ تو قرابت کے سبب، اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے، اور باوجود پُرگوئی کے نہایت خوش گو تھے، اُنکو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اسی لئے جب وہ جوان عمر میں فوت ہو گئے تو مرزا اور اُنکی بی بی پر سخت حادثہ گذرا۔ مرزا نے اُنکے مرنے پر ایک غزل بطور نوحہ کے لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے۔ چنانچہ اُسکے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملینگے — کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھسے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گذری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش؟ — کرنا تھا جواں مرگ! گذارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب! — قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

غدر کے زمانے میں مرزا دلّی سے بلکہ گھر سے بھی باہر نہیں نکلے۔ جونہیں بغاوت کا فتنہ اُٹھا اُنھوں نے گھر کا دروازہ بند کر لیا، اور گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کئے۔

عارف کا مرثیہ

غدر کے زمانے میں تنہائی

ہو رہا تھا ۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی ۔ مرزا نے کہا "فیضی کو جیسا
لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے" اِسپر بات بڑھی ۔ اُس شخص نے کہا فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے
روبرو گیا تھا ۔ اُسنے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً کہکر پڑھا تھا ۔ مرزا بولے "اب
بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں" مخاطب
نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اِس ڈلی پر کچھ ارشاد
ہو ۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اُسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا ۔ جو کہ اُنکے دیوانِ ریختہ میں موجود
ہے ۔ اور جسکا پہلا شعر یہ ہے ۔

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی　　　زیب دیتا ہے اِسے جس قدر اچھا کہیے

اولاد

مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی ۔ ابتدا میں سات بچے پے درپے ہوئے ؛ مگر کوئی زندہ نہیں رہا
اِس لئے ایک مدت سے وہ اور اُنکی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے ۔ مگر غدر سے چند سال پہلے جبکہ
اُنکی بی بی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہو گیا ، اور اُنکے دو نو بچے ایک باقر علیخاں
اور دوسرے حسین علیخاں صغیر سن رہگئے ۔ تو مرزا اور اُنکی بی بی نے چھوٹے لڑکے حسین علیخاں کو جو
اُس وقت بہت کم عمر تھا اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ۔ مرزا حسین علیخاں کو حقیقی اولاد سے
بھی کچھ بڑھکر عزیز رکھتے تھے اور کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے اور حد سے زیادہ ناز برداری
کرتے تھے ۔

جب زین العابدین خاں کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو حسین علیخاں کے بڑے بھائی باقر علیخاں
کو بھی مرزا نے اپنی سرپرستی میں لے لیا ۔ یہ دونو خوش فکر اور اہل اور نیکخو اور نہایت شریف مزاج تھے

با وبستہ وحشت شبہ ناپدیدار، ونامش بعنوانِ بے نشانی در مہرِ نیم روز آشکار - ماند"

اصلاح اشعار بادشاہ

۱۲۷۱ہجری میں - جبکہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہوگیا - بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہوگئی تھی - مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس کام کو بادلِ ناخواستہ سرانجام کرتے تھے۔ ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوانِ عام میں بیٹھے تھے کہ چوبدار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں - مرزا نے کہا ذرا ٹھیر جاؤ؛ اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذ رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں وہ لے آؤ۔ وہ فوراً لے آیا - مرزا نے جو اُسکو کھولا تو اُس میں سے آٹھ نو پرچے - جن پر ایک ایک دو دو مصرع لکھا ہوا تھا؛ نکالے - اور اسی وقت دوات قلم منگوا کر اُن مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں؛ اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام وکمال لکھکر چوبدار کے حوالے کیں - ناظر مرحوم کہتے تھے کہ ان تمام غزلوں کے لکھنے میں اُن کو اس سے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ایک مشاق اُستاد چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دیکر درست کردے - جب چوبدار غزلیں لیکر چلا گیا تو مجھسے کہا کہ حضور کی کبھی کبھی کی فرمائشوں سے آج مدت کے بعد سبکدوشی ہوئی ہے اگرچہ مرزا صاحب جو کچھ اپنی طرزِ خاص میں لکھتے تھے - نظم ہو یا نثر - اُسکو بڑی کاوش اور جانکاہی سے سرانجام کرتے تھے؛ چنانچہ خود اُنھوں نے جابجا اسکی تصریح کی ہے؛ مگر جب کبھی اپنی خاص روش پر چلنے کی ضرورت نہوتی تھی اُس وقت اُن کو فکر پر زیادہ زور ڈالنا نہیں پڑتا تھا۔

سرعتِ طبیعت

۱۲۴۴ع میں - جبکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے ہیں - مولوی محمد عالم مرحوم نے - جو کلکتے کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے - نواب صاحب سے بیان کیا کہ - جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے - ایک مجلس میں - جہاں مرزا بھی موجود تھے، اور میں بھی حاضر تھا - شعرا کا ذکر

اور مرزا اُن تمام مطالب کو اپنی طرز خاص کی فارسی نثر میں بیان کریں۔ اور کتاب دو حصوں پہ تقسیم کی جائے۔ پہلے حصے میں کچھ مختصر حال ابتدائے آفرینش سے صاحبقران تیمور گورکان تک، اور کسی قدر مفصل حالات تیمور سے نصیر الدین ہمایوں کے اخیر زمانے تک بیان کئے جائیں۔ اور دوسرے حصے میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لیکر سراج الدین بہادر شاہ کے زمانے تک تمام واقعات شرح و بسط کے ساتھ درج کئے جائیں۔ مرزا نے تمام کتاب کا نام **پرتوستان** اور اُسکے پہلے حصے کا نام مہر نیم روز اور دوسرے حصے کا نام ماہِ نیم ماہ تجویز کیا تھا۔ اُن کو اپنی دو ترکیبوں پر ناز تھا؛ ایک ماہِ نیم ماہ اور دوسرے **رستخیز بیجا**†۔ مرزا کہتے تھے کہ چودھویں رات کے چاند کو ماہِ چہاردہ اور ماہِ دو ہفتہ تو پہلے لوگوں نے اکثر باندھا ہے؛ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ماہِ نیم ماہ کسی نے نہیں باندھا۔ یہ ترکیب خاص میری تراشی ہوئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ دوسرا حصہ یعنی ماہِ نیم ماہ۔ بالکل نہیں لکھا گیا۔ مہر نیم روز ختم ہونے کے بعد مرزا نے ذرا آرام لینے کے لئے چند روز توقف کیا تھا اور ارادہ تھا کہ جلد دوسرا حصہ شروع کریں کہ اتنے میں غدر ہوگیا اور اُس حصے کا صرف نام ہی نام رہ گیا۔

حیدرآباد سے ایک صاحب نے مرزا سے ماہِ نیم ماہ کو طلب کیا تھا اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "ماہِ نیم ماہ اسمیست کہ مسمّیٰ ندارد۔ چوں از سرنوشت گردن نتواں پیچید سرگذشت باز گویم ہرگاہ یک نیمہ از پرتوستان انجام یافت، و مہر نیم روز نام یافت، لختے در رنگ ورزیدہ شد، تا نفس راست کردہ آید۔ ناگاہ کار غم ما را روز فرو رفت، و روزگار سر آمد؛ و دولت دیرینۂ ترکمانانِ قراچاریہ سپری گشت۔ ماہِ نیم ماہ ہیچوں

† رستخیز بے جا غدر کی تاریخ کا مادہ ہے۔ اس میں رستخیز کے اعداد یعنی ۱۲۷۷ میں سے جا کے عدد یعنی (۴) کا تخرجہ کیا ہے ۱۲

بہرۂ اہل جہاں چوں زجہاں درد و غم ست — بہرۂ من زجہاں بیشتر آمد گوئی

خستن و بستن من چند عسس نیست - بر و — بر من اینہا ز قضا و قدر آمد گوئی

ہنرم را نتواں کرد بہ خستن ضائع — خستگی غازۂ روئے ہنر آمد گوئی

چرخ یک مرد گرانمایہ بزنداں خواہد — یوسف از قید زلیخا بدر آمد گوئی

ہمدماں! در دلم از دیدہ نہانید ہمہ — غالب غمزدہ را روح دروانید ہمہ

بلله الحمد کہ در عیش و نشاطید ہمہ — بلله الشکر کہ با شوکت و شانید ہمہ

من بخوں خفتہ و بینم ہمہ بینید ہمہ — من جگر خستہ و دانم ہمہ دانید ہمہ

در میاں ضابطۂ مہر و وفائے بود ست — من بریم کہ ہر آئینہ بر آنید ہمہ

روز سے از مہر نگفتید فلانی چوں ست — بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ

چارۂ گر نتواں کرد دعائے کافی ست — دل اگر نیست حد او بذ زبانید ہمہ

ہفت بند ست کہ در بند رقم ساختہ ام — بنویسید و بہ بینید و بخوانید ہمہ

آں نہ باشم کہ بہر بزم زمن یاد آرید

دارم امید کہ در بزم سخن یاد آرید

سنہ ۱۲۶۶ھ میں مرحوم ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ اور چھہ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمائل مروارید کے - دربار عام میں مرحمت فرمایا اور خاندانِ تیمور کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا ۔ اور یہ قرار پایا کہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں مرحوم مختلف تاریخوں سے مضامین التقاط کر کے مرزا کے حوالے کیا کریں ؛

یہ ترکیب بند مرزا کی عمدہ ترین حالیہ نظموں میں سے ہے اِسواسطے اُسکے مختلف بندوں میں سے کچھ کچھ شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں

از بند اوّل

خواہم از بند بہ زندان سخن آغاز کنم — غم دل پردہ دری کردہ فغان ساز کنم

بہ نوائے کہ ز مضراب چکاند خوناب — خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم

چون سرایم سخن انصاف ز مجرم خواہم — چون نویسم غزل اندیشہ ز غمّاز کنم

یارِ دیرینہ! قدم رنجہ مفرما کاینجا — آن نہ گنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم

اہلِ زندان بسر و چشمِ خودم جا دادند — تا بدین صدر نشینی چہ قدر ناز کنم

ہلہ دزدانِ گرفتار! وفا نیست بشہر — خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم

از بند سوم

پاسبانان بہم آئید کہ من مے آیم — درِ زندان بکشائید کہ من مے آیم

ہرکہ دیدے بہ برِ خویش سپاسم گفتے — خیر مقدم بسرائید کہ من مے آیم

جادہ نشناسم و زانبوہ شماتی ترسم — راہ ہم از دور بنمائید کہ من مے آیم

رہروِ جادۂ تسلیم درشتی نکند — سخت گیرندہ چرائید کہ من مے آیم

ہاں عزیزان کہ درین کلبہ اقامت دارید — بخت خود را بستائید کہ من مے آیم

تا بہ دروازۂ زندان پئے آوردنِ من — قدمے رنجہ نمائید کہ من مے آیم

چون سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من ست — بہرہ از من بربائید کہ من مے آیم

از بند چہارم

آنچہ فرداست ہم امروز درآمد گوئی — آفتاب از جہتِ قبلہ برآمد گوئی

دل و دستے کہ مرا بود فرو ماند ز کار — شب و روزیکہ مرا بود سرآمد گوئی

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم نے اُس زمانے میں مرزا کے ساتھ دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا۔ اپیل میں جو کچھ صرف ہوا وہ اپنے پاس سے صرف کیا اور تین مہینے تک برابر اُنکی غمخواری اور ہر طرح کی خبرگیری میں مصروف رہے۔ چنانچہ اُسی ترکیب بند میں نواب مرحوم کی نسبت کہتے ہیں۔

خود چرا خوں خورم از غم کہ بغمخواری من — رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی

خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسشِ وے — پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفےٰ خاں - کہ دریں واقعہ غمخوارِ منست

گر بمیرم چہ غم از مرگ - عزادارِ منست

جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے[*] صاحب کے مکان میں آکر رہتے تھے۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے؛ کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی۔ مرزا نے کہا "کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے؟ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں"

مرزا نے قید میں ایک فارسی ترکیب بند اپنے حسبِ حال لکھکر دوستوں کو بھیجا تھا۔ اِس نظم میں کُل سات بند اور ہر بند میں بارہ ۱۲ شعر ہیں۔ مرزا کے عزیزوں اور دوستوں نے کلیاتِ فارسی میں اِس نظم کو چھپنے نہیں دیا تھا؛ مگر مرزا صاحب نے مرنے سے کسی قدر پہلے اپنی جدید نظم کا ایک مجموعہ موسوم بہ سبدِ چین شائع کیا تھا؛ اُسمیں اِس ترکیب بند کو بھی شامل کر دیا تھا۔ لیکن سبدِ چین کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی؛ اِس لئے یہ ترکیب بند بہت کم لوگوں کی نظر سے گذرا ہے۔ چونکہ

[*] حضرت محمد نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب بہادر شاہ مرحوم کے شیخ اور مولانا فخر الدین قدس سرہٗ کے پوتے تھے۔ مرزا مدت تک اِن کے مکان میں رہے ہیں۔ وہ مرزا سے نہایت محبت رکھتے تھے اور انھیں کی تقریب سے قلعے میں تعلق پیدا ہوا تھا ۱۲

میری خاکساری اور آزادہ روی سے اُسکو مطلع کیا؛ یہاں تک کہ اُسنے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیجدی۔ اگرچہ میں - اِس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جاسکتا - جو کچھ گذرا اُسکے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گذرنے والا ہے اُسپر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئینِ عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں؛ اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے؛ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جاے پناہ اور استانۂ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئیگا کہ درماندگی کی قید سے جو اِس گذری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اِسکے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھپر گذرا اور یہ ہے جسکا میں آرزومند ہوں"

یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گذرا تھا۔ اگرچہ منجملہ چھہ مہینے کے تین مہینے جو اُنکو قید خانے میں گذرے اُن کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی؛ وہ بالکل قید خانے میں اُسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے۔ کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسبِ دلخواہ گھر سے اُنکو پہونچتی تھیں۔ اُنکے دوست اُن سے ملنے جاتے تھے۔ اور وہ صرف بطور نظر بندوں کے جیلخانے کے ایک علحدہ کمرے میں رہتے تھے۔ مگر چونکہ اُسوقت تک شہر کے شرفا و اعیان کے ساتھ کبھی اِس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا تھا اِس لیے وہ اسکو ایک بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو ترکیب بند اُنھوں نے قید خانے میں لکھا تھا اُسمیں کہتے ہیں

رانہ دانا غمِ رسوائی جاوید بلاست
بہرِ آزار غمم از قیدِ فرنگم نبود

جورِ اعدا رود از دل بہ رہائی لیکن
طعنِ احباب کم از زخمِ خدنگم نبود

سے اُتر کر اِس انتظار میں ٹھیرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکرٹری اُنکے لینے کو آئینگے
جب بہت دیر ہوگئی، اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اِس سبب سے نہیں آئے؛ وہ خود باہر چلے آئے
اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربارِ گورنری میں تشریف لاوینگے تو آپکا اُسی طرح استقبال کیا جائیگا
لیکن اِسوقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اِس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے
کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اِس لئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اِس لئے کہ موجودہ اعزاز
میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا مجکو اِس
خدمت سے معاف رکھا جائے؛ اور یہ کہکر چلے آئے۔

مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی۔ اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ
بازی بدکر کھیلا کرتے تھے۔ اِسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ ہجری میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گذرا۔
مرزا نے خود اِس واقعہ کو ایک فارسی خط میں مختصر طور پر بیان کیا ہے جس کا ترجمہ ہم اِس مقام پر
لکھتے ہیں "کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف؛ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ
مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے؛ میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر
کردیا۔ سشن جج - باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھسے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور
اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اُسنے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا
مگر کسی نے نہ سُنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گذر گئی تو مجسٹریٹ
کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکمِ رہائی کا آگیا اور حکام صدر نے ایسی
رپورٹ بھیجنے پر اُسکی بہت تعریف کی۔ سُنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور

کروں کہ مَیں تو آپ کو کتّے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں ؛ تو سخت مشکل واقع ہوگی ۔ میں تو اپنی نسبت کہونگا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں ۔ سب حاضرین یہ لطیفہ سُنکر پھڑک گئے ۔ مرزا کا مطلب صرف اِس قدر بیان کرنا تھا کہ آپ کو مخاطب کے لئے تو عموماً بولا ہی جاتا ہے ؛ اگر متکلم کے لئے بھی اِسکا استعمال ہوگا تو بعض مواقع پر التباس واقع ہوگا ۔ اِس مطلب کو اُنھوں نے اِس لطیف پیرایے میں بیان کیا ۔ مگر یہ فقط ایک لطیفہ اہلِ صحبت کے خوش کرنے کے لئے تھا ؛ ورنہ اہلِ دہلی بھی اکثر بجاے اپنے تئیں کے آپ کو بولتے ہیں ؛ اسمیں کچھ اہلِ لکھنؤ کی خصوصیت نہیں ہے ۔

٭

زبان کے متعلق مرزا کا اِسی قسم کا ایک اور لطیفہ مشہور ہے ۔ دلّی میں رتھ کو بعضے مؤنث اور بعض مذکّر بولتے ہیں کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت ! رتھ مؤنث ہے یا مذکر ؟ آپ نے کہا بھیّا ! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکّر سمجھو ۔

تذکرہ آبحیات میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں ۔ جبکہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا ۔ مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ہند ۔ جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں لفٹننٹ گورنر ہو گئے تھے ۔ مدرسین کے امتحان کے لئے دلّی میں آئے ۔ اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے ؛ اِسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے ۔ لوگوں نے مرزا اور مومن خاں اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا ۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلایا گیا ۔ مرزا پالکی میں سوار ہو کر صاحب سکرٹری کے ڈیرے پر پہونچے ۔ صاحب کو اطلاع ہوئی ؛ اُنھوں نے فوراً بلا لیا ۔ مگر یہ پالکی

لطیفہ

ملازمت سرکاری سے انکار

اُنکی تقریب کی گئی ۔ مرزاسے اُس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہیں ہوسکا ؛ مگرایک مرثیہ نثر صنعت تعطیل میں۔ جو اُنکے مسودات میں موجود ہے۔ نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے لکھی تھی لیکن مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں ؛ ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں، دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جاے ۔ اسی وجہ سے مرزا۔ بغیر اسکے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور وہ نثر پیش کریں۔ وہاں سے کلکتے کو روانہ ہوگئے ۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے سے واپس آنے کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ دلی سے نصیر الدین حیدر کی شان میں لکھکر ایک دوست کے توسط سے گذرانا تھا ۔ اور اُسپر پانچ ہزار روپے بطور صلے کے ملنے کا حکم ہوا تھا ۔ شیخ امام بخش ناسخ نے مرزا کو لکھا کہ پانچ ہزار ملے تھے ؛ تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے ؛ اور دو ہزار متوسط کو دیکر کہا کہ اسمیں سے جو مناسب سمجھو مرزا کو بھیج دو۔ مرزا صاحب نے یہ سنکر پھر کچھ تحریک کی ۔ مگر تین دن بعد یہ خبر پہونچی کہ نصیر الدین مرگئے ۔ پھر واجد علیشاہ کے زمانے میں مرزا نے سلسلہ جنبانی کی ؛ اور پانسو روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لئے وہاں سے مقرر ہوگئے ۔ لیکن صرف دو برس گذرے تھے کہ ریاست ضبط ہوگئی ؛ اور وہ دفتر گاؤ خورد ہوگیا ۔

لکھنؤ کی ایک صحبت میں - جب کہ مرزا وہاں موجود تھے - ایک روز لکھنؤ اور دلی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی ۔ ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہلِ دہلی اپنے تئیں بولتے ہیں وہاں اہلِ لکھنؤ آپ کو بولتے ہیں ؛ آپ کی راے میں فصیح آپکو ہے یا اپنے تئیں ؟ مرزا نے کہا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں ؛ مگر اسمیں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں، اور میں اُسکے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض

لطیفہ

لیک از من ہزار بار بہ است ‏— از من و ہمچو من ہزار بہ است

من کفِ خاک و او سپہر بلند ‏— خاک را کے رسد بچرخ کمند

وصفِ او حدِ چون منے نبود ‏— مہر در خورد روزنے نبود

مرحبا سازِ خوشِ بیانیِ او ‏— حبذا شورِ نکتہ دانیِ او

نظمش آبِ حیات را ماند ‏— در روانی فرات را ماند

نثرِ او نقشِ بالِ طاؤس ست ‏— انتخابِ صراح و قاموس ست

پادشاہے کہ در قلمرو حرف ‏— کردہ ایجاد نکتہ ہاے شگرف

خامہ ہندوی پارسی دانش ‏— ہندیان سر بخطِ فرمانش

ایں رقمہا کہ ریخت کلکِ خیال ‏— بود سطرے ز نامۂ اعمال

از منِ نارسائے ہیچمداں ‏— معذرت نامۂ ایست نزدِ یاراں

بو کہ آید ز عذر خواہیِ ما ‏— رحم بر ما و بیگناہیِ ما

آشتی نامہ ود او پیام ‏— ختم شد والسّلام والاکرام

جب مرزا نے دلّی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا اُسوقت راہ میں ٹھیرنے کا قصد نہ تھا۔ مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدّت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں؛ اس لیے کانپور پہنچ کر اُنکو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے۔ اُس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرمانروا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ اہلِ لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بعنوان شائستہ

که چسان از حزین بہ پیچم سر؟ — آں بجادو دمی بہ ہر سحر

دل دہد کز اسیر برگردم؟* — زاں نوائیں صفیر برگردم

دامن از کف کنم چگونہ رہا — طالب و عرفی و نظیری را

خاصہ روح و روانِ معنی را — آں ظہوری جہانِ معنی را

آنکہ از سر فرازیِ قلمش — آسماں ساست پرچمِ علمش

طرزِ اندیشہ آفریدۂ اوست — در تنِ لفظ جاں دمیدۂ اوست

پشتِ معنی قوی ز پہلویش — خامہ را فربہی ز بازویش

طرزِ تحریر را نوی از وے — صفحہ را تنگِ مانوی از وے

فتنۂ گفتگوے اینانم — مستِ لائے سبوے اینانم

آں کہ طے کردہ ایں مواقف را — چہ شناسد قتیل و واقف را

لیک با اینہمہ - کہ ایں دارم — گنجِ معنی در آستیں دارم

دل و جانم فداے احبابست — شوق وقفِ رضاے احبابست

نشوم خویش را بہ صلح دلیل — می سرایم نواے مدحِ قتیل

تا نماند ز من دگر گلہ — رسد از پیروانِ وے صلہ

گفتن آئینِ ہوشیاری نیست — لیک دانستن اختیاری نیست

گرچہ ایرانیش نخواہم گفت — سعدیِ ثانیش نخواہم گفت

* یعنی آیا دل اجازت میدہد کہ از اسیر برگردم - یہ اہلِ زبان کا محاورہ ہے کہ دل دہد بجاے "دل دستوری دہد" کے بولتے ہیں ۱۲

نه ز آویزشش بیاں ترسم — من و ایمان من گراں ترسم

که پس از من بسا لهائے دراز — بزباں ماند ایں حکایت باز

که سفیهے رسیده بود ایں جا — چند روز آرمیده بود ایں جا

با بزرگاں ستیزه پیش گرفت — ز حمقے داد و راهِ خویش گرفت

شوخ چشمے و زشت خوئے بود — بیحیائے و هرزه گوئے بود

هم سفیهانه گفتگوئے داشت — هم خراباتیانه خوئے داشت

برگ دنیا نه سازِ دینش بود — ننگ دهلی و سرزمینش بود

آه ازاں دم که بعد رفتنِ من — خونِ دهلی بود بگردنِ من

تا بوم رنجِ دوستاں باشم — بر دلِ انجمن گراں باشم

شاد گردند کز میاں بروم — آوخ از من که من چناں بروم

خسته و مستمند برگردم — در غم آیم نژند برگردم

بود اعم کس از شما نرسد — شوق را مژده وفا نرسد

دوستاں را اگر ز من گله است — که خرامت خلاف قافله است

می رویم از پےِ قتیل همه — ساخته مرد را دلیل همه

توازیں حلقه چوں بدر زده — گام بر جاده دگر زده''

اے تماشائیان ژرف نگاه — هاں بگوئید حسبةً للّٰه

برق بے طاقتی بجاں زدہ — آتش غم بجان و ماں زدہ

از گداز نفس تب و تابے — در بیابان یاس تشنہ لبے

نفس بے نوائی محیط بلا — سر بسر گرد کاروانِ فنا

دردمندے جگر گداختہ — از غم دہر زہرہ باختہ

درِ آگاہیے قفا زدہ — ہمہ بر خویش پشتِ پا زدہ

چہ بلا ہا کشیدہ ام آخر — کہ بدینجا رسیدہ ام آخر

بہ سیہ روز غم ترحم بینید — تیرہ شبہاے وحشتم بینید

اندہ دوریے وطن نگرید — غم ہجرانِ انجمن نگرید

نہ ہمیں نالہ و فغاں باہم — من و جاں آفریں کہ جاں بلبم

مو بہ چیں موے کردہ است مرا — غصہ بد خوے کردہ است مرا

ذوقِ شعر و سخن کجاست مرا — کے زبانِ سخن سرا است مرا

دارم آرے ز ہرزہ لائی خویش — نوحہ بر خویش و بینوائیِ خویش

گردشِ روزگارِ خویشتنم — حیرتِ کار و بارِ خویشتنم

با من ایں خشم و کیں!! دریغ دریغ — من چناں تاں چنیں!! دریغ دریغ

بہ غریباں کجا روا است ستم — رحم اگر نیست خود چرا است ستم

بندہ ام بندہ مہربانان را — رمز فہمان و نکتہ دانان را

اے سخن پرورانِ کلکتہ — وے زباں آورانِ کلکتہ

ہر یکے صدرِ بزمِ بارگہے — شمعِ خلوت سرائے کارگہے

ہر یکے پیش تازِ قافلۂ — ہر یکے کتخدائے مرحلۂ

اے بہ شغلِ وکالت آمادہ — دادِ غمخوارئ جہاں دادہ

اے شگرفانِ عالمِ انصاف — بسفارت رسیدہ از اطراف

اے سخن را طراز جاں دادہ — صفحہ را سازِ گلستاں دادہ

عطر بر مغزِ گیتی افشاناں — پہلوانانِ پہلوی داناں

اے گرامی فنانِ ریختہ گو — نغز دریا کشان عربدہ جو

اے رئیسانِ ایں سوادِ عظیم — وے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم

ہمچو من آرمیدۂ ایں شہر — بہرِ کارے رسیدۂ ایں شہر

اَسَدُاللہِ بخت برگشتہ — در خم و پیچِ عجز سرگشتہ

گرچہ ناخواندہ میہمانِ شماست — بے سخن - ریزہ چینِ خوانِ شماست

بہ تظلّم رسیدہ است اینجا — بامید آرمیدہ است اینجا

آرمیدن دہید روزے چار — خستہ را بہ سایۂ دیوار

کارِ احباب ساختن رسمست — میہماں را نواختن رسمست

آں رہ و رسمِ کارسازی کو — شیوۂ میہماں نوازی کو

کیستم؟ دل شکستہ غمزدۂ — بیدلے خستۂ ستم زدۂ

کلکتے کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور اپنے اعتراضوں پر قتیل کا قول سنداً پیش کیا تھا۔ مگر مرزا ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں خسرو کے سوا کسیکو نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلّم الثبوت نہیں؛ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے" اسی لیے وہ قتیل و واقف وغیرہ کو کچھ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے قتیل کا نام سُنکر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں دلوالی سنگھ* فریدآباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا اور اہلِ زبان کے سوا کسی کے قول کو قابلِ استناد نہیں سمجھتا۔ اور اپنے کلام کی سند میں اہلِ زبان کے اقوال پیش کیے۔ اسپر معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی۔ اگرچہ مرزا کے طرفدار بھی کلکتے میں بہت سے تھے مگر چونکہ مرزا اعتراض اور مخالفت سے بہت چڑ بیزار ہوتے تھے۔ انکے گھبرا دینے کو ایک معترض بھی کافی تھا۔ اُنھوں نے تنگ آکر ایک مثنوی موسوم بہ بادِ مخالف۔ جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہلِ کلکتہ کی نامہربانی کی شکایت اور اُنکے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور دردانگیز طریقے سے بیان کیے ہیں۔ لکھی۔ یہاں اُس مثنوی کے کچھ کچھ اشعار مختلف مقامات سے نقل کیے جاتے ہیں۔

اے تماشائیانِ بزمِ سخن	وے مسیحا دمانِ نادرہ فن
اے گرانمایگانِ عالمِ حرف	خوش نشینانِ این بساطِ شگرف

* مرزا قتیل نومسلم تھے؛ اسلام لانے سے پہلے اُن کا نام دلوالی سنگھ تھا اور وہ فریدآباد ضلع دہلی کے کھتری تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے تھے جہاں اُن کی نہایت قدر ہوئی ۱۲

گورنر بمبئی سے - جو لارڈ لیک کے سکرٹری رہ چکے تھے، اور اُنھیں کے روبرو جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں لوگوں کو ملی تھیں ؛ مرزا کے معاملے کی بابت استفسار کیا ۔ اُنھوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا اور جس طرح اور جس قدر پنشن فیروز پور سے ملنی قرار پائی تھی اُسکی مفصل کیفیت - جو مرزا کے دعوے کے بالکل برخلاف تھی - گورنمنٹ میں بھیجدی ۔ جب یہاں سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو اُنھوں نے ولایت میں اپیل کیا ؛ مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا ۔

مرزا صاحب نے گورنمنٹ ہند سے پانچ درخواستیں کی تھیں ؛ ایک تو یہی کہ اُنکے خیال کے موافق جو مقدار پنشن کی سرکار نے مقرر کی ہے وہ آیندہ پوری ملا کرے ۔ دوسری یہ کہ ابتک جس قدر کم پنشن ملتی رہی ہے اُسکی واصلات ابتدا سے آج تک ریاست فیروز پور سے دلوائی جائے ۔ چونکہ پہلی درخواست نامنظور ہوئی تھی (اس لیے دوسری درخواست کیونکر منظور ہوتی) تیسری درخواست یہ تھی کہ کُل پنشن میں جو حصہ میرا قرار پائے وہ اور شُرکا سے علیحدہ کردیا جائے ۔ چوتھی یہ کہ پنشن فیروز پور سے خزانۂ سرکار میں منتقل ہوجائے ؛ تاکہ رئیس فیروز پور سے مانگنی نہ پڑے ۔ (یہ دونو درخواستیں منظور ہوگئیں اور اُنکے موافق اخیر تک عملدرآمد رہا) پانچویں درخواست خطاب اور خلعت کی تھی ۔ جہاں تک معلوم ہے کوئی خطاب گورنمنٹ سے مرزا کو نہیں ملا ۔ لیکن گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹ سے اُن کو "خانصاحب بسیار مہربان دوستاں" لکھا جاتا تھا ۔ اور جب کبھی دلّی میں ویسرائے یا لفٹنٹ گورنر کا دربار ہوتا تھا تو اُنکو بھی مثل دیگر رؤسا و عمائدِ شہر کے بلایا جاتا تھا ۔ اور سات پارچہ کا خلعت مع جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید کے اُنکو برابر ملتا رہا ۔ اور تمام لوکل حکّام اور افسر اُنسے رئیس زادوں کی طرح ملتے رہے ۔

عالمِ شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی چند روز میں
سب خرچ ہوگیا؛ لاچار فکرِ معاش دامنگیر ہوئی۔ اول مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروز پور سے
جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اُس قدر ہمکو نہیں ملتی۔ ضرورتوں
نے سخت تنگ کر رکھا تھا؛ ادھر قرضخواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا تھا؛ اُدھر چھوٹے
بھائی کو جنون ہوگیا؛ مرزا جیسے آزاد منش آدمی کے لیے یہ وقت نہایت سخت تھا؛ اُس کشمکش
میں اُنکو اِسکے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ کلکتے پہونچکر سوپریم گورنمنٹ میں پنشن کی بابت استغاثہ
پیش کریں۔ چنانچہ مرزا اُس حالت کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "دو ہنگامہ دیوانگی برادر یک
طرف، و غوغائی وام خواہاں یک سو؛ آشوبے پدید آمد کہ نفس راہِ لب، و نگاہ روزنہ چشم فراموش
کرد؛ و گیتی بدیں روشنی روشناں در نظر تیرہ و تار شد۔ بالبے از سخن دوختہ، و چشمے از خویش فرو بستہ
بہاں جہاں شکستگی؛ و عالم عالم خستگی با خود گرفتم؛ و از بیدادِ روزگار نالاں، و سینہ بر دمِ تیغ مالاں
بکلکتہ رسیدم"
غرضکہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جبکہ وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے۔ کلکتے میں
لوگوں نے اُنکی بہت خاطر و مدارات کی اور اُن کو کامیابی کی امید دلائی۔ اسٹرلنگ صاحب
سکرٹری گورنمنٹ ہند نے جنکی مدح میں مرزا کا فارسی قصیدہ اُنکے کلیات میں موجود ہے؛ وعدہ
کیا کہ تمھارا حق ضرور تمکو ملے گا۔ کول برک صاحب جو اُس وقت دلّی میں رزیڈنٹ تھے اُنھوں
نے دلّی ہی میں مرزا سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کرلیا تھا۔ اِن امیدوں کے دھوکے میں
وہ پورے دو برس کلکتے میں رہے؛ مگر آخر کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہوا۔ گورنمنٹ نے سر جان میلکم

دلی میں اُنکے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کے معلوم ہوتا ہے۔ اِس تمام مدت میں انھوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لئے نہیں خریدا۔ ہمیشہ کرایہ کے مکانوں میں رہا کیے۔ یا ایک مُدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرائے کے رہے تھے۔ جب ایک مکان سے جی اُکتایا اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔ مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اُسکے قریب جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں اُن کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوانخانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جسکی نسبت وہ کہتے ہیں۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے　　یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

جس طرح مرزا نے تمام عمر رہنے کے لیے مکان نہیں خریدا اسیطرح مطالعے کے لیے بھی۔ باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گذری۔ کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دکان سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لا دیا کرتا تھا، مرزا صاحب بھی ہمیشہ اُسی سے کرائے پر کتابیں منگواتے تھے اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے تھے۔

ظاہرا مرزا نے کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا۔ اِسی سفر کی آمد و رفت میں وہ چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی ٹھہرے تھے۔ کلکتے جانے کا سبب یہ تھا کہ جب مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے وفات پائی تھی اُس وقت مرزا کی عمر ۹ نو برس کی تھی اور اُن کے بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد اُن کے متعلقوں اور وارثوں کے لیے۔ جنمیں مرزا اور اُنکے بھائی بھی شریک تھے۔ جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروز پور جھرکہ پر محوّل کر دی تھی جبتک مرزا صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سن تمیز کو پہنچے اور شادی بھی ہو گئی۔

اور ہمارے دو گھر بیچ درمیان تھے ۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔
اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی ۔ اور پاس اسکے ایک کھٹیا والی حویلی
اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی ۔ اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی ۔ اور اس سے
آگے بڑھکر ایک کٹرا کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا ۔ اور ایک کٹرا کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا ۔ اس
کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا ؛ اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے ۔ واصل خاں
نامی ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیشدست رہتا تھا اور وہ کٹروں کا کرایہ اگاہکر تحصیل کرتا تھا ۔ بھائی
تم سنو تو سہی ۔ تمہارے دادا نے بہت کچھ پیدا کرلیا ۔ علاقے مول لیے تھے ۔ اور زمینداری اپنا کرلیا تھا ۔ بیس
بارہ ہزار روپیے کی سرکاری مالگذاری کرتا تھا ۔ آیا وہ سب کارخانے تمہارے ہاتھ آئے یا نہیں؟
یہ حال از روئے تفصیل جلد مجھکو لکھو"" ۔ اس خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا کی
آگرے میں ایک خاصی سرکار تھی جسکی بدولت اُنکے ملازم اور متوسلین دس دس بارہ بارہ ہزار کے
مالگذار بن گئے تھے ؛ اور مرزا کا بچپن اور عنفوانِ شباب بڑے اَللّے تللّوں میں بسر ہوا تھا ۔

اہلِ دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا اُن سے سُنا گیا ہے کہ عنفوانِ شباب
میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے ۔ اور بڑھاپے میں بھی جبکہ
راقم نے پہلی ہی بار اُن کو دیکھا ہے ۔ حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قد و قامت
اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے ۔ مگر اخیر عمر میں قلتِ خوراک اور امراضِ دائمی کے
سبب وہ نہایت نحیف و زار و نزار ہو گئے تھے ۔ لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا قد کشیدہ اور ہاتھ پانو زبردست
تھے اس حالت میں بھی وہ ایک نودارد و نورانی معلوم ہوتے تھے ۔

چونکہ مرزا کے چچا کا رشتہ نواب فخر الدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا اور اس لئے اُنکے خاندان سے ایک نوع کا تعلق پیدا ہو گیا تھا ؛ مرزا کی شادی نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی ۔ اور ۔ جیسا کہ مرزا نے ایک رقعہ میں اشارہ کیا ہے ۔ تیرہ برس کی عمر میں ۷ ۔ رجب ۱۲۲۵ھ ہجری ۔ کو اُن کا عقد ہو گیا ۔ اِس تقریب سے اُن کی آمد و رفت دِلّی میں زیادہ ہو گئی ۔ اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی اور اخیر عمر تک دلّی ہی میں رہے ۔

مرزا کے نانا کی جاگیریں متعدد دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑی املاک تھی ۔ وہ منشی شیونرائن رئیس آگرہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو ۔ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو ۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہگار ۔ تمکو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ؟ مجھسے سُنو ! تمھارے پردادا عہدِ نجف خاں میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے ۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی ، اور گھر بیٹھے ، تو تمھارے پردادا نے بھی کمر کھولدی اور پھر کہیں نوکری نہ کی ۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں ۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر ۔ خاں صاحب کے ساتھ ہیں ؛ اور اُنھوں نے جو کیتھم گانو اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے تو بنسی دھر اُس امر کے منصرم ہیں ؛ اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں ۔ میں اور وہ ہمعمر تھے ۔ شاید منشی بنسی دھر مجھسے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں ۔ اُنیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی ؛ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت ؛ آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی ؛ چونکہ گھر اُن کا بہت دُور نہ تھا اسواسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے ۔ بس ہمارے اور اُنکے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر

ظہورِ من بجہاں در ہزار ویست و دو ویست   ظہور خسرو و سعدی بہ شش صد و پنجاہ

ملا عبد الصمد علاوہ فارسی زبان کے جو اُسکی مادری زبان اور اُسکی قوم کی مذہبی زبان تھی۔ عربی زبان کا بھی۔ جیسا کہ مرزا نے لکھا ہے۔ بہت بڑا فاضل تھا۔ اگرچہ مرزا کو اُسکی صحبت بہت کم میسر آئی؛ مگر مرزا جیسے جوہر قابل کو صغر سِن میں ایسے شفیق، کامل، اور جامع اللسانین اُستاد کا مِل جانا اُن نوادر اتفاقات میں سے تھا جو بہت کم واقع ہوتے ہیں۔ اگرچہ مرزا کو اُس سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا، مگر اُسکے فیضِ صحبت نے کم سے کم وہ ملکہ ضرور مرزا میں پیدا کر دیا تھا جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ ,, اگر حاصل شود خواندہٗ و ناخواندہ برابر ست؛ و اگر حاصل نشود ہم خواندہٗ و ناخواندہ برابر،، معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی حُسنِ قابلیت اور حُسنِ استعداد نے ملّا عبد الصمد کے دل پر گہرا نقش بٹھا دیا تھا کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی وہ مدت تک مرزا کو نہیں بھولا۔ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملّا کے ایک خط میں جو اُسنے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا ,, اے عزیز چہ کسی؟ کہ با ایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر مے گذری،، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ دو برس کے قلیل عرصے میں وہ مرزا کو سکھا سکتا تھا اُسمیں ہرگز مضایقہ نہ کیا ہوگا اور جیسا کہ قاطع برہان اور درفشِ کاویانی کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے اُسنے تمام فارسی زبان کے مقدم اُصول اور گُر اور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جنکو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور پارسی و سنسکرت کا متحد الاصل ہونا اور اِسی قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے دل میں بوجہ احسن تہ نشین کر دی تھیں۔

* دو ویست یعنی دو صد۔ اہل زبان اکثر دو کے لفظ کے ساتھ بجائے صد کے ویست کا لفظ استعمال کرتے ہیں ۱۲

عبد الصمد رکھا گیا ؛ غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا ؛ جو کہ دو برس تک مرزا پاس اوّل آگرے میں اور پھر دلّی میں مقیم رہا ؛ میرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی ۔ اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سُنا گیا ہے کہ "مجھکو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمّذ نہیں ہے ؛ اور عبد الصمد محض ایک فرضی نام ہے ۔ چونکہ مجھکو لوگ بے اُستاد کہتے تھے اُن کا مُنھ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی اُستاد گھڑ لیا ہے "، مگر اس میں شک نہیں کہ عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اُس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی ۔ چنانچہ مرزا نے جا بجا اُسکے تلمّذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اُسکو بلفظ ہمسار جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے یاد کیا ہے ۔ لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے ۔ مرزا کی چوّدہ برس کی عمر تھی جب عبد الصمد اُن کے مکان پر وارد ہوا ہے اور کُل دو برس اُسنے وہاں قیام کیا ۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اُسکی صحبت میسّر آئی ، اور کس قدر قلیل مُدت اُسکی صحبت میں گذری ؛ تو عبد الصمد اور اُسکی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے ۔ اِس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھکو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمّذ نہیں ہے ۔

ایک جگہ مرزا نے مبدأ فیاض سے مستفید ہونے کا مضمون نہایت عمدگی سے باندھا ہے اور وہ شعر یہ ہے

آنچہ در مبدأ فیاض بود آنِ من ست — گل جدا نا شدہ از شاخ بداماںِ من ست

ایک اور مقام پر اِس سے بھی عمدہ طریقے سے یہ مطلب ادا کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں

با خذِ فیض ز مبدأ فزونم از اسلاف — کہ بودہ ام قدرے دیر تر دراں درگاہ

فنِ آبائے ما کشاورزیست — مرزباں زادۂ سمرقندیم

ور ز معنی سخن گزاردۂ — خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم

فیض حق را کمینہ شاگردیم — عقل کل را بہینہ فرزندیم

ہم بہ تابش بہ برق ہمنفسیم — ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم

بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم — بمعاشے کہ نیست خرسندیم

ہمہ بر خویشتن ہمے گرییم — ہمہ بر روزگار می خندیم

قطعہ

ساقی! چو من پشنگی† و افراسیابیم — دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم ست

میراثِ جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار — زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدم ست

رباعی

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم* — زاں رو بصفای دمِ تیغست دمم

چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر — شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سنِ شعور تک آگرے ہی میں رہے؛ اگرچہ سات برس کی عمر سے وہ دلی میں آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک انکی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اس زمانے میں آگرے کے نامی معلموں میں سے تھے اُن سے تعلیم پاتے رہے۔ اسکے بعد ایک شخص پارسی نژاد جسکا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہُرمُزد تھا اور بعد مسلمان ہونے کے

† پشنگ افراسیاب کے باپ کا نام ہے ۱۲ * زادشم افراسیاب کے دادا اور پشنگ کے باپ کا نام ہے

...لیک کے لشکر میں شامل ہوئے، تو انھوں نے مرزا غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کو جن سے
...ب موصوف کی ہمشیر منسوب تھیں۔ سرکاری فوج میں بعہدۂ رسالداری ملازم کرادیا۔ اُن کی ذات اور...
...تنخواہ میں دو پرگنے یعنی سونک اور سونسا۔ جو نواح آگرہ میں واقع ہیں۔ سرکار سے اُن کے نام پر مقرر
ہوگئے۔ جب تک وہ زندہ رہے دونوں پرگنے اُن کے نامزد رہے؛ اور اُنکی وفات کے بعد اُنکے وار...
اور متعلقوں کی پنشنیں سرکار نے فیروزپور جھرکہ کی ریاست سے مقرر کرادیں جس میں سے سات سو روپیہ
سالانہ مرزا کو آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ مگر فتحِ دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے
سبب یہ پنشن بند رہی۔ آخر جب مرزا کی ہر طرح سے بریت ہوگئی تو پنشن پھر جاری ہوگئی؛ اور تین برس کی
واصلات بھی سرکار نے عنایت کی۔ جب تک پنشن بند رہی مرزا کے دوستوں کو نہایت تعلقِ خاطر رہا۔
اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے۔ ایک دفعہ میر مہدی نے اسی مضمون کا خط بھیجا
تھا؛ اُسکے جواب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں "میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھکو آگیا ہے؛ اس طرف سے
خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا؛ خدا رزاق ہے؛ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے"

مرزا نے اپنے علو خاندان پر جابجا فارسی اشعار میں فخر کیا ہے چونکہ اُن میں سے بعض اشعار لطف
سے خالی نہیں اسلیے اِس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔ قطعہ

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمے — بہ سترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم* از جماعۂ اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم

* ایبک ترکی لفظ ہے مرکب آے اور بک سے۔ آے چاند کو اور بک کامل اور بزرگ کو کہتے ہیں پس ایبک کے معنی ماہ تمام و بزرگ کے ... در تمامی ز ماہ دہ چندیم "۱۲"۔

تمام عمر سسرال میں بسر کی؛ اور اُن کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں کے دو بیٹے ہوئے؛ ایک **مرزا اسداللہ خاں**؛ اور دوسرے **میرزا یوسف خاں**۔ جو ایام شباب میں مجنون ہو گئے تھے اور اُسی حالت میں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔

مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں۔ جیسا کہ مرزا نے خود ایک خط میں لکھا ہے۔ اوّل لکھنؤ میں جا کر نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے؛ اور چند روز بعد وہاں سے حیدرآباد پہونچے؛ اور سرکارِ آصفی میں تین سو سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے۔ مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی؛ اور وہ واپس آگرے میں چلے آئے۔ یہاں آکر اُنھوں نے الور کا قصد کیا۔ راجہ بختاور سنگھ نے ابھی اُنکو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی کہ اتفاق سے اُنھیں دنوں میں ایک گڑھی کے زمیندار ان سے پھر گئے۔ جو فوج اُس گڑھی پر سرکوبی کے لیے بھیجی گئی اُسکے ساتھ مرزا عبداللہ بیگ خاں کو بھی بھیجا گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اُن کے گولی لگی اور وہیں اُنکا انتقال ہو گیا؛ اور راج گڈھ[†] میں دفن ہوئے۔ راجہ بختاور سنگھ رئیسِ الور نے دو گانو سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ مرزا مرحوم کے دونو لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کر دیا؛ جو ایک مدتِ دراز تک جاری رہا۔ مرزا کے والد کی وفات کے بعد اُنکے چچا نصراللہ بیگ خاں نے اُنکو پرورش کیا۔

جب سرکار انگریزی کی عملداری ہندوستان میں اَچھی طرح قائم ہو گئی، اور نواب فخرالدولہ احمد بخش خاں

[†] مرزا نے جو قصیدہ راجہ شیو دھیان سنگھ کی مدح میں لکھا ہے اُسمیں لکھتے ہیں

در جہاں بالی شدہ ام جا کہ حضور ؛ زنگیں سخن جرازم و دیرین ظیفہ خوار ؛ دارم بگوش حلقہ زپنجاہ و ہشت سال[۵۸] ؛ اکنوں کہ عمر شصت و سہ سال[۶۳] ست شمار

با شنیدہ راز نزا میان بارگاہ ۔ باشنفتہ تشنہ زیراں آں دیار ؛ کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست ؛ در خاک راج گڈھ پدرم را بود مزار ۱۲

اور سلجوقی خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم ہوگئی۔ کئی سو برس وہ تمام ایران وتوران وشام وروم (یعنی ایشیائے کوچک) پر حکمراں رہے۔ آخر ایک مدت کے بعد سلجوقیوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا؛ اور سلجوق کی اولاد جا بجا منتشر و پراگندہ ہوگئی۔ انھیں میں سے ترسم خاں نام ایک میرزادے نے سمرقند میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے وہ اسی ترسم خاں کی اولاد میں تھے۔ مرزا مہر نیمروز کے دیباچے میں لکھتے ہیں "از واپسیان ایں قافلہ نیائے من۔ کہ در قلمرو ماوراء النہر، سمرقند شہر مسقط الراس وے بود۔ چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہند آمد" اور درفش کاویانی میں اسطرح لکھا ہے "بالجملہ سلجوقیاں بعد زوال دولت و برہم خوردن ہنگامۂ سلطنت در اقلیم وسیع الفضای ماوراء النہر پراگندہ شدند۔ ازاں جملہ سلطان زادہ ترسم خاں کہ ما از تخمۂ اوئیم سمرقند را بہر اقامت گزید۔ تا در عہد سلطنت شاہ عالم نیائے من از سمرقند بہندوستان آمد" مرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی؛ اور ہندوستان کی زبان بہت کم سمجھتے تھے۔ اُس زمانے میں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں شاہ عالم کے دربار میں دخل کلی رکھتے تھے۔ نجف خاں نے مرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوادیا اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ میں مقرر کردیا۔ اُنکے کئی بیٹے تھے جنمیں سے دو کے نام معلوم ہیں؛ ایک مرزا کے باپ عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولھا اور دوسرے نصراللہ بیگ خاں۔ عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی؛ جو کہ سرکار میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائد شہر آگرہ میں سے تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں نے بطور خانہ داماد کے اپنی

* سرکار ملک کے اُس حصے کو کہتے تھے جو صوبے کی نسبت چھوٹا اور پرگنہ و محال وغیرہ سے بہت بڑا ہوتا تھا ۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغاز کتاب

میرزا اسد اللہ خان غالب المعروف بہ میرزا نوشہ، المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں
بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ، شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ ہجری کو شہر
آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مرزا کے خاندان اور اصل و گوہر کا حال۔ جیسا کہ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں
جابجا ظاہر کیا ہے۔ یہ ہے کہ اُنکے آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے؛ اور اُن کا سلسلۂ نسب تور ابن
فریدوں تک پہنچتا ہے۔ جب کیانی تمام ایران و توران پر مسلط ہو گئے، اور تورانیوں کا جاہ و جلال
دنیا سے رخصت ہو گیا؛ تو ایک مدتِ دراز تک تور کی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رہی۔
مگر تلوار کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹی؛ کیونکہ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ باپ کے متروکہ میں سے
بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہ ملتا تھا؛ اور کُل مال و اسباب اور گھر بار بیٹی کے حصے میں آتا تھا۔ بارے
ایک مدت کے بعد اسلام کے عہد میں اسی تلوار کی بدولت ترکوں کے بختِ خفتہ نے پھر کروٹ بدلی؛

دل مردہ سوسائٹی کے لیے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ اسکے سوا ہر قوم میں عموماً، اور گری ہوئی قوموں میں خصوصاً، ایسے عالی فطرت انسان شاذ ونادر پیدا ہوتے ہیں جنکی ذات سے (اگرچہ قوم کو براہِ راست کوئی معتدبہ فائدہ نہ پہنچا ہو) لیکن کسی علم یا صناعت یا لٹریچر میں کوئی حقیقی اضافہ کم وبیش ظہور میں آیا ہو، اور سلف کے ذخیرے میں کچھ نیا سرمایہ شامل ہوا ہو۔ ایسے لوگوں کی لائف پر غور کرنا، اُنکے ورکس میں چھان بین کرنی، اور اُنکے نوادر افکار سے مستفید ہونا، قوم کے اُن فرائض میں سے ہے جن سے غافل رہنا قوم کے لیے نہایت افسوس کی بات ہے۔ جیسا کہ خود مرزا ایک جگہ لکھتے ہیں "دریغ کہ ابنائے روزگار حُسنِ گفتارِ مرا نشناختند۔ مرا خود دل بر آناں می سوزد کہ کامیاب شناسائی فرۂ ایزدی نگشتند، وازیں نمایشہای نظر فروز کہ در نظم ونثر بکار بُردہ ام۔ سرگراں گذشتند۔"

جو لوگ شعر کی سمجھ اور اُسکا عمدہ مذاق رکھتے ہیں ؛ اُنکو بغیر اسکے کہ تمام کلیات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہو۔ مرزا کا ہر قسم کا عمدہ کلام ایک جگہ جمع کیا ہوا مل جائیگا۔ دوسرے جو لوگ مرزا کا کلام اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے وہ بسبب اسکے کہ ہر مشکل شعر یا فقرے کے معنی حل کردیے گئے ہیں۔ مرزا کے خیالات سے بخوبی واقفیت حاصل کرسکیں گے۔ اور دونو طبقوں کو معلوم ہو جائیگا کہ مرزا نے قوتِ متخیلہ اور ملکۂ شاعری کس درجے کا پایا تھا؛ اور کس خوبی اور لطافت سے وہ نہایت نازک اور دقیق خیالات کو اُردو اور فارسی دونو زبانوں میں ادا کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔

الغرض یہ رسالہ دو حصّوں پر تقسیم کیا گیا ہے؛ پہلے حصّے میں مرزا کی زندگی کے واقعات۔ جہاں تک کہ معلوم ہوسکے۔ اور اُنکے اخلاق و عادات و خیالات کا بیان ہے۔ اِنھیں حالات کے ضمن میں اُنکی خاص خاص نظمیں یا اشعار جو کسی واقعے سے علاقہ رکھتے ہیں، اور اُنکے لطائف و نوادر جن سے مرزا کی طبیعت کا اصلی جوہر؛ اور اُنکی ایجنبیشن کی قوت نہایت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے اپنے موقع پر ذکر کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصّے میں مرزا کے تمام کلام نظم و نثر اُردو اور فارسی کا انتخاب؛ اور ہر قسم پر جدا جدا ریویو؛ اور آخر میں مرزا کے کسی قدر کلام کا موازنہ ایران کے بعض مسلم الثبوت اُستادوں کے کلام کے ساتھ کیا گیا ہے؛ خاتمۂ کتاب پر ایک مختصر ریویو مرزا کی تمام لائف اور اُن کی طرزِ شاعری و انشا پردازی پر لکھا گیا ہے؛ جسکو ساری کتاب کا لُبِ لباب سمجھنا چاہیے۔

اگرچہ مرزا کی لائف۔ جیسا کہ ہم آیندہ کسی موقع پر بیان کرینگے۔ اُن فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک بائیوگرفی سے حاصل ہونے چاہئیں۔ لیکن اگر اِن فائدوں سے قطع نظر کیجائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان۔ جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہو۔ ہماری تیرہ مردہ اور

کلام کی حقیقت سے اہلِ وطن کو خبردار کیا جاتا۔ مگر یہ طریقہ جس قدر مصنف کے حق میں دشوار گذار تھا
اسی قدر پبلک کے لیے خاصکر اس زمانے میں غیر مفید بھی تھا؛ اگر ہم اس دشوار گذار منزل کے طے کرنے
میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ہماری وہی مثل ہوتی کہ "مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانیوالونکو کچھ مزا نہ آیا"
ناچار ہم نے بجاے طریقۂ مذکورہ کے جو حالتِ موجودہ میں باوجود دشوار ہونے کے غیر مفید بھی ہے
اس موقع پر ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جو ہمارے لیے سہل تر اور پبلک کے لیے مفید تر معلوم ہوتا ہے
ہمنے دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام کو چار قسموں پر تقسیم کیا ہے؛ نظم اُردو، نثر اُردو، نظم فارسی
اور نثر فارسی۔ اور اسی ترتیب سے ہر قسم کا تھوڑا تھوڑا انتخاب چار جدا جدا فصلوں میں درج کیا ہے۔ ہر قسم پر اول کچھ
مختصر ریمارکس کیے ہیں۔ پھر اُس قسم کا انتخاب لکھا گیا ہے۔ اور جو اشعار یا فقرے شرح طلب سمجھے ہیں اُنکی جا بجا شرح
بھی کر دیگئی ہے۔ اور کہیں کہیں محاسنِ کلام کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اور آخر میں۔ خاصکر اُن لوگوں کے لئے جو
فارسی لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ نمونے کے طور پر مرزا کے کسی قدر فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلّم الثبوت
اُستادوں کے کلام کے ساتھ کر کے دکھایا ہے کہ مرزا نے فارسی لٹریچر میں کس درجے تک کمال ہم پہنچایا تھا۔

مذکورۂ بالا انتخاب سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ مرزا کے کلام میں جس قدر بلند اور پاکیزہ خیالات تھے
وہ سب لے لئے گئے ہیں؛ اور جو اُن سے پست درجے کے خیالات تھے وہ چھوڑ دیے گئے ہیں؛ نہیں۔
بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس رسالے کی بساط اور وسعت کے موافق تا بمقدور ہر ایک صنف میں سے کم و بیش ایسا
کلام لے لیا گیا ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے مذاق سے بیگانہ اور اُنکی فہم سے بعید تر نہو؛ اور باوجود
اسکے مؤلف کی نظر میں بھی بوجہ من الوجوہ انتخاب کے قابل ہو۔

اس انتخاب سے جسکو مرزا کے تمام کلام کا نمونہ سمجھنا چاہیے کئی فائدے تصور کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ

اکثر ہمعصر امامی ہروی کو اُسپر ترجیح دیتے تھے؛ مگر کچھ بہت عرصہ نہ گذرا تھا کہ سعدی کا نام اور اُسکا کلام اطراف عالم میں منتشر ہوگیا؛ اور امامی کا کلام صرف تذکروں میں باقی رہ گیا۔ شکسپیر کے عہد میں اسکو ایک ایکٹر سے زیادہ رتبہ نہیں دیا گیا، مگر آج اُسی شکسپیر کے ورکس بائبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔ خود مرزا بھی اپنے کلام کی نسبت ایسا ہی خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی غزل میں فرماتے ہیں:۔

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن؛ ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

اگرچہ اس لحاظ سے۔ کہ ایشیائی شاعری کا مذاق یوروپین سولزیشن میں روز بروز جذب ہوتا جاتا ہے اور فارسی لٹریچر ہندوستان سے ایسا رخصت ہوا ہے کہ بظاہر اُسکے مراجعت کرنے کی توقع نہیں رہی۔ یہ امید رکھنی تو فضول ہے کہ مرزا کی فارسی نظم و نثر اب یا آیندہ زمانے میں مقبولِ خاص و عام ہوگی؛ لیکن جو تو بر تو پردے مرزا کی شاعری اور نکتہ پردازی پر اُنکی زندگی میں پڑے رہنے اور جو اب تک مرتفع نہیں ہوے؛ کیا عجب ہے کہ ہماری یا ہمارے بعد کسی دوسرے شخص کی کوشش سے رفع ہو جائیں۔

مرزا کو بحیثیت شاعری پبلک سے روشناس کرنے اور اُنکی شاعری کا پایہ لوگوں کی نظر میں جلوہ گر کرنے کا عمدہ طریقہ یہ تھا کہ اُنکے اصنافِ کلام میں سے ایک معتد بہ حصہ نقل کیا جاتا، ہر صنف میں جو باتیں مرزا کی خصوصیات سے ہیں وہ بیان کی جاتیں، جو کلام نقل کیا جاتا اُسکی لفظی و معنوی خوبیاں، نزاکتیں، اور باریکیاں ظاہر کی جاتیں، شعرا کے جس طبقے میں مرزا کو جگہ دینی چاہیے اُس طبقے کے شاعروں کے کلام سے مرزا کے کلام کا موازنہ کیا جاتا، اُنکی غزل سے مرزا کی غزل کو، قصیدے سے قصیدے کو، اور اسی طرح ہر صنف سے اُسی صنف کو ٹکرایا جاتا، اور اسطرح مرزا کے پایۂ شاعری اور اُنکے

جمع کی گئی ہیں؛ اور جو تھوڑی سی توجہ سے مُرتب ہوسکتی ہیں۔ اُنکو اب زیادہ حالت منتظرہ میں رکھنا مناسب نہیں

مَیں نے اُن مُٹھوں کو کھُولا اور اُن یادداشتوں کے مرتب کرنے کا ارادہ کیا؛ مگر اُن کے دیکھنے سے

معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی؛ اور اِسکے سوا کچھ اور کتابیں بھی

درکار ہونگی۔ میں نے دِلی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا اور اُنھوں نے مہربانی فرماکر میری

تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات اُنکو معلوم ہوسکے لکھکر میرے پاس بھیجدیے؛ اور

اِس طرح مرزا کی لائف جہاں تک کہ اُسکی تکمیل ہوسکتی تھی مکمل کی گئی۔

مَیں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مرزا کی لائف میں کوئی منوّہ بالشان واقعہ اُنکی شاعری وانشاپردازی

کے سوا نظر نہیں آتا۔ لہذا جس قدر واقعات اُنکی لائف کے متعلق اِس کتاب میں مذکور ہیں اُنکو ضمنی اور

استطرادی سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصود اِس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اُس عجیب وغریب ملکہ کا

لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالٰے نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا؛ اور جو کبھی نظم ونثر کے پیرائے

میں، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشقبازی اور رندمشربی کے لباس میں، اور

کبھی تصوّف اور حُبِّ اہلبیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر اِن چاروں باتوں سے علاقہ نہیں

رکھتا اُسکو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔

لٹریری دنیا میں بہت سے صاحب کمال ایسے گذرے ہیں جنکے زمانے میں اُنکی قدر ومنزلت کا پورا

پورا اندازہ نہیں کیا گیا؛ مگر آخرکار اُن کا کمال ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ سعدی کے زمانے میں اُسکے

---

* یعنی نواب سعید الدین احمد خاں خلف الصدق نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم اور سید اکبر مرزا وسید مظفر مرزا نبائر نواب

حسام الدین حیدر خاں مرحوم اور میر مہدی حسین مجروح اور لالہ بہاری لال مشتاق ۱۲

اُتی لیکر یوسف کی خریداری کو مصر کے بازار میں آئی تھی - سچ یہ ہے کہ مرزا کی قدر جیسی کہ چاہیے یا جلال الدین اکبر کرتا؛ یا جہانگیر و شاہجہاں ؛ مگر جس قدر اس اخیر دور میں انکو مانا گیا اُسکو بھی نہایت مغتنم سمجھنا چاہیے -

بیچے مُفت یہاں ہم زمانے کے ہاتھوں یہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام اُنکی شاعری اور انشاپردازی کے سوا نظر نہیں آتا - مگر صرف اسی ایک کام نے اُنکی لائف کو دار الخلافہ کے اخیر دور کا ایک مُہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس مُلک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا ہے ؛ اور اردو نظم و نثر پر بھی اُنکا کچھ کم احسان نہیں ہے ؛ اسی لیے کبھی کبھی مجھکو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں اور اُنکی شاعری و انشاپردازی کے متعلق جو اُمور کہ احاطۂ بیان میں آسکیں اور اپنا ئی زباں کی فہم سے بالاتر نہوں ؛ اُنکو اپنے سلیقے کے موافق قلمبند کروں -

پچھلے برسوں میں جبکہ مَیں دِلّی میں مقیم تھا بعض احباب کی تحریک سے اس خیال کو اور زیادہ تقویت ہوئی - مَیں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مُستعار لیکر جمع کیا ؛ اور جس قدر اُنمیں اُنکے حالات اور اخلاق و عادات کا سُراغ ملا اُنکو قلمبند کیا ؛ اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں - اُنکو بھی ضبطِ تحریر میں لایا - مگر ابھی ترتیبِ مضامین کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ اَور کاموں میں مصروف ہو گیا ؛ اور کئی برس تک تمام یادداشتیں کاغذ کے گٹھّوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں -

ان دنوں میں دوستوں کا پھر تقاضا اور بہت سخت تقاضا ہوا اور باوجودیکہ میں ایک نہایت اہم اور ضروری کام میں مصروف تھا - دوستوں کے تقاضے نے یہاں تک مجبور کیا کہ اُس ضروری کام کو چند روز کے لیے ملتوی کرنا پڑا ؛ اور یہ خیال کیا گیا کہ جو یادداشتیں مرزا کی لائف کے متعلق بڑی کوشش سے

کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچا بدل گیا؛ اور جس ہوا میں اُنھوں نے نشو و نما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی۔

زمانہ دگرگونہ آئیں نہاد　　شد آں مُرغ کو بیضۂ زرّیں نہاد

علی الخصوص مرزا اسد اللہ خاں غالب جنکی عظمت و شان اِس سے بالاتر تھی کہ اُنکو بارھویں یا تیرھویں صدی ہجری کے شاعروں یا انشا پردازوں میں شمار کیا جائے۔

مرزا نے اپنی کتاب "مہر نیمروز" میں ایک موقع پر بہادر شاہ کی طرف خطاب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ "شاہجہاں کے عہد میں کلیم شاعر کو سیم و زر میں تولا گیا تھا؛ مگر میں صرف اِس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے" اِس مضمون کو جو لوگ مرزا کے رُتبے سے واقف نہیں ہیں شاید خودستائی اور تعلّی پر محمول کرینگے؛ مگر ہمارے نزدیک مرزا نے اسمیں کچھ بھی مبالغہ نہیں کیا؛ بلکہ بالکل وہی کہا ہے جو اُنکے زمانے کے اہلِ نظر اور اہلِ تمیز اُنکی نسبت رائے رکھتے تھے۔

اگرچہ زمانے نے اپنی بساط کے موافق مرزا کی کچھ کم قدر نہیں کی؛ اُن کا تمام کلام، اُردو، فارسی، نظم، اور نثر اُنکے جیتے ہی جی اطرافِ ہندوستان میں پھیل گیا تھا؛ اُنکے ماننے والے اور مدّاح و ثناخواں ملک کے ہر گوشے میں پائے جاتے تھے اور اب تک پائے جاتے ہیں؛ مدحیہ قصائد پر اُنکو کم و بیش صلے اور خلعت و انعام بھی ملتے رہے؛ مرحوم بہادر شاہ نے بھی اپنی حیثیت کے موافق اُنکی خاصی قدر کی؛ ریاستِ رامپور سے اُنکے لیے اخیر دم تک معقول وظیفہ جاری رہا؛ یہ سب کچھ ہوا؛ مگر جب مرزا کے اُس اعلیٰ مرتبے کا، جو شاعری و انشا پردازی میں فی الواقع اُنھوں نے حاصل کیا تھا۔ ٹھیک اندازہ کیا جاتا ہے تو ناچار یہ کہنا پڑتا ہے کہ زمانے کی یہ تمام قدر دانی زیادہ سے زیادہ اُس پیرزال کی سی قدر دانی تھی جو ایک سُوت کی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تیرھویں صدی ہجری میں جبکہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور اُنکی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسن اتفاق سے دار الخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جنکی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں، اُنہیں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود — باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ — حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ہی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، مگر جو باقی تھے اور جنکے دیکھنے کا ہمیشہ فخر رہیگا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اُٹھتا نظر نہیں آتا،

غالب نامم آورم نام و نشانم مپرس ❀ هم اسد اللهم و هم اسد اللهیم
شبیہ مبارک نجم الدولہ دبیر الملک جناب مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب مرحوم

یادگارِ غالب

یعنی

جناب مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ غالب دہلوی کی زندگی کے حالات

اور

انکی اقسامِ نظم و نثر اردو و فارسی کا انتخاب اور ہر ایک قسم پر جداگانہ ریمارکس

مرتبہ

خاکسار الطاف حسین حالی پانی پتی

سنہ ۱۸۹۷ء

محمد رحمت اللہ رعد کے

نامی پریس کانپور میں چھپی

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
مرزا کی رباعیات فارسی۔	۲۲۶ لغایت ۲۹۶	نثر فارسی کا انتخاب۔	۳۴۹ لغایت ۴۱۰
مرزا کے قصائد فارسی پر ریمارک اور اُنکے نمونے	۲۹۶-۳۲۲	نثر فارسی کا مقابلہ ظہوری کی نثر کے ساتھ	۴۱۱-۴۱۳
قطعات فارسی۔	۳۲۳-۳۲۵	شیخ علی حزیں اور مرزا کی نثر کا مقابلہ	۴۱۴-۴۱۵
مرزا کے ترکیب بند کا نظیری کے ترکیب بند سے مقابلہ	۳۲۷-۳۳۶	مرزا اور ابوالفضل کی نثر کا مقابلہ	۴۱۶-۴۱۹
مرزا کی فارسی مثنوی کا نمونہ۔	۳۳۷-۳۴۷	خاتمہ۔	۴۲۰-۴۲۸
نثر فارسی پر ریمارک۔	۳۴۷-۳۴۹		

مضمون	صفحہ
سخن فہموں کی قدر۔	۹۰ لغایت ۹۱
اپنے عجز کا اقرار۔	۹۱ - ۹۳
ہجو نہ لکھنا۔	۹۳ - ۹۶
خانگی تعلقات۔	۹۶ - ۹۸
موت کی آرزو۔	۹۸ - ۹۹
اخیر عمر کی حالت۔	۹۹
مرض الموت کی حالت۔	۹۹ - ۱۰۰
تاریخ وفات۔	۱۰۰
جنازے کی نماز۔	"
شاگردوں کی کثرت۔	۱۰۰ - ۱۰۱
سید غلام علیخان وحشت۔	۱۰۱ - ۱۰۲
نواب ضیاء الدین احمد خاں۔	۱۰۲ - ۱۰۴
نواب محمد مصطفٰے خاں۔	۱۰۴ - ۱۰۵
دوسرا حصہ مرزا کے کلام پر ریویو اور اسکا انتخاب	
تمہید۔	۱۰۶
مرزا کا سابقہ استعداد۔	۱۰۷ لغایت ۱۰۸
مرزا کے دیوان ریختہ اور انکی اردو شاعری پر ریویو	۱۰۸ - ۱۳۹
دیوان ریختہ کا انتخاب	
غزلیات۔	۱۳۹ - ۱۶۷
قطعات۔	۱۶۶ - ۱۷۱
رباعیات۔	۱۷۱ - ۱۷۴
نثر اردو پر ریویو اور اسکا انتخاب	۱۷۴ - ۱۹۵
نظم و نثر فارسی پر ریمارک۔	۱۹۶ - ۲۰۳
غزل فارسی پر ریمارک۔	۲۰۳ - ۲۰۵
غزلیات فارسی کا انتخاب۔	۲۰۵ - ۲۷۰
مرزا کی غزل کا نظیری کی غزل سے مقابلہ	۲۷۱ - ۲۷۹
مرزا کی غزل کا ظہوری کی غزل سے مقابلہ	۲۷۹ - ۲۸۶

مضمون	صفحہ
عروض۔	۵۸
نجوم۔	۵۹
تصوّف۔	”
تاریخ وسیاق ومساحت سے اجنبیت	”
خوشخطی۔	”
اندازِ شعر خوانی۔	۵۹ لغایت ۶۰
اخلاق وعادات وخیالات سیرت و اخلاق	۶۱ - ۶۲
مروّت۔	۶۲
فراخ حوصلگی۔	۶۲ - ۶۴
حافظہ۔	۶۴
شعر فہمی۔	۶۵
سخن سنجی	۶۵ - ۶۶
کتاب فہمی	۶۶
حسنِ بیان اور ظرافت وشوخی۔	۶۶ - ۶۸

مضمون	صفحہ
خودداری۔	۶۸ لغایت ۶۹
خوراک۔	۶۹
آموں کی رغبت۔	۶۹ - ۷۱
ناؤ نوش کی عادت۔	۷۱ - ۷۴
مذہب۔	۷۴ - ۷۸
سلامتی طبع۔	۷۸ - ۷۹
مسئلہ امتناع نظیرِ خاتم النبیّین۔	۷۹ - ۸۲
دادِ سخن۔	۸۲ - ۸۳
انصاف۔	۸۳
تقریظ لکھنے کا ڈھنگ۔	۸۳ - ۸۴
تقریظِ دیوانِ تفتہ۔	۸۴
تقریظِ تصحیحِ آئینِ اکبری۔	۸۴ - ۸۶
محققانہ نظر۔	۸۶ - ۸۷
حق پسندی۔	۸۷ - ۸۸
راست گفتاری۔	۸۸ - ۹۰
نا قدردانی کی شکایت۔	۹۰

فہرست مضامین یادگارِ غالب

مضمون	صفحہ
دیباچہ	نهایت ۸
پہلا حصہ — مرزا کی [illegible]	
یخ ولادت۔	۹
اندان۔	۹ - ۱۳
[illegible]	[illegible]
[illegible]	۱۳
ننھیال۔	۱۶ - ۱۷
ورت شکل۔	۱۷
سکن۔	۱۸
شاعت کتب۔	〃
سفر کلکتہ۔	۱۸ - ۲۰
جادلۂ اہل کلکتہ۔	۲۱
ثنوی بادِ مخالف۔	۲۱ - ۲۶
ر لکھنؤ۔	۲۶ - ۲۸

مضمون	صفحہ
ملازمت سرکاری سے انکار۔	۲۸ نهایت ۲۹
قید ہونے کا واقعہ۔	۲۹ - ۳۳
قلعہ کا تعلق۔	۳۳ - ۳۵
خدمتِ اصلاحِ اشعارِ بادشاہ۔	۳۵
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
خدمتِ تحریرِ کتاب دستنبو۔	۳۷ - ۴۱
وظیفۂ رام پور۔	۴۱ - ۴۳
قاطعِ برہان	۴۳ - ۴۴
قاطعِ برہان کی مخالفت۔	۴۴ - ۴۵
قاطعِ برہان کی تائید۔	۴۵ - ۵۱
گمنام خطوں میں گالیاں۔	۵۲
راقم کے ساتھ مرزا کا معاملہ۔	۵۲ - ۵۸
استعدادِ عربی۔	۵۸
فارسی دانی۔	〃

یادگارِ غالب

یعنی

مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ غالب دہلوی کی زندگی کے حالات

اور

اُن کی اقسامِ نظم و نثر اردو و فارسی کا انتخاب اور ہر ایک قسم پر جداگانہ ریمارکس

مرتبہ

خاکسار الطاف حسین حالی پانی پتی

سنہ ۱۸۹۷ء

محمد رحمت اللہ رعد کے

نامی پریس کانپور میں چھپی

حسب ضابطہ رجسٹری کرالی گئی